سناٹا

احمد ندیم قاسمی

سنّاٹا

— افسانے

احمد ندیم قاسمی

اساطیر، لاہور

کرشن چندر کے نام

نام کتاب	———	سناٹا (افسانے)
اہتمام	———	منصورہ احمد (اساطیر)
کتابت	———	عبدالحق
سرورق	———	مادیو مودیگلیانی - اٹلی
تعداد	———	ایک ہزار
گیارھواں ایڈیشن	———	اکتوبر ۱۹۹۱ء
مطبع		
قیمت	———	۱۲۰/- روپے

ملنے کے پتے :

اساطیر ، ملک چیمبرز ، متصل سیشن کورٹس ، لوئر مال - لاہور

کھوج ریسرچ سنٹر ، فلیٹ نمبر ۲ فرسٹ فلور غوثیہ مارکیٹ
مین مارکیٹ ، گلبرگ - لاہور

فہرست

دیباچہ

اب سے سات آٹھ برس پہلے کی بات ہے میں نے احمد ندیم قاسمی کے سارے افسانے پڑھے، اور انھیں پڑھ کر مختلف طرح کے تاثرات قایم کیے تھے ــــ کچھ بہت اچھے، کچھ نسبتاً کم اچھے یا محض اچھے اور کچھ ایسے کہ انھیں بُرا کہنا تو یقیناً صحیح نہیں، لیکن اچھا کہنے کے بجائے گوارا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ اِن اَن گنت تاثرات میں سے کچھ تو زندگی کے دیے ہوئے نسبتاً زیادہ شدید اور زیادہ گہرے تاثرات کے نیچے دب کر رہ گئے لیکن کچھ تاثرات بے شمار تہوں کے نیچے دبے ہونے کے باوجود اب بھی اُبھر اُبھر کر دوسری چیزوں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ مثلاً یہ بات میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا کہ ندیم نے پنجاب کے دیہات کی کہانیاں لکھ کر ہمیں ان کے دلوں کا مکین اور ان کی دھڑکنوں کا ہمراز بنا دیا ہے، نہ میں یہ بات بھول سکتا ہوں کہ ان کہانیوں میں غم کی خلش اور محبت کے سرور کو برابر کی جگہ ملی ہے اور یہ کہ "لذت والم" کا یہ مصور فطرتاً افسانہ نگار بھی ہے اور شاعر بھی۔

ان بے حد خوشگوار یادوں کے ساتھ میرے ذہن پر ان افسانوں نے یہ اثر بھی چھوڑا ہے کہ افسانہ نگار کی دردمندی صرف دیہات والوں کے لیے مخصوص نہیں، وہ دیہاتوں کی کھلی ہوئی آوارہ و آزاد فضا سے باہر نکل کر شہر کے کوچہ و بازار کی گھٹن کو بھی اپنا موضوع بناتا ہے اور جہاں کہیں کوئی دکھ، کوئی زخم، کوئی ناسور دکھائی دیتا ہے اس کا مداوا، اس کا اور اس کے فن کا نصب العین بن جاتا ہے۔ لیکن جس طرح ہر دکھ کو اپنا دکھ بنا لینا انسان (یا فن کار) کی سکت سے باہر ہے اسی طرح ہر زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش بھی فن کے حق میں مضر ہے۔ موضوعات کی اسی کثرت

نے احمد ندیم قاسمی کے تقسیم سے پہلے لکھے ہوئے افسانوں میں ایک گم کردہ راہی کی سی کیفیت پیدا کردی ہے اور ان کے دردمندانہ احساس کی اثرآفرینی اور شاعرانہ اندازِ بیان کی دل نشینی کے باوجود مجموعی حیثیت سے پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ فن کار کو اپنی منزل کا پتہ نہیں اور اس لیے وہ ہر جادہ کو اپنا جادہ اور ہر منزل کو اپنی منزل سمجھتا ہے۔ ابھی وہ رہروی کے منصب کو بھی پوری طرح نہیں پہچان سکا ہے، رہبری اور رہنمائی تو اس کے بہت بعد کے مدارج ہیں۔

اب آٹھ برس کے بعد جب مجھے پچھلے دو تین برس کے لکھے ہوئے افسانوں کو ایک ساتھ پڑھنے کا موقع ملا ہے تو میں بڑی شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ ندیم کے افسانے پچھلے آٹھ برس میں کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں۔ پہلے ان میں موضوع کو اہمیت حاصل تھی۔ اب موضوع سے زیادہ ایک واضح نقطۂ نظر ہر چیز پر غالب ہے۔ فن کار نے یہ نقطۂ نظر زمانہ کے سرد و گرم کو اچھی طرح چکھ کر اور جھیل کر اختیار کیا ہے، اس لیے اس کے افسانے نہ صرف انسان کو انسانیت کی راہ دکھاتے ہیں بلکہ بڑی نرمی، خاموشی اور حلاوت کے ساتھ اس انقلاب کی راہ ہموار کرتے ہیں جس کے بغیر زندگی میں وہ استواری اور ہمواری پیدا ہونا ناممکن ہے جو انسان کی فلاح و بہبود اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے استحکام اور بقا کے لیے اشد ضروری ہے۔

ان افسانوں کو پڑھ کر فن کا ایک اور اہم پہلو سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ جوں جوں افسانہ نگار کا ربط ضبط زندگی کے ساتھ زیادہ ہوا ہے، جوں جوں اس کی شخصیت میں رچاؤ اور پختگی کے خصائص پیدا ہوئے ہیں اس کا فن بھی نکھرتا گیا ہے۔ احساس کی جو شدت اور جذبات کا جو خلوص اس میں ہمیشہ سے تھا اس میں نظر کی وسعت اور خیال کی بلندی سے ایک سکون اور ٹھہراؤ پیدا ہوا ہے اور یہ سکون اور ٹھہراؤ فن کار کے فن کو متوازن بناتا اور فن کے مختلف عناصر پر اس کی گرفت مضبوط کرتا ہے۔

سیاست، معیشت اور رومان —— زندگی کے ان تینوں پہلوؤں پر ندیم کی نظر

ہمیشہ رہی ہے، سو اب بھی ہے۔ لیکن ان کی شخصیت نے ان چیزوں کو پہلے اپنے رنگ میں نہیں رنگا تھا ——— (یا اگر یہ سمجھا جائے کہ خارجی ماحول اور شخصیت کا یہ رچاؤ اپنے اختیار کی چیز نہیں تو یوں کہہ لیجیے کہ جب تک شخصیت کے اجزا میں انتشار تھا اور پوری ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی تھی) ان تینوں پہلوؤں کے ذکر میں خارجی عناصر کا غلبہ تھا اور افسانہ نگار برابر مشاہدہ کے تفصیلی بیان کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔ اب وہ خارجی زندگی سے زیادہ ان داخلی کیفیتوں کی مصوری کی طرف مائل ہے جو ایک طرف تو اسی خارجی زندگی کی پیدا کی ہوئی ہیں اور دوسری طرف خارجی زندگی پر بہت گہرا اثر بھی ڈالتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے نئے دور کے افسانوں میں (میں نے ندیم کے ان چند افسانوں کو ایک خاص دور کے افسانے اس لیے کہا ہے کہ ان میں افسانہ نگار کا فن بہت سے مدارج و منازل طے کر کے ایک ایسے مقام تک پہنچا ہے جو بہت سے نئے لکھنے والوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے) کرداروں کے خدوخال واقعات کے نقوش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تیکھے، واضح اور نتیجہ خیز ہیں۔ ان کرداروں کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کے پیچھے گزری ہوئی صدیوں کی روایت کا پس منظر بھی ہے اور حال کی زندگی کے پیدا کیے ہوئے تاثرات کا ردِ عمل بھی۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت کی تشکیل ایسے گوناگوں عناصر سے ہوئی ہے جنھوں نے افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کے منصب کو بوجہ احسن پورا کرنے میں قدم قدم پر نمایاں حصہ لیا ہے۔ قاسمی افسانہ نگار ہونے کے علاوہ فطری طور پر شاعر، مفکر اور اصلاح پسند بھی ہیں اور دردمند انسان اور نڈر نقاد کی جملہ صفات کے حامل بھی۔ ان کی شخصیت کی یہ گوناگونی، ہمہ گیری اور وسیع دامنی ان کے سارے افسانوں پر چھائی ہوئی ہے اور افسانے پڑھنے والا ہر آن یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کے افسانے انسان کے جسم کو سیاست کی تعزیروں اور سماج کی زنجیروں سے رہائی دلانے کے بلند مقصد کی پیروی کرتے ہیں اور دل کی دنیا کی طرف سے بھی غافل نہیں ہیں بلکہ

یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہے کہ مادہ کی دنیا میں رہ کر بھی برابر دل کی دنیا سے زیادہ قریب رہنا ان کا مزاج ہے۔ پھر ان دونوں کی حدیں روح اور اخلاق کی دنیا سے ملا کر نظامِ حیات کو انسان اور انسانیت کے معیارات قریب لانا بھی ان افسانوں کا بدیہی مقصد و منصب ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت اور اس لیے ان کے فن (یعنی افسانہ) کی انفرادیت اس بات کی ہے کہ اس میں مادی اور روحانی زندگی کی بہترین قدروں کو یکجا کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو ان افسانوں پر شروع سے آخر تک مارکسی نظریوں کا گہرا اثر ہے اور دوسری طرف مذہبی اور اخلاقی رجحانات کا ہمدردانہ بلکہ بعض اوقات جذباتی عکس۔ یہی رجحان ہے جس نے قاسمی کے افسانوں کو کبھی اخلاق کی ایک خاص سطح سے نیچے نہیں اُترنے دیا۔ جنس کو انسانی زندگی کا ایک اہم تقاضا سمجھنے کے باوجود وہ اس رجحان کو ہمیشہ حسنِ اخلاق کے معیار کا پابند رکھتے ہیں اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ان کی شخصیت میں احساس اور فکر دونوں دست بدست اور دوش بدوش ہو کر چلے ہیں اور مادی رجحانات کی تیزی اور تندی نے برابر روحانی اور اخلاقی میلانات کی ہم نشینی میں اعتدال اور توازن کی شکل اختیار کی ہے یہاں تک کہ ایک ایسی منزل آ گئی ہے جہاں مصلح اور نقاد، شاعر اور فن کار میں جذب ہو کر رہ گیا ہے۔

اس تعریف و توصیف کے بعد (جو حقیقت میں تجزیہ اور تنقید کی غیر جانبدارانہ سعی ہے) شاید یہ سوال اور یہ مطالبہ غلط نہ ہو کہ یہ ساری باتیں اس مجموعہ کے آخر کن کن افسانوں میں ہیں۔ اس کا ایک بہت آسان سا جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہر افسانہ میں۔ اس لیے کہ ہر افسانہ، افسانہ نگار کے شخصی تاثرات کا سچا عکس اور آئینہ ہے لیکن یہ جواب یقیناً ہر افسانہ پر پوری طرح صادق نہیں آتا۔ اس لیے کہ ہر افسانہ رئیس خانہ، گنڈاسا، کنجری الحمد للہ اور آتشِ گل جیسا افسانہ نہیں۔ ایک خصوصیت پڑھنے والوں کو ان پانچ افسانوں میں سے ہر ایک میں نظر آئے گی اور وہ یہ کہ ان سب میں ابتدا سے انتہا تک ہر حرف اور

ہر خط افسانہ نگار کی پوری فنی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اپنی فنی تخلیق کو ہر پہلو سے حسن کا مرقع اور تاثیر کا مجسمہ بنانے کے لیے وہ ایک ایک پہلو کو سڈول اور ہموار بنانے میں خونِ جگر صرف کرتا ہے۔ ان مختلف حصوں میں علیحدہ علیحدہ حسنِ ترتیب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ان مختلف حصوں میں باہمی توازن و تناسب قائم ہو۔ یہ توازن اور تناسب افسانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور قائم ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ مختلف منزلیں طے کرتا ہوا وہ خاتمہ تک پہنچتا اور مجموعی طور پر وہی گہرا تاثر پیدا کرتا ہے جو فن کار کا مقصود و مطلوب ہے۔

مجموعہ کے جن پانچ افسانوں کی طرف میں نے اشارہ کیا وہ فن کی پختہ کاری اور فن کار کی جگر کاوی کے بہترین مظہر ہونے کے علاوہ زندگی کے ایسے نقوش ہیں جنھیں سینکڑوں برس کے ماضی کی تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی روایت، حال کی سیاست اور معیشت اور اخلاق کے پیچیدہ مسائل اور ان مسائل میں اُلجھنے اور ان کا صیدِ زبوں ہونے والے انسان نے اسی طرح مل جل کر بنایا ہے کہ زندگی اپنی ساری تلخی اور ناخوش گواری کے باوجود دل کش اور دل فریب معلوم ہوتی ہے اور یہ بات صرف اس طرح پیدا ہوئی ہے کہ افسانہ نگار نے زندگی کو اس کے نہاں خانوں میں گھس کر بے نقاب دیکھا اور اس کے حُسن و عیب کو اپنی نظر کا چراغ بنایا ہے۔ زندگی پر اس کی نظر تیز بھی ہے اور گہری بھی۔ اس کے دل نے اس سے محبت بھی کی ہے اور نفرت بھی اور اسے دونوں رنگوں میں بہت قریب سے دیکھا اور برتا ہے اس لیے اس نے اس کے اچھے اور بُرے کرداروں کے متعلق اور ان کرداروں کے احساسات تخیلات، جذبات اور افکار کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں مشاہدہ کی مہارت کے علاوہ فن کارانہ حسنِ انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ سب کچھ دیکھ کر بھی سب کچھ کہہ دینے کی ہوس رکھنے کے بجائے نفسیاتی اجمال اور شاعرانہ ایجاز کو اظہار کا وسیلہ بنانا فن کی عظمت کی دلیل ہے اور اس عظمت کا اظہار پورے افسانوں کے مطالعہ کے علاوہ ان بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بھی ہو سکتا ہے جو ان

میں سے ہر افسانہ میں پڑھنے والے کو قدم قدم پر ملتے ہیں۔

"ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا جائے تو تتلیوں کے پروں کی طرح سونے کے ذرے چھٹ کر انگلیوں میں چلے آئیں گے۔"

یہ گال "آتش گل" والی گلابو کے گال ہیں جن پر حالات کی ستم ظریفی نے غازہ کی سرخی چڑھادی تو

"اس کے چہرے کی سرسوں کو جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی نے چمکا دیا تھا۔"

یہ گلابو "آتش گل" کے ہیرو کو ایک ایسے زمانے میں ملتی ہے جب وہ شدید اعصابی بیماری میں مبتلا ہو کر ڈاکٹر کے مشورے سے بے عملی کی خاموش زندگی بسر کر رہا ہے۔ ماحول کے فرق نے اس کے اعصاب پر اچھا اثر ڈالا ہے، ایکا ایکی کوئی ایسی بات ہوتی ہے کہ بیماری جیسے پھر لوٹ کر آجاتی ہے اور افسانہ نگار اس کا حال یوں بیان کرتا ہے:

اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری شدید اعصابی بیماری پھر سے عود کر آئی ہے اور ڈاکٹر کہتا تھا کہ یہ بیماری ذہنی ہوتی ہے۔ آج وہ ڈاکٹر میرے سامنے ہوتا تو میں اس سے کہتا: لاؤ میری دونوں جیبیں روپوں سے ٹھونس دو، پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ یہ بیماری ذہنی ہے یا اقتصادی؟"

کتنی تلخی ہے اس سوال میں، لیکن کتنا سچا بھی ہے یہ سوال! افسانہ نگار یہ سوال کر کے ایک چابک دست فن کار کی طرح ہماری زندگی کے اس سارے نظام کی ابتری کو بے نقاب کر رہا ہے جس میں پیسا سب کچھ ہے لیکن وہ ملتا کسی کو نہیں — یا کم از کم جس کا حق ہے اسے نہیں ملتا اور حقدار کو اس کا حق نہ ملے تو زندگی کا اعصابی امراض میں مبتلا ہو جانا کوئی عجیب بات نہیں بلکہ تقاضائے فطرت ہے۔

"رئیس خانہ" میں بہت سے کردار ہیں۔ ان میں سے ایک وہ "صاحب" ہے جو سکیسر پہ ساون گزارنے آیا ہے اور جس کے "ماتھے کے ابھار کے نیچے چراغ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا ہے" اور دوسری مریاں ہے جس کی "بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹوں پر کاجل کی دھندلی سی لکیر آج پانچ چھ سال

سے بار بار دھوئے جانے کے باوجود نہیں دُھلی تھی" اور پھر اس کا شوہر فضلو ہے جو اپنے ایک بہت بڑے گناہ کا کفارہ صرف یہ کہہ کر ادا کرنا چاہتا ہے کہ "مجھے میری غریبی دھوکا دے گئی مریاں"۔

"گنڈاسا" پنجاب کی دیہاتی زندگی کی کہانی ہے جس کے شروع ہوتے ہی پڑھنے والا اس کی خالص مقامی فضا میں گم ہو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے:

"اکھاڑہ جم چکا تھا۔ طرفین نے اپنی اپنی چوکیاں چن لی تھیں۔ پڑکوڈی کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے۔ اُنھوں نے رنگین لنگوٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ ذرا ذرا سے سفید پھینٹے ان کے چپڑے ہوئے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرے بنا رہے تھے۔ وسیع میدان کے چاروں طرف گبھوں اور حقوں کے دور چل رہے تھے، اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا اور پرکھا جا رہا تھا......"

یہ تصویر کسی ایک موقع کی نہیں بلکہ صدیوں کی معاشرت اور روایت کا عکس ہے جس میں مولا بھی پروان چڑھا ہے اور راجو بھی — وہی مولا جس نے ڈھول کو پوروں سے چھو کر "یا علی" کا نعرہ لگانے کے لیے ہوا میں ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ کسی نے یہ اطلاع دی "مولے! اے مولے بیٹے تیرا باپ قتل ہو گیا"۔ اس خبر سے پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے۔ ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی اور پھر:

"مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا"۔ یہی مولا تھا جس نے اپنے باپ کا انتقام لے کر بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک اپنے باپ کے قاتل کی نسل کو ختم نہ کرے گا انتقام پورا نہیں ہوگا۔ اور اس لیے اپنے صبح و شام اس انتظار میں کاٹ رہا تھا کہ رنگے کا چھوٹا بیٹا گاما آئے تو انتقام کی آگ سرد ہو لیکن ایک دن رنگے کی منگیتر راجو اس کے آدرش کے راستے میں حائل ہو گئی اور اس طرح کہ جب وہ ایک دن اس کے گھر گھی بیچنے آئی اور مولا کی ماں ترازو لینے اندر چلی گئی تو مولا نے دیکھا کہ:

"راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو بھوؤں کو مس کریں گی اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں، ورنتھوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے جو کچھ یوں اُچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اُڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بُندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں اور ان بُندوں میں اُس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔ موے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یوں ہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے ــــــ"

اور پھر جب اچانک ایک دن گلا گاؤں میں آگیا اور تڑاخ سے مولا کے منہ پر ایک چانٹا مارا تو اس نے اپنا وہ گنڈاسا نہیں اٹھایا جو مدتوں سے گلے کے خون سے پیاس بجھانے کے لیے بیتاب تھا ــــــ اور جب اس کی ماں نے یہ خبر سن کر اپنا سر پیٹ لیا تو وہ رونے لگا اور ماں کے یہ کہنے پر کہ "تُو تو رو رہا ہے موے!" لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بولا: "تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟"

"الحمد للہ" کے ہیرو مولوی ابل کے شادی سے پہلے بڑے ٹھاٹ تھے:

"کھدر یا لٹھے کی تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریوں والی ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص، جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا۔ سر پر بادامی رنگ کی سنہری لنگی جس میں سے کلاہ کی مُطلا چوٹی جھلکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس میں جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے ہوتے۔ بالوں میں کوئی بڑا کافر تیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔ قدرے اوپر اُٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سُرما تو جیسے

رنج کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی انگشتریاں جو وضو سے پہلے دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں......"

لیکن جب مسجد میں نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی جگہ گھٹنے لگی اور ضروریاتِ زندگی گھٹنے کی بجائے بڑھتی رہیں تو اُن کی بیوی زیب النسا کے کنگن جو کبھی اس کی کلائیوں میں گڑے رہتے تھے ذرا سے جھٹکے میں نیچے گرنے لگے اور:

"اس کی لانبی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا بھوبھل سرد راکھ بن گیا تھا اور جب وہ پلکیں جھپکتی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اُڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی"

اور جب یہ حالت معمول بن گئی اور ایک دن بیوی نے کہیں سے دس روپے قرض لانے کا مشورہ دیا تو مولوی ابل بولے کہ بھلا کون آنکھ کا اندھا مجھے قرض دے گا میری حالت سب جانتے ہیں اس لیے کہ:

"سوکھے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں"

یہی مولوی ابل اپنے بہت بڑے محسن چودھری فتح داد کے مرنے پر اس لیے بیوی کو مبارکباد دینے آئے ہیں کہ دس کی جگہ بیس کا انتظام ہو گیا— "بیوی نے یہ خبر سُنی تو اس نے زور سے اپنی چھاتی پر دوہتڑ مارا کہ بچے تک بلک کر رو دیے"

"اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا ہے .....مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شرع قرار دیتا تھا چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر گلی میں بھاگ گیا"

یہ چند مثالیں ہیں جن میں افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے فن کی ہلکی ہلکی سی جھلکیاں ہیں۔ اس کا دور بین مشاہدہ جو حال کی زندگی کے معمولی سے معمولی واقعہ میں اور کرداروں کے چشم و لب کی ہلکی سے ہلکی جنبش میں بھی صدیوں کی روایات کے آثار دیکھ لینے پر قادر ہے۔ اس کا دردمند دل جو ہر روتی ہوئی آنکھ کے آنسوؤں اور کراہتے ہوئے لب کی آہوں کو اپنا سرمایا جانتا ہے۔ اس کی انسان دوستی

اس کی اصلاح پسندی، اس کی تلخ اور بیباک نکتہ چینی اور اس کے ساتھ اس کی شیریں نوائی، اظہار بیان میں شعریت، اور اپنی فنی تخلیق کے مختلف اجزا میں آہنگ، توازن اور حسنِ ترتیب۔ تمہید کی کشش اور خاتمہ کا تاثر، یہ سب چیزیں ان مثالوں میں کم کم اور مکمل افسانوں میں اس سے بہت زیادہ ہر پڑھنے والے کے سامنے آئیں گی، اس لیے کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانے جسم یا مادہ کی دنیا اور اخلاق اور روح کی دنیا کی بہترین قدروں کے حامل ہونے کے باوجود صرف ایک محدود طبقہ کے لیے دلچسپی اور تاثیر کا سرمایا فراہم نہیں کرتے۔ ان میں خواص اور عوام دونوں کے لیے یکساں دلچسپی بھی ہے اور تاثیر بھی۔ اس لیے کہ دونوں اپنے مزاج اور مذاق کے اختلاف کے باوجود انسان ہیں، دل سے نکالی ہوئی ہر بات دونوں کے دل میں گھر کرتی ہے۔

پھر اور بہت سی باتوں کے علاوہ یہ بات بھی بڑی صاف اور صریح ہے کہ یہ افسانے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اس قبائے گل پر مزید گل کاری کی کوشش تکلفِ محض ہے۔

وقار عظیم
۱۶ر نومبر ۱۹۵۲ء

بڑی سرکار کے نام

نجیب اس وقت شیخ چلی کے تازہ ترین لطیفوں کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ جو دکان اس کے دشمن کے نام الاٹ ہو گئی تھی، وہی اب اس کے نام الاٹ کر دی گئی تھی۔ اس لیے صبح سے اس نے شیخ چلی کے لطیفے پڑھنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کیا تھا۔

وہ ایک لطیفہ پڑھنے کے بعد قہقہے کے لیے اپنا جبڑا کھولنے ہی والا تھا کہ وہ اندر آئی اور حسبِ معمول نہایت بے رحمی سے اپنے ننھے کی ناک پونچھتے ہوئے بولی "آج تو لکھ دو بھیا۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ جینا مشکل ہو گیا ہے۔"

آج وہ بڑے حاتمانہ موڈ میں تھا۔ اور پھر پڑوس میں رہنے والی اس مہاجر عورت نے کئی بار چکی پیسنے میں اس کی امی کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ویسے بھی گوارا یعنی اگر غریب نہ ہوتی تو خاصی ہوتی اور آج تو وہ اسے بے حد حسین لگ رہی تھی۔ دراصل آج وہ اسے میلے کپڑوں اور بکھرے اُلجھے بالوں سے الگ کر کے دیکھ رہا تھا۔ آج اس نے ہر چیز کو میل اور الجھاؤ سے الگ کر کے دیکھا تھا اور پھر یہ عورت ہفتے بھر سے اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اسے کوئی بہت ضروری خط لکھوانا تھا۔ ایک بڑا سا کاغذ لے کر وہ بولا "بیٹھ جاؤ۔"

عورت نے سامنے کے کھٹولے پر بیٹھتے ہوئے دعاؤں کا ایک تانتا باندھ دیا۔ اور بچے کو کمر سے اتار کر یوں ایک طرف ڈال دیا جیسے اس نے اب تک چیتھڑوں کی ایک گٹھری اٹھا رکھی تھی۔ بچہ اپنے ذرا ذرا سے میلے ہاتھوں سے بان کو نوچنے لگا اور وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی، اس کے

چہرے کے خطوط تن گئے اور دائیں ہاتھ کی مٹھی بھنچ گئی۔"پاکستان کی بڑی سرکار صاحب کو لکھنا ہے۔"

نجیب نے چونک کر عورت کی طرف دیکھا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ شیخ چلی کے لطیفے چھوڑ کر اس نے خواہ مخواہ ایک بیکار کام اپنے ذمے لے لیا ہے مگر عورت کی مٹھی اسی طرح بھنچی ہوئی تھی اور آنکھوں سے جیسے پتلیاں غائب ہو گئی تھیں۔

کھلے کھلے بال میں ٹانگیں پھنسا کر بچہ رونے لگا۔ عورت نے پہلے تو بچے کی پیٹھ پر ایک دھوکا جڑا اور پھر اسے بڑی بے رحمی سے اوپر کھینچ کر وہیں پٹخ دیا۔ بچے کی سانولی پنڈلیوں پر لالی کھنڈ گئی کئی جگہ سے خون پھوٹ نکلا۔"کتے کا پلا!" وہ گرجی،"مر نہ گیا وہاں دلی میں۔ میرے پھوٹے بھاگوں کی طرح موا میرے ساتھ چمٹا چلا آیا۔"

بچہ نچلے ہونٹ کو لٹکا کر ماں کی پشیمانی کا انتظار کرنے لگا کہ وہ چوم لے تو یہ رو دے، مگر وہ نجیب کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ بچے نے مایوس ہو کر لٹکا ہوا ہونٹ اوپر اٹھا لیا اور بال کو نوچنے لگا۔

وہ بولی: "تو بھی ذرا صاف صاف لکھنا کہ صاحب جی پڑھ لیں۔ لکھو کہ جب حضور کا پاکستان بنا ہے تو میں دلی میں تھی۔ میاں کسی صاحب کا بیرا تھا۔ میں ایک بڑے گھر میں برتن صاف کرتی تھی اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ تین لڑکے تھے، بڑے پیارے سے، گورے گورے سے، ایک بار تو ایک نئی نئی پڑوسن نے میرے آنگن میں جھانک کر کہہ دیا تھا کہ: "یہ صاحب کے بچے ہیں بہن!" وہ رک گئی اور ننھے کو اٹھا کر گود میں بٹھا لیا، اسے چوما، اس کی پنڈلیوں کو سہلایا اور پھر نہایت بے رحمی سے اس کی ناک پونچھتے ہوئے بولی: "یہ بھی کبھی گورا ننھا بھیا۔ رفیوجی کیمپ میں کالکھ پھر گئی۔"

دکان کی نئی نئی الاٹمنٹ نے اسے بہت عدیم الفرصت بنا دیا تھا اور پھر ابھی شیخ چلی کے لطیفوں کی آدھی کتاب باقی تھی۔ اس نے ناگواری سے کہا: "اچھا تو تمہارے تین بچے تھے۔"

اس نے پھر سے بچے کو پرے پٹخ دیا۔ اب کے وہ ادوائن میں آدھا لٹک کر رونے لگا پھر کر اس نے بچے کو زور سے اوپر کھینچا اور نیچے فرش پر جیسے پھینک دیا۔ بچے نے کچھ دیر تک

نچلا ہونٹ لٹکائے رکھا اور پھر مایوس ہو کر اوپر اٹھا لیا۔ پھر وہ دو ہاتھوں اور ایک گھٹنے کے بل گھسٹتا ہوا باہر نکل گیا۔ عورت نے بچے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ وہ انگوٹھے کے ناخن کو دانتوں سے کترتی ہوئی کچھ سوچتی رہی۔

نجیب نے لطیفوں کی کتاب کو اٹھا کر پھر اسی طرح رکھ دیا۔ ایک پاؤں کو کھینچ کر پھر سے پھیلا دیا۔ تنگ آ کر وہ بولا: "آگے کیا لکھوں؟"

عورت نے ناخن کے ٹکڑے تھوکتے کہا: "لکھو کہ اس کے بعد بڑا غضب ٹوٹا۔ ایک دن میرا میاں دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے اسے چھرے سے پھاڑ کر رکھ دیا۔ میں اس وقت ننھے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اسے سینے سے چمٹائے باہر بھاگی تو اُدھر سے اکٹھے دس بارہ آدمی مجھ پر جھپٹے اور میں دوڑی۔ میں اپنے میاں کی لاش پر سے پھاند گئی، اور اس کے ایک ہندو دوست کے گھر میں گھس گئی۔ اس نے مجھے رسوئی میں چھپا دیا۔ باہر بڑا شور ہوتا رہا۔ پھر جب شام ہوئی تو وہ ایک ہاتھ میں چوربتی اور دوسرے میں چھرا لیے مجھے باہر لے آیا، اور بتایا کہ شہر بھر میں مسلمانوں کو چن چن کر مارا جا رہا ہے اور فوج اکا دکا بچے کھچے مسلمانوں کو پرانے قلعے میں جمع کر رہی ہے۔ اس نے مجھے صلاح دی کہ گھر سے ضروری سامان لے کر پرانے قلعے میں چلی جاؤں اور پھر وہاں سے پاکستان کی راہ لوں۔ میں اس کے ساتھ ویران گلی میں سے ہوتی ہوئی گھر کی طرف آئی تو میرے میاں کی لاش وہیں پڑی تھی۔ بس پہلے سیدھی تھی اور اب اُلٹی۔ آنگن میں آئی اور میاں کے ہندو دوست نے چوربتی جلائی تو میرے دونوں بچے آمنے سامنے انتڑیوں کے ڈھیر لگائے پڑے تھے اور گھر لُٹ چکا تھا۔"

نجیب ہنسی نہ ضبط کر سکا۔ "تم نے تو ایک لطیفہ کہہ دیا۔" اس نے قلم کو ایک طرف رکھ کر تالی بجائی۔ "بچے اپنے سامنے انتڑیوں کے ڈھیر لگائے پڑے تھے! واہ! موت کو بھی لطیفہ بنا دینا کوئی دلّی والوں سے سیکھے۔ میں نے نذر کے لطیفے بھی پڑھے ہیں، واہ وا!"

اور وہ قلم اُٹھا کر کاغذ پر جھک گیا۔

عورت کا چہرہ فق تھا۔ اس کے نیم وا ہونٹ جو الا مکھی کا دہانہ معلوم ہوتے تھے، اور اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ وہ نجیب کو اپنی ویران صحرائی آنکھوں سے گھورے جا رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو "تم یہیں کے رہنے والے ہو نا۔ اس لیے، اسی لیے تمہیں بچوں کے پھٹے ہوئے پیٹ سے اُبل کر نکلی ہوئی انتڑیاں لطیفہ لگتی ہیں اور۔"

مگر نجیب کو تو نئی دکان الاٹ ہوئی تھی اور وہ بھی دشمن سے چھن کر ـــــ وہ قلم کو انگلیوں میں دبا کر بولا: "اچھا تو گھر لُٹ چکا تھا!"

"وہ ہندو مجھے رفیوزی کیمپ میں چھوڑ آیا تھا" وہ اب ایک مشین کی طرح بول رہی تھی"۔ پھر تین مہینے کے بعد میں دوسرے لُٹے پٹوں کے ساتھ یہاں حضور کے دیس میں لائی گئی۔ والٹن اسٹیشن پر اُتری تو پہلے قبروں میں سے گزرنا پڑا، یہ کچھ عجیب سا شگون تھا کہ جہاں ہم جینے آئے ہیں وہاں بسم اللہ قبروں سے ہو رہی ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا پر مجھے تو اپنے ننھے کے لیے جینا تھا۔" وہ اچانک رُک گئی اور اِدھر اُدھر دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی: "ننھا کہاں گیا!" اس نے نجیب سے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گئی۔

نجیب نے شیخ چلی کے لطیفوں کی کتاب اٹھا لی۔ باہر سے چند زبردست دھماکوں کی آواز آئی۔ عورت نے اندر آ کر بچے کو فرش پر چیتھڑوں کی گٹھری کی طرح پٹخ دیا اور بولی: "کیچڑ کھا رہا تھا موا کُتے کا پلا۔" جھک کر اس نے بچے کے گال پر ایک زور کا طمانچہ مارا، اور بچہ اپنے کیچڑ بھرے ہاتھ سے گال کو ڈھانپ کر ماں کو کچھ اس طرح دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہے: "تو کیا اب کیچڑ بھی نہ کھاؤں؟" ـــــ اب کے اس نے ہونٹ بھی نہ لٹکایا۔ بس ایک ناقابل فہم حیرانی سے ماں کو گھورتا رہا۔ اس کی ویران صحرائی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے ایک ننھا سا سوال تھا: "تو کیا اب کیچڑ بھی ـــــ"

عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے بچے کو اُٹھا کر اپنے سینے سے بھینچ لیا اور

چیخنے لگی: "لکھو کہ بڑے سرکار جی صاحب مجھ نگوڑ ماری کو تو یہاں اتنی سی پناہ بھی نہ ملی جتنی اس ہندو کی رسوئی نے دی تھی۔ مجھ جنم جنم کی بدنصیب کو یہاں چند دور کے رشتہ داروں کے ساتھ بھیج دیا گیا اور رشتہ دار مجھے یہاں چھوڑ کر کسی اور ضلع میں چلے گئے۔ میں نے یہاں چکی پیسی پر بڑے میں جو چٹکی بھر آٹا پایا اس سے دو جانوں کے دوزخ کیسے بھرتے۔ پھر میں نے ایک فقیر کی قبر ڈھونڈی اور وہاں جھاڑو دینے لگی۔ پر دو دن کے بعد اصلی مجاور آ گیا اور اس نے ــــ اس کم بخت نے مجھے دھکا دے دیا اور میرے بچے کو جیوں گیند کی طرح اچھالا تو وہ ایک دھنسی ہوئی قبر میں جا گرا ــــ موئے کے پیارے مریں، جہنم میں جلے اللہ کرے۔"

"بکو مت" نجیب نے نہایت غصے سے چلاتی ہوئی عورت کی طرف دیکھا جس کی ایک مٹھی سختی سے بھنچی ہوئی تھی اور آنکھوں سے پتلیاں جیسے غائب ہو گئی تھیں اور سارے جسم میں رعشہ بھر گیا تھا۔ نجیب نے جل کر کہا: "آہستہ آہستہ بولو۔ کان کھائے لیتی ہے وقت الگ ضائع کیا اور دماغ الگ چاٹا۔ بتاؤ اور کیا لکھنا ہے۔"

"بس اب تھوڑا سا لکھنا ہے۔" وہ بولی "بس اب تو یہی لکھنا ہے کہ میں نے نمبردار سے فریاد کی پر وہ ہرنوں کے شکار پر جا رہے تھے، پوری بات نہ سن سکے۔ پھر میں نے بڑے افسروں کی منت کرنا چاہی، پر میں تو ان کے دروازوں پر دستک بھی نہ دے سکی۔ بھیک مانگنے کا یارا نہیں۔ میری سات پشتیں اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتی رہی ہیں، اب میں جنم جلی ان کی آن کو بٹا کیوں لگاؤں۔" یہاں سے عورت کی آواز پھر سے تیز ہونے لگی۔ "اور صاحب جی اب صرف یہ کہنا ہے کہ کبھی آپ ہی ادھر اس قصبے میں آئیے تو آپ سے اور کچھ نہیں صرف یہ پوچھونگی کہ کیا آپ کے پاس میرے لیے اور اس بے زبان کے لیے ایک ہندو کی رسوئی بھی نہیں۔ جب آزادی ملی ہے تو میں نے اس پر کلیجے کے ٹکڑے چڑھائے ہیں۔ میں نے تو لیگی پڑوسنوں سے سنا تھا کہ آزادی ملے گی تو ہر آدمی دوسرے آدمی کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکے گا، پر اب تو میں جس کو مدد کے لیے کہتی ہوں یہی ٹکا سا جواب ملتا ہے "میں کیا کر سکتا ہوں" ــــ تو پھر بڑی

سرکار جی صاحب، اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف آپ ہی کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر حضور نے میرے خط کا جواب نہ دیا تو میں اس ننھے کو گھسیٹتی ہوئی پیدل کراچی پہنچوں گی اور کہیں نہ کہیں آپ کی موٹر روک کر پوچھوں گی ـــــ میں پوچھوں گی ـــــ"

"کیا پوچھو گی؟" نجیب جس کا قلم عورت کی تیزیٔ گفتار کا ساتھ نہیں دے سکا تھا کچھ ایسے غصے سے بولا جیسے پاکستان کی بڑی سرکار صاحب وہی ہے۔

عورت کی مٹھی کچھ یوں بھنچ گئی تھی جیسے انگلیاں ہتھیلی سے پار نکل جائیں گی اور اس کی گردن اور کنپٹیوں پر بہت سی رگیں ابھر آئی تھیں اور ننھا اس کا گریبان جکڑے اسے اپنی ویران صحرائی آنکھوں سے گھورے جا رہا تھا۔

"کیا پوچھو گی تم؟" نجیب نے قلم میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں پوچھوں گی،" عورت جیسے کسی خطرناک سازش کا حال بتا رہی تھی۔ "میں پوچھوں گی کہ حضور آپ کو جو آزادی ملی تھی اس میں سے میرا حصہ بھی تو لائیے۔"

"یہ میں نہیں لکھوں گا،" نجیب نے میز کو پاؤں سے پرے دھکیل دیا اور شیخ چلی کے تازہ ترین لطیفے اٹھاتے ہوئے بولا: "میں نے کونسا گناہ کیا ہے کہ تمہارے ساتھ میں بھی دھر لیا جاؤں۔ تم نے اب تک جو کچھ لکھوایا ہے یہی تمہاری عمر قید کے لیے کافی ہے!"

"ہے!" عورت کی مٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔ "تو بھیا، تم پہلے سے بتا دیتے کہ ایسی چٹھی لکھنے سے قید ہو جایا کرتے ہیں۔ مجھ نگوڑ ماری کو کیا معلوم۔"

وہ آگے بڑھی چٹھی اٹھا کر اس کے پرزے پرزے کر دیئے۔ بچے کو ایک ہاتھ سے کھینچ کر کوٹھے پر جمایا اور جاتے ہوئے بولی "میں جنم جلی تو سمجھی تھی یہاں اپنا دکھ درد کہنے کی آزادی ہے۔"

رئیس خانہ

خاکستری رنگ کے پتھروں کی اس عمارت کو بڑے لوگ مسافر خانہ اور چھوٹے لوگ رئیس خانہ کہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ بڑے لوگوں کے لیے ڈاک بنگلہ موجود تھا اور چھوٹے لوگ سرائے میں ٹھہرتے تھے جہاں صبح اور شام کو وہ بھٹیارے کے پاس تنور کے اردگرد بیٹھ کر موٹی موٹی روٹیوں پر دال کی ڈھیریاں لگا کر کھاتے، رئیس خانے کے چوکیدار کی بیوی مریاں اور ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کے حسن کا مقابلہ کرتے اور چٹخارے بھرتے۔ اور لگے ہاتھوں ایک نظر بھٹیارے کی بیوی پر بھی دوڑا لیتے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ کسی ریاست کی رانی ہے اور بھیس بدل کر بھٹیارن بنی پھرتی ہے —— اور ادھر رئیس خانے کا یہ عالم تھا کہ وہاں رئیس آتے ہی نہ تھے۔ لے دے کے کبھی کبھار شکاری نوجوانوں کی کوئی ٹولی ہرنوں کی تلاش میں یہاں آنکلتی تو رئیس خانے میں رک جاتی۔ اس روز فضلو چوکیدار بڑی امیدوں سے چھت کے جالے اتارتا۔ برآمدے کے گوشوں میں پڑی ہوئی پتا ور کو باہر پھینکتا اور اکلوتے گلدان کے بدبودار پانی اور جلے ہوئے پھولوں کو گرا کر ڈاک بنگلے کے مالی سے نئے پھول مانگ لاتا۔ اور جب شکاری رخصت ہو جاتے تو فضلو کو دوسری عمارتوں کے سب چوکیدار پرلے درجے کے جھوٹے اور مکار نظر آنے لگتے جو اُسے بڑی بڑی "بخششوں" کے قصے سناتے اور بتاتے کہ جتنے روز وہ صاحب ان کے ہاں رُکے ہیں انھوں نے پلاؤ، فیرنی اور قورمے کے سوا اور کوئی چیز چکھی ہو تو ان کی زبان پر پھوڑا نکلے۔ فضلو مریاں سے ان چوکیداروں کی

لا فوں کا ذکر کرتا تو وہ کہتی: ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ان کی بیویوں، بیٹیوں کو کبھی دیکھا ہے تم نے؟ ایسا ریشم پہنتی ہیں کہ بالکل بٹیالے کی رانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ فاطمہ چوکیدارن آج چشمے پر کپڑے دھونے آئی تھی، میں نے کہا فاطمہ، شرم نہیں آتی ننگے سر چشمے پر چلی آئیں! پہلے تو وہ زور سے ہنسی پھر مجھے پاس بلا کر بولی: "اور تمہیں شرم نہیں آتی کہ میں نے سو روپے کا دوپٹہ اوڑھ رکھا ہے اور تم مجھے ننگے سر دیکھ رہی ہو!" اور میں نے غور سے دیکھا تو فضلو اس نے ایسا مہین دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا کہ مکڑی کا جالا کیا چیز ہے۔ وہ بچھو کی سی مونچھوں والا ایک صاحب آیا تھا۔ جس کی بیوی بچوں کی جگہ کتے پالتی تھی، وہی دلوا گیا اپنی بیوی سے۔ اور یہاں ہمارے صاحب رئیس خانے کی صابن دانی ہی چرالے گئے۔ اور وہ شکاری رئیس شیرو کو ایک چونی دے گئے تھے کٹے ہوئے کنارے والی، حرامزادے!"

"سور کے بچے!" فضلو مریاں کی تائید کرتا۔

یہ رئیس خانہ کوہستانِ نمک کی سب سے اونچی چوٹی سکیسر پر تھا۔ سردیوں میں یہ پہاڑ بادلوں اور دھند میں لپٹا پڑا رہتا، دور سے یوں نظر آتا جیسے کوئی بڈھا مہینوں سے نہیں نہایا۔ یہاں کی چوٹیوں اور نشیبوں میں بکھرے ہوئے بنگلوں کی چمنیوں پر الو بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑتیں۔ بنگلوں کی پہلو کی کوٹھریوں میں چوکیدار اور ان کے بیوی بچے دوپہر تک کھاٹوں کھٹولوں پر پڑے سکڑا کرتے، اور پھر دھوپ کی ڈھنڈیا پڑی رہتی لیکن جونہی بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے سے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی، جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی، اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی۔ چوکیداروں کی بیویاں اور بچے جالے اتارتے اور شیشے دھوتے، نالی پائنچوں

ہیں سے خزاں کا ملبہ اُٹھاتے اور قسم قسم کی پنیری لگاتے۔ دکاندار میدانوں کو چھوڑ کر ٹچروں پر دکانوں کا سامان لادے اوپر آجاتے۔ شام ہوتے ہی بنگلوں کے پہلو میں دبکی ہوئی کوٹھڑیوں کی کھڑکیاں جاگ اُٹھتیں اور ہر طرف عید رات کی سی ہما ہمی طاری ہو جاتی۔

اور پھر بڑے بڑے آدمیوں کے بڑے بڑے خاندان لمبی لمبی موٹروں میں بھرے ہوئے سکیسر کی چکراتی ہوئی سڑکوں پر تیرتے ہوئے آتے۔ چوکیداروں اور مالیوں کے بچے موٹروں کے شیشوں میں سے امیر لوگوں کے گورے گورے بچوں کو دیکھتے تو اُن کے پیچھے بھاگتے اور جب موٹر کسی بنگلے میں چلی جاتی تو وہ گیٹ سے لگ کر منہ کھولے کھڑے ہو جاتے۔ اور جب امیر بچے کاروں سے اترتے اور اتفاق سے ان کی نظر گیٹ کی طرف اُٹھ جاتی تو چند جری قسم کے غریب بچے فوراً سلام کرتے، اُدھر سے سلام کا جواب مل جاتا تو وہ شرمیلے اور بزدل بچوں کی طرف فخر سے دیکھتے اور کہتے، "دیکھا، ہمیں سلام کا جواب ملا ہے۔ اب ہمیں بلّے اور گیندیں اور پرانے بوٹ ملیں گے انعام میں، اور تم بیٹھے دیکھا کرنا۔ سؤرو، بڑے آدمیوں کو جھک کر سلام کرنا چاہیے، بڑا ثواب ملتا ہے"!

افسروں کے بعد ڈاک بنگلے میں قسم قسم کے صاحب آتے۔ چند روز کے لیے رکتے اور پھر چوکیدار اور مالی میں بخشیش بانٹتے میدانوں میں اتر جاتے۔ چند لوگ عالی جناب صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کو سلام کرنے کا فخر حاصل کرنے آتے۔ چند اپنی جاگیروں کے مقدمات کے سلسلے میں، چند گھی کے کنستر، انڈوں کی ٹوکریاں اور بٹیروں کے پنجرے ڈالی کے طور پر پیش کرنے کے ضمن میں ــــ ان میں سے بہت کم تعداد ایسے صاحبوں کی ہوتی جو محض سکیسر کو دیکھنے آتے۔

کبھی کبھی جوگیوں کی ٹولیاں جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سکیسر کی گھاٹیوں میں رینگتی ہوئی اوپر آتیں تو رات سرائے میں ٹھہر کر صبح کو پہاڑ کی دوسری طرف اُتر جاتیں، یا نوجوان شکاری ہرنوں کی تلاش میں بھٹکتے ہوئے سکیسر کے قریب پہنچتے تو دور سے چمکتے ہوئے بنگلوں اور چمنیوں سے نکلتی ہوئی نیلے دھوئیں کی دھاریاں دیکھ کر اوپر آجاتے۔ یہاں وہ رات رئیس خانے میں گزارتے اور چوکیدار کی آنکھ بچا کر منہ اندھیرے ہی نیچے اتر جاتے۔

"سوٗر کے بچے"۔ فضلو ان صاحبوں کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتا۔

"حرام زادے"۔ مریاں ان کے بارے میں رائے ظاہر کرتی۔

ایسے ہی شکاریوں میں سے کسی نے چپکے سے کھسکتے وقت رئیس خانہ کی صابن دانی کو بھی اپنے تھیلے میں رکھ لینا مناسب سمجھا۔ اسی لیے فضلو بے تحاشا حقہ پیتا، مریاں اس کے پاس بیٹھی "ابابیلی" پر سوت چڑھاتی یا شیرو کے سر سے جوئیں چنتی اور ہر جوں پر اُسے "حرام زادہ" کہتی۔

سکیسر کے مشرق میں پھیلی ہوئی وادی کو "سون" کہتے ہیں۔ یہاں کے دیہات میں یہ کہاوت مشہور تھی کہ ساون ہر سال سکیسر کی چوٹی پر جنم لیتا ہے، اور پھر وہاں سے اُتر کر سون کے سبزہ زاروں پر برستا ہے۔ سون والوں کی نظریں بارش کے انتظار میں بجائے آسمان کے سکیسر کی طرف اٹھتیں۔ چھٹی پر آئے ہوئے فوجی جوان دوربینیں لگاتے، چمکتے ہوئے سفید بنگلے قریب آ جاتے۔ گھنے درختوں کے جھرمٹوں میں کبھی کبھی کوئی کار رینگتی دکھائی دے جاتی لیکن انھیں تو چوٹی کے آس پاس کہرے کی اس دھجی کی تلاش ہوتی جو عموماً رات کی رات پھیل کر بادل بن جاتی تھی اور پھر سکیسر کی بلندیوں کو دھو کر پہاڑی ڈھلانوں سے چمٹے ہوئے دیہات کا رُخ کرتی تھی۔ جو سکیسر سے کچھ یوں نظر آتے تھے جیسے ذرا سی ٹھوکر سے سارا گاؤں ڈھلان پر سے پھسلتا ہوا میدان میں آ رہے گا۔

لیکن اب کے ساون نے سکیسر کی چوٹی کے بجائے سون کے ایک گاؤں پر جنم لیا۔ سکیسر والے نیچے وادی میں اور پہاڑیوں کے اُفق تک پھیلتے ہوئے طویل سلسلوں پر پانی برستا دیکھتے رہے۔ اور سکیسر کے حصے میں صرف نم آلود ہوائیں آئیں۔ جنوب اور مغرب میں خوشاب اور میانوالی کے چٹیل میدانوں سے لُو کے طوفان اُٹھتے، ادھر شمال اور مشرق میں پکھڑ اور سون کی دھلی ہوئی گھاٹیوں میں سے خنکی لپکتی اور سکیسر کے بنگلوں کے پردوں کو ایک پُر اسرار ہوا چھیڑتی جو کبھی گرم ہوتی، کبھی ٹھنڈی اور کبھی حبس مرطوب۔ اور بڑے لوگ بلندیوں پر دوربینیں لگائے نیچے وادیوں پر بدلیوں کی دوڑیں دیکھتے۔ وادی کے حاشیے کی پہاڑیوں کا پانی چاندی کی چادریں

بن کر جھیل کی طرف بڑھتا ٹینس کے میدان میں بڑے لوگ کھیل بند کر کے سگریٹ پھونکتے اور جمائیاں لیتے اور جب وادی سے کوئی تیز جھونکا بھیگی ہوئی دھرتی کی بھینی بھینی خوشبو کو اوپر سکیسر کی طرف اچھال دیتا تو وہ انگڑائیاں لے لے کر نشیبوں کی طرف عجیب بے بسی سے دیکھتے جیسے ساون قانون کی زد میں آسکتا تو اسی وقت عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نظر آتا۔

ان دنوں سکیسر کے ڈاک بنگلے میں ایک شخص قیام پذیر تھا۔ نہ وہ کسی افسر کو ڈالی دینے آیا تھا اور نہ اُس کا کوئی مقدمہ تھا۔ وہ سکیسر پر ساون گزارنے آیا تھا اور ساون کی اس شرارت سے بہت اداس تھا کہ سون میں ندیاں بہہ رہی ہیں اور سکیسر کے چشمے تک خشک ہو چلے ہیں۔ برسوں سے ساون ہر سال سکیسر کی چوٹی پر جنم لیتا تھا۔ اس لیے وہ ساون شروع ہونے سے چند روز پہلے ڈاک بنگلے میں آ گیا۔ اور اب ساون کی ساتویں تاریخ تھی لیکن بارشیں نیچے نوشہرہ، انگہ اور اوچھالی کے دیہات میں ہو رہی تھیں اور یہاں سکیسر کے درختوں پر ہلکی ہلکی گرد جم رہی تھی، اور یہاں کے رہنے والوں کی آنکھوں میں پیاس کی ویرانی بس گئی تھی۔ وہ شخص دن بھر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا کتابیں پڑھتا اور سگریٹ پیتا اور شام کو ٹینس کے میدان کے قریب سے گزرتا ہوا کھلاڑیوں سے بالکل بے نیاز آگے بڑھ جاتا۔ رئیس خانے کے پہلو والی سڑک سے ہوتا ہوا نیچے اترتا۔ کچھ دیر کے بعد واپس آتا اور پھر ڈاک بنگلے کی ایک کھڑکی اور دو روشندان بہت رات تک چمکتے رہتے۔

فضلو کو ڈاک بنگلے کے مالی کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ صاحب پچھلے سال بھی یہاں ساون گزارنے آیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے ڈاک بنگلے کی عمارت کی بہت مذمت کی اور کہا کہ رئیس خانے کی عمارت کا جواب سارے سکیسر میں نہیں۔ ایسا دل کشا مقام تینوں ڈپٹی کمشنروں کی کوٹھیوں کو بھی میسر نہیں آیا اور مالی نے صاحب کو بڑی حیرت سے دیکھا تھا۔ کیونکہ رئیس خانے کی عمارت ڈراؤنی حد تک بے رونق تھی۔ اس کی پشت پر جو پہاڑی تھی اس نے مغرب کا سارا منظر چھپا رکھا تھا، اور اس کے مختصر سے صحن کے کنارے پر درخت اتنے گنجان تھے کہ نیچے وادی میں جھیل بھی

جھکی ہوئی شاخوں میں سے بہت سے ستارے بن کر ہی جھلک پاتی تھی۔ دو سال سے یہ بات بھی مشہور ہو چلی تھی کہ رئیس خانے میں بھوت بسنے لگے ہیں، مالی کو صاحب کی بد مذاقی پر بہت افسوس ہوا تھا۔

"پھر وہ چلا گیا" مالی نے کہا۔

"ساون گزار کر یا پہلے ہی" فضلو کو دلچسپی ہو رہی تھی، کیونکہ ایک مدت کے بعد کسی صاحب کے سلسلے میں اسے رئیس خانے کا نام سنائی دے رہا تھا۔

مالی بولا "یہ تو یاد نہیں، بس وہی دن تھے جب تم ساس کی موت پر مریاں کو ساتھ لیے نیچے وادی میں اترے تھے، ایک دن تم گئے دوسرے دن صاحب نے پوری کار کرائے پر لی اور چلا گیا، اور مجھے سو روپے بخشیش دے گیا"

"سو روپے!" فضلو کی حالت غیر ہونے لگی "پر یہ ہے کون؟"

"کوئی بھی ہو" مالی نے بے پروائی سے کہا "ہمیں اس سے کیا مطلب بخشیش سے ہے، سو وہ ملی، سوچو تو، ایک سو روپے معمولی رقم نہیں، منہ میں سماتی ہے، ہاتھ میں ایک ہی بار نہیں اٹھائی جاتی"

فضلو کی بھویں جڑ گئیں اور ماتھے پر ایک قوسی شکن ابھر آئی "ایک سو!" اس نے کہا "ہوش میں تو ہو؟"

"ارے بھئی ہاں ـــــ ہزار بار ہاں ـــــ پورے ایک سو ـــــ پانچ بیسیاں ـــــ چار پچیسیاں ـــــ اور پھر اتنا گرم اور نرم کمبل کہ ہاتھ لگاؤ تو جانو تازہ حلوہ چھو رہے ہو ـــــ یہ کمبل اس نے بہشتو کو دیا، اور بہشتو کا کام یہ تھا کہ دو تین دن اس کے کمرے کے گلدان سجائے اور ایک بار تولیہ دھو دیا ـــــ بس ـــــ کوئی اللہ والا ہے"

فضلو بخشیشوں کا ذکر سن کر چڑ جانے کا عادی ہو چکا تھا، مگر جب مالی نے پہلے قرآن مجید کی اور پھر اپنی بیوہ بہن بہشتو کی قسم کھائی تو وہ کوئی غیر مرئی سا گولا نگل کر واپس اپنی کوٹھری

میں آ گیا اور مریاں کو اس واقعے کا ذکر یوں سنایا جیسے مالی نے اس کے ہاتھ مریاں ہی کے لیے ساری تفصیل بھجوائی ہے۔ مریاں نے لسّی کے پیالے میں نمک کی چٹکی گھولتے ہوئے کہا "میں تم سے پوچھتی ہوں فضلو کہ جب رئیس خانے کی چوکیداری میں ہمیں اڑتی دھول بھی نہیں ملتی تو یہاں سکیسر پر کیوں ٹنگے پڑے رہیں، کیوں نہ نیچے سون میں جا کر پرانے بھاڑ جھونکیں۔ اتنے زمیندار پڑے ہیں کسی کی ڈیوڑھی تو مل ہی جائے گی۔ مہینے کے بیس چھانکوں میں سے ایک دو بھی بچ رہتے تو دوا دارو کے لیے اٹھا رکھتی۔ پر یہاں تو شیرو کی ایڑی میں کنکر اتر جائے تو ہسپتال کے سامنے گھنٹوں ٹنچر کے لیے بیٹھنا پڑتا ہے، اور جب جا کر وہ حرامزادہ کمپونڈر ذرا سی ٹنچر لاتا ہے۔ حرامزادے نے مجھے محتاج پا کر ہی تو آنکھ ماری تھی پچھلے سال۔"

فضلو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا، مریاں نے کمپونڈر کی یاد دلائی تو آپے سے باہر ہو گیا۔ لپک کر کونے میں سے کلہاڑا اٹھایا اور بولا "پچھلے سال بھی تم نے مجھے شیرے کا واسطہ دے کر روک دیا تھا، مگر آج میں نہیں مانوں گا۔ ایسے سؤر کے بچوں کو جواب نہ دیا جائے تو آج آنکھ ماری ہے کل ہاتھ ڈال دیں گے — جانے دو مجھے —"

فضلو کی گرج کے جواب میں مریاں مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے کلہاڑے والے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، اور بولی "میں بھی چپ تو نہیں رہی تھی، میں نے کہا تھا کہ بابو، ذرا اپنی ماں کو بھی آنکھ ماری ہوتی، ذرا اپنی بہن کو بھی ٹٹول لیا ہوتا۔ حرامزادے مجھے آنکھ مارتا ہے مجھے، میں تو تجھ ایسے بیسیوں کو خرید کر قیما کر ڈالوں — میں بکتی جھکتی رہی اور وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑا رہا اور کہتا رہا آہستہ بہن، ذرا آہستہ گالی دو۔ ڈاکٹر سن لے گا۔ مجھے تو ہنسی آ گئی تھی اس پر۔"

فضلو نے کلہاڑا تو چھوڑ دیا مگر کمپونڈر کو، پھر سب بنگلے کے چوکیداروں کو اور مالی اور پھر بہشتو تک کو گالیاں دیتا رہا اور جب مریاں نے بہشتو کو گالی دینے پر اعتراض کیا تو اس نے مریاں کو بھی گالی دے دی اور غصے میں بھرا ہوا باہر آ گیا — اور باہر رئیس خانے کے

صحن میں ڈاک بنگلے والا صاحب کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

"سلام" فضلو کا ہاتھ ایک دم ماتھے کی طرف اٹھ گیا، اس کے تنے ہوئے اعصاب میں اچانک سکون آ گیا اور اپنے چہرے پر برسوں کی انکساری لاتے ہوئے وہ صاحب کے پاس جا کر بولا: "کیا حکم ہے حضور؟"

صاحب کی کنپٹیوں پر دو چار بال سفید ہو چلے تھے مگر چہرے کی رنگت میں سرخی غالب تھی۔ آنکھوں میں بھیگی بھیگی چمک تھی اور ماتھے کے ابھار کے پیچھے چراغ سا جلتا ہوا محسوس ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے جوانی صاحب کے روپ میں پختہ ہو گئی ہے، پک چکی ہے اور جیسے ابھی اس کے مساموں سے خون کے ننھے ننھے قطروں کی صورت میں رسنے لگے گی۔ اس نے سگریٹ کو انگلی پر چڑھا کر فضلو کی کوٹھری کی طرف اس تیزی سے اچھالا کہ کھڑکی میں سے جھانکتی ہوئی مریاں اسے تیزی سے اپنی طرف آتا دیکھ کر ایک طرف ہٹ گئی اور صاحب نے نہایت نرمی سے پوچھا: "تمہارا ہی نام فضل دین ہے؟"

"جی" وہ صاحب کی گونجتی آواز سے متاثر اور مرعوب ہو کر بولا "مجھے ہی فضلو چوکیدار کہتے ہیں حضور"۔

"فضل دین یا فضلو چوکیدار؟" صاحب مسکرایا۔

"جی بس فضلو چوکیدار"۔ وہ عاجزی سے بولا۔

"کنوارے ہو ابھی؟" صاحب نے پوچھا۔

"کنوارا؟" فضلو بڑے ادب سے ہنسا "میں کنوارا کیسے ہو سکتا ہوں حضور، میرا تو ایک بیٹا بھی ہے چار برس کا"۔

"اور بیوی؟"

"جی ہاں بیوی بھی ہے"۔

"اور ماں باپ بہن بھائی؟"

"وہ سب لد چکے حضور۔"

"افسوس ہے۔"

فضلو نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

صاحب کچھ دیر تک رئیس خانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر پہلو میں لٹکتے ہوئے بیگ میں سے دوربین نکالی اور دور دور سون کی وادی کی طرف دیکھنے لگا۔ دوربین کے زاویے کو بدلتے ہوئے جب صحن کے حاشیے کے درختوں سے ادھر فضلو کی کوٹھری کی طرف مڑا تو اچانک تیورا سا گیا، پھر دوربین کو تھیلے میں ڈالتے ہوئے ہنس کر بولا "لاحول ولا قوۃ، ایسا لگا جیسے تمہارا کوارٹر میرے اوپر چڑھ دوڑا ہے۔"

اور کوارٹر کی کھڑکی میں مریاں اور شیرو فریم میں سجی ہوئی تصویر کی طرح کھڑے تھے، اور صاحب کے پھینکے ہوئے سگریٹ کا دھواں نیلی لہراتی دھاری بن کر ان کے چہروں پر سے گزر رہا تھا۔

"فضلو۔"

"جی۔"

"اگر ہم ڈاک بنگلے سے یہاں تمہارے رئیس خانے میں اُٹھ آئیں تو کیسا رہے؟" فضلو کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر رہ گئی۔ اسے صاحب بھی اپنے سمیت سر کے بل کھڑا نظر آیا۔ رئیس خانہ بھی پھرکی کی طرح گھوم گیا، بڑی مشکل سے اس کے حواس ٹھکانے پر آئے اور وہ بولا "میرے ایسے نصیب کہاں!"

"واہ" صاحب بولا "یہ بھی کوئی بات ہے اور مجھے تو یہ عمارت ڈاک بنگلے سے کہیں زیادہ پسند ہے، میں آج ہی یہاں اُٹھ آتا ہوں، اندر کچھ سامان ہے؟"

"جی سامان؟" وہ صابن دانی کی چوری کا راز صاحب کو بتا کر اسے رئیس خانے سے بدظن نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ہاں تو کئی پلنگ ہیں؟"

"جی ہیں، دو۔"

"اور میز؟"

"جی ہے، اور کرسیاں بھی ہیں۔ ایک گلدان بھی ہے، ایک لالٹین ہے غسل خانے کی بالٹی بھی ہے اور ———"

صاحب مسکرایا اور نیا سگریٹ جلاتے ہوئے بولا: "اچھا تو میں ابھی آیا!"

کچھ دیر تک فضلو وہیں کھڑا رہا، جیسے اس کے پاؤں زمین میں دھنس کر رہ گئے ہیں، پھر وہ دوڑ کر رئیس خانے کے برآمدے میں آگیا۔ مگر وہاں سے اُلٹے پاؤں کوٹھری کی طرف بھاگا کھڑکی میں سے آدھا لٹک گیا اور پکارا "مریاں ———"، پھر وہ کھڑکی سے ہٹ کر اندر لپکا، مریاں دروازہ روکے کھڑی تھی۔ وہ سنجیدہ تھی۔ اس کے ہونٹ سختی سے جڑے ہوئے تھے۔

"تم اندر نہیں جاسکتے۔" وہ بڑے تحکمانہ انداز میں بولی۔

"اندر نہیں جاسکتا؟" فضلو نے ہانپتے ہوئے اور حیران ہوتے ہوئے پوچھا "کیوں؟"

وہ اسی لہجے میں بولی: "پہلے میں تمہاری گالی کا جواب دوں گی۔"

"گالی کا جواب دوگی؟" فضلو صاحب کا مژدہ سنانے کے لیے اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔

"ہاں" مریاں بولی "تم نے مجھے گالی کیوں دی تھی؟"

فضلو ٹالتے ہوئے بولا: "بس دے دی کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟" مریاں نے فضلو کا ہاتھ جکڑ لیا "یعنی کچھ ہوا ہی نہیں! میں نے آج تک کسی کی گالی نہیں سہی۔ سنا؟" ——— اور وہ ایک وقفے کے بعد بولی "سنا حرامزادے؟"

فضلو دم بخود رہ گیا، اور پھر ایک دم زور زور سے ہنستا ہوا مریاں سے لپٹ گیا۔ اُسے اُٹھا کر اندر کھاٹ پر پھینک دیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا: "تو مجھے اونٹ کی بچی معلوم ہوتی ہے، ایسا بلا کا کینہ ہے تجھ میں۔"

"تو ہوگا اونٹ کا بچہ" مریاں نے جواب دیا، مگر ناگواری سے نہیں۔ اب وہ مسکرا رہی تھی، اور تہمد کے الٹے ہوئے پلّو سے اپنی پنڈلی ڈھانک رہی تھی۔ پھر وہ دونوں اور زور سے ہنسنے لگے اور ان قہقہوں کے درمیان فضلو یوں اچانک اُٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے بھڑ نے کاٹ لیا ہے "مریاں۔ سنو۔ صاحب رئیس خانے میں آرہا ہے"

مریاں کے قہقہے بھی رک گئے۔

"صاحب ہمارے ہاں آرہا ہے سنتی ہو؟"

مریاں حواس باختہ سی نظر آرہی تھی، چند لمحوں کے بعد بولی "سچ؟"

"ہاں ہاں۔ اللہ کی قسم، وہ اپنا سامان لینے گیا ہے۔"

مریاں اداس ہوگئی۔ "پر فضلو، وہ حرامزادے شکاری چھوکرے ہماری صابن دانی تک اٹھا کر لے گئے، یہاں دھرا ہی کیا ہے؟ تو بول رہے ہیں، دونوں کمروں میں، یہ صاحب رئیس خانے میں ادھر آئے گا اُدھر بھاگ نکلے گا، میں تو کہتی ہوں اب یہاں جن بھی بسنے لگے ہیں۔ اس روز رات کو غسل خانے میں بالٹی بج رہی تھی۔"

لیکن فضلو نے اس وقت مریاں کو یہ بتانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی کہ چند روز ہوئے اس نے بالٹی میں سے ایک مری ہوئی چوہیا نکال کر باہر پھینکی تھی۔ اس نے مریاں کو سمجھایا کہ صاحب کو بس ایک پلنگ چاہیے، اور بس — پھر وہ رئیس خانے کا سارا سامان ڈھو کر برآمدے میں لے گئے۔ کمرے جھاڑے، پلنگ رکھے، کپڑے ٹانگنے والی کیلوں پر سے مکڑی کے جالے اتارے اور گلدان دھویا جا چکا تو مریاں ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کے ہاں تازہ پھول مانگنے چلی راستے میں اس نے دیکھا کہ مالی اور انجنیئروں کے بنگلے کا چوکیدار سامان اٹھائے آرہے ہیں کچھ فاصلے پر صاحب بھی سگریٹ پیتا آرہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں نیچے پگڈنڈی پر گڑی تھیں اور مریاں اس کے قریب سے گزری تو جب بھی اس نے اوپر نہ دیکھا۔ پھر جب مریاں بہشتو سے پھول لے کر آئی تو وہ برآمدے میں کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور فضلو صحن میں چھڑکاؤ کر رہا

تھا۔ مریاں نے کوٹھری میں جا کر کھڑکی میں سے فضلو کو پکارا اور پھول اس کے حوالے کیے۔ فضلو نے اندر رئیس خانے میں جا کر انہیں گلدان میں سجایا، باہر آیا اور گلدان صاحب کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ صاحب چونکا۔ "کون لایا ہے یہ پھول؟"

فضلو بولا۔ "جی بیوی لائی ہے۔"

"ڈاک بنگلے کے معلوم ہوتے ہیں۔"

"جی ہیں تو ڈاک بنگلے کے، وہیں سے مانگ لائی ہے۔"

"پھر وہی منحوس ڈاک بنگلے کے پھول۔" صاحب نے کتاب کا ورق الٹتے ہوئے کہا۔ "آج تو خیر مریاں پھول لے آئی ہے، لیکن کل سے پھول نہیں پتے سجا دیا کرو۔ یہی رئیس خانے کے درختوں کے پتے۔ سمجھے؟"

فضلو حیران ہو رہا تھا کہ آخر صاحب کو اس کی بیوی کا نام کیسے معلوم ہوا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ صاحب بولا: "تمہاری بیوی کا نام مجھے مالی کی بہن نے بتایا تھا ابھی۔ مریاں ہی ہے نا؟"

"جی مریاں ہی ہے۔" فضلو نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مریم ہو گا۔ تم لوگوں نے مریاں بنا لیا۔"

"مریاں ہی تھا صاحب۔"

صاحب کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر کتاب ٹھپ سے بند کر کے بولا۔ "میری مرحومہ بیوی کا نام مریم تھا!"

فضلو کو خاموش اور متاسف پا کر بولا: "بجلی کا پنکھا بند کر رہی تھی کہ کسی تار وار کو ہاتھ چھو گیا اور وہیں ختم ہو گئی ـــــ شکر ہے یہاں سکیسر پر ابھی بجلی نہیں آئی۔"

"جی شکر ہے۔" فضلو نے کچھ سمجھے بغیر صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی، اور صاحب پھر سے کتاب کھول کر ورق اُلٹنے لگا۔

چار روز تک پلاؤ اور مرغے پکاتے پکاتے مریاں کی بُری حالت ہو گئی۔ جب دیکھو

چولہے کے سامنے بیٹھی ہے۔ چولے کی آستینیں شانوں تک چڑھا رکھی ہیں، چہرہ سرخ ہو رہا ہے، بال بکھر رہے ہیں، اور ان پر راکھ کے ذرے جم رہے ہیں، ہانپ رہے ہیں، ہانتھ سنے ہوئے ہیں، شیرا رو رہا ہے، فضلو کھا رہا ہے، لیکن جب رات کو سب کاموں سے فرصت پا کر وہ کھاٹوں پر آتے تو اُن کے پیٹ بھرے ہوتے، اور دلوں میں سکون ہوتا۔ شیرے کو دو دن بدہضمی کی شکایت رہی لیکن اب وہ مرغن غذا کا عادی ہو گیا تھا۔ صاحب نے اُسے ایک نرم اور گرم مفلر بھی دیا تھا جسے وہ رات کو بھی گلے میں لپیٹے رکھتا اور جب وہ گہری نیند سو جاتا تو فضلو دھیرے سے اس کا مفلر کھینچتے ہوئے کہتا "ہمیں بھی چھو لینے دے سؤر کے بچے"۔۔۔۔ دونوں خوب ہنستے، صاحب کی ذرا ذرا سی حرکتوں کو بڑے احترام سے یاد کرتے، مریاں بارش کی دعائیں مانگتی، کیونکہ صاحب بارش کے لیے بہت اداس تھا ہر وقت آسمان کی طرف دیکھتا، اور جب نیچے وادی میں بادل گرجتے اور نمی سے لدے ہوئے جھونکے رئیس خانے کے درختوں سے لپٹتے ہوئے آتے اور اس کی کتاب کے ورق اُلٹ دیتے، گلدان میں سجے ہوئے پتوں کو اِدھر اُدھر بکھیر دیتے اور اس کے بالوں کو ماتھے پر گرا دیتے تو وہ بڑے دکھ سے کہتا "فضلو۔۔۔ بھئی یہاں آس پاس کوئی پیر و پیر ہو تو اس سے بارش کا تعویذ لکھوا لاؤ، یہ بھی آخر کیا ساون ہوا کہ سون کی ندیوں کی گونج رات کو یہاں سنائی دے جاتی ہے اور سکیسر لٹے ہوئے رنڈوے کی طرح بے بس کھڑا ہے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ بادلوں کی ساری فوج یہیں سے گزرتی ہے۔ پچھلے سال تو پھوار کسی وقت رُکنے ہی میں نہیں آتی تھی، مگر وہ ساون بڑے بے لطف کٹا۔ ڈاک بنگلے میں مینہ کا کیا مزا! چھت پر بوندوں کے گرنے تک کی آواز نہیں، کھڑکیوں پر لحافوں جیسے پردے لٹک رہے ہیں۔ ڈاک بنگلے میں رہنا یا کسی غار میں پڑ رہنا برابر ہے۔۔۔۔ بھئی فضلو، تم تو عرصے سے یہاں ہو۔ اب کے ساون یہاں کب آئے گا؟"۔۔۔۔ اور وہ دوربین لگا کر نیچے وادی میں جھانکنے لگتا۔

وہ فضلو سے اتنا گھل مل گیا تھا کہ اسے اپنے گھر کی ساری باتیں بتا دی تھیں۔ اس کی مرحومہ بیوی کا نام مریم اور اس کا نام یوسف تھا۔ مریم مر چکی تھی۔ شادی کو ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ مریم کو بجلی کھا گئی۔ اور وہ گھبرا کر خواہ مخواہ لمبے لمبے سفر کرنے لگا۔ مریم ساون میں مری تھی۔ اس وقت اس کی کوٹھی کی چھت پر بوندیں گا رہی تھیں اور روشندانوں کے شیشوں میں سے بجلی کے فوارے اندر لپک لپک کر مریم کی نیند سے بھری آنکھوں کو چندھیا جاتے تھے۔ دیر سے بجلی کا پنکھا چل رہا تھا مگر ساون کی جھڑی نے خنکی پیدا کر دی تھی۔ اس لیے یوسف نے مریم سے پنکھا بند کرنے کو کہا اور یوں اپنی نئی نئی بستی ہوئی دنیا اجاڑ بیٹھا۔ وہ رات بھر مریم کی لاش سے چمٹا رہا اور جب دوسرے روز رشتہ دار میت کو قبرستان لے جانے لگے تو وہ نینی تال چلا گیا، وہاں سے رنگون پہنچا۔ رنگون سے مدراس اور بمبئی کا چکر لگا تا وہ کراچی اور پھر کوئٹہ آیا، اور چند روز وہاں کے جلے ہوئے پہاڑوں میں گھوم کر وہاں سے اپنے وطن ——— حسن اور محبت کی اس سرزمین پنجاب میں وارد ہوا اور مری جانے کے بجائے سکیسر آنکلا اور سکیسر کے ڈاک بنگلے کے باغیچے میں کھڑے ہو کر اس نے پہلے روز مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے دوربین لگائی تو کچھ ایسا متاثر ہوا کہ اب کے بھی یہیں آنکلا۔

"سکیسر پنجاب کا دل ہے"، یوسف نے کہا۔

فضلو نے چار دنوں میں پہلی بار یوسف سے اختلاف کیا "نہیں صاحب، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، پنجاب کا دل تو لاہور ہے، اسے پنجاب کا دل نہ کہیے۔ یہاں پتھروں اور جھاڑ جھنکاڑ کے سوا اور دھرا ہی کیا ہے، ایک وہ جھیل ہے، سو بھادوں کی دوپہروں میں ایسی گندی باس اڑاتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے دنوں کا مرا ہوا گدھا پڑا سڑ رہا ہے۔ اور پھر یہاں کے لوگ، توبہ کیجیے حضور، کسی سے ذرا سی ان بن ہوئی تو یہ نہیں کہ گھونسے طمانچے سے غصہ نکال لیا، بات بات پر برچھے پسلیوں کو کاٹتے ہوئے نکل رہے ہیں اور تبر کلہاڑیاں گردن کی نسیں کاٹتی ہوئی جا رہی ہیں، توبہ کیجیے صاحب!"

لیکن صاحب کو اصرار تھا کہ پنجاب کا کوئی اور حصہ پنجاب کا دل کہلانے کا حقدار نہیں۔ دوسرے روز یہی بحث چھیڑتے ہوئے اُس نے فضلو سے کہا: "سکیسر کی خوش گوار ہوا اور وادی کے منظر کو تو رکھ دو ایک طرف، مجھے یہ بتاؤ فضلو کہ یہاں کی عورتوں کی خوبصورتی کا پنجاب بھر میں کہیں جواب مل سکے گا تمہیں؟ گھوم آؤ پنڈی، ملتان اور میانوالی سے دلی تک، مجال ہے جو تمہیں ایسی کافر آنکھیں، ایسی گھنی اور لمبی پلکیں، ایسے قد اور ایسے جسم، ایسا رنگ اور ایسی چال مل جائے۔ میرے خیال میں یونان کے بادشاہ سکندر نے جب پنجاب پر حملہ کیا تو اس وادی میں اس کی فوج کا کوئی دستہ ہمیشہ کے لیے رُک گیا۔ ورنہ یہاں سو میں سے پچانوے چہروں کا کٹ یونانی دیوی دیوتاؤں کا سا کیوں ہے؟ میں تو جسے بھی دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے ہومر پڑھ رہا ہوں۔ عورتیں ہیں سو وینس ہیں، مرد ہیں سو اپالو ہیں۔ ایسے تیکھے نقش تو انگرڈ برگمین کو بھی نصیب نہیں ہوئے، ایسی پامال کر دینے والی خوبصورتی تو ویلنٹینوں کو بھی نہیں ملی تھی۔"

فضلو اس وقت کچھ ایسے منہ کھولے بیٹھا تھا جیسے اس کا جبڑا پیدائشی کھلا ہے اور اب تک جڑنے نہیں پایا۔ اس کی پتلیوں تک میں کوئی حرکت نہیں تھی اور وہ یوسف کے ہونٹوں پر نظریں جمائے بت بنا بیٹھا تھا۔ یوسف کے خاموش ہونے کے کافی دیر بعد تک وہ یونہی بیٹھا رہا۔ پھر جب یوسف نے اسے پکارا تو وہ جیسے نیند سے چونکا "جی" اس کے سارے جسم میں جھرجھری دوڑ گئی۔ "جی"۔ وہ بولا "جی ہاں، آپ سچ کہہ رہے ہیں، خوبصورتی تو یہاں بلا کی ہے۔ ایسی ایسی بیٹی پیدا کی ہے یہاں کی ماں نے کہ سبحان اللہ، آپ نے ٹھیک کہا، اگر آپ خوبصورتی کو لیتے ہیں تو سچ مچ یہی ہے پنجاب کا دل۔"

یوسف نے سگریٹ جلایا، بجلی اچانک نہایت زور سے چمکی اور بادل اس شدت سے کڑکا کہ پہاڑیاں دیر تک تانبے کی تھالیوں کی طرح بجتی رہیں۔ یوسف بھاگ کر باہر صحن میں آ گیا۔ پھر فوراً اندر لپکا ایک دم بادل جیسے پھٹ پڑا۔ صحن میں تھوڑی سی دھول اُڑی اور

بیٹھ گئی، پرنالوں کے دھانے سے پتّے اور تنکے بوکھلا کر باہر آ گرے اور آن کی آن میں سکیسر پر جوانی آ گئی۔ یوسف ابھی اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سمیٹنے نہیں پایا تھا کہ فضلو کی کوٹھڑی کی کھڑکی میں سے مریاں چلّائی:

"اے فضلو، اے لپک کے آ، سب کچھ بھیگ گیا چولہے کے پاس۔"

فضلو تہمد کو گھٹنوں تک اٹھا کر باہر بھاگنے کو تھا کہ یوسف نے کہا، "یہ مریاں تھی شاید؟"

"جی مریاں ہی تھی۔" اس نے جواب دیا۔

"آج پہلی بار اس کی آواز سنی ہے، شاید پردہ کرتی ہے۔" یوسف یونہی رواروی میں بولا۔

فضلو نے تہمد کو پھر گھٹنوں تک اٹھاتے ہوئے کہا: "جی پردہ تو نہیں کرتی، بس ذرا ——"

کھڑکی سے آواز آئی، "کان کتے تو نہیں لے گئے۔"

فضلو نے گھبرا کر یوسف کی طرف دیکھا۔ "گالیاں بکنے لگی سوٗر کی بچی۔"

"جاؤ جاؤ بھاگو۔" یوسف نے ہنستے ہوئے کہا، "کہیں مجھ پر بھی نہ برس پڑے۔"

اور فضلو جو صحن میں پہنچ چکا تھا —— موسلا دھار بارش سے بے پروا ہو کر رک گیا اور پلٹ کر بولا، "مجال ہے اس کی، زبان کاٹ کر انگاروں پر نہ رکھ دوں۔" اور لپک کر کوٹھڑی میں گھس گیا۔

پھر جب وہ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو صاحب کرسی پر بیٹھا ٹانگیں میز پر رکھے نیچے لٹکے ہوئے ہاتھ میں بے کار جلتا ہوا سگرٹ پکڑے گنگنا رہا تھا۔

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے

اس روز کوٹھری سے رہائش خانے تک کھانا لانے میں صاحب کی برساتی نے بڑا کام

دیا۔ فضلو اور مریاں اسے اپنے سروں پر تان لیتے اور پھر دونوں طشت تھامے ہوئے رئیس خانے میں آتے، مریاں برآمدے میں رک جاتی، فضلو طشت اندر لے جاتا، باہر آکر وہ پھر سے برساتی کو سروں پر تان کر کوٹھری سے کھانے کی دوسری قسط لینے جاتے ایک بار جب مریاں برآمدے کے ایک ستون کا سہارا لیے برساتی پر سے پانی جھٹک رہی تھی تو اندر سے آواز آئی، "باہر کون ہے؟"

"مریاں ہے صاحب،" فضلو بولا۔

"باہر کھڑی کیا کر رہی ہے؟" یوسف کی آواز آئی "ٹھنڈ ہو رہی ہے، اس سے کہو اندر آجائے یا کوٹھری میں چلی جائے۔"

"جی کوٹھری میں چلی جائے گی۔" فضلو نے کہا۔

لمحے بھر کے وقفے کے بعد یوسف بولا "بہت اچھا کھانا پکاتی ہے تمہاری بیوی۔"

فضلو نے فوراً کہا: "جی وہ کیا پکاتی ہے۔ گھی کے کھیل ہیں سارے۔"

اور مریاں باہر ہی سے بولی: "تیرے باپ کے کھیل ہیں" اس کی آواز بلند ہوگئی "ذرا کسی روز صبح سے شام تک چولہے کے پاس بیٹھو تو، نانی یاد آجائے حرامزادے کو"...... اور وہ بھنکتی ہوئی کوٹھری کی طرف چلی۔

یوسف کو اس زور کی ہنسی چھوٹی کہ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور چہرہ لال ہو گیا اس نے حواس باختہ فضلو سے قہقہوں کے درمیان پوچھا: "مزاج کیسے ہیں تمہارے؟"

فضلو دانت پیستا ہوا زیر لب بولا: "سور کی بچی!"

یوسف کو ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ کچھ دیر کے بعد فضلو کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بولا: "کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا حضور!"

"تمہارا غصہ تو ٹھنڈا ہولے" وہ بولا "کھانا تو پیٹ میں جاکر گرم ہو جائے گا۔ گھبراتے کیوں ہو فضلو، تمہیں اینٹ کا جواب اینٹ سے ہی ملا ہے پتھر سے نہیں ملا۔"

فضلو کا غصہ شاید ابھی نہیں اترا تھا۔" اس سور کی بچی سے تو یہ بھی دور نہیں حضور کہ سچ مچ پتھر اٹھا کر دے مارتی۔ گھروں میں ہر میاں بیوی کی کبھی نہ کبھی ٹھن ہی جاتی ہے پر حضور کے سامنے بک دینے کی عادت بہت بُری ہے۔"

"لیکن حضور کو تو لطف آگیا۔" یوسف نے کہا اور فضلو کی ندامت کسی حد تک دور ہو گئی۔

مینہ کچھ دیر کے لیے تھم کر پھر برسنے لگا، اور پھوار میں بدل گیا۔ یوسف نے دونوں طرف کی کھڑکیاں کھول دیں اور چھت، درخت کے پتوں اور پتھروں اور چٹانوں پر پھوار کی گنگناہٹیں سننے لگا۔ فضلو سونے سے پہلے یوسف سے حسب معمول "کوئی اور کام" پوچھنے آیا تو یوسف نے کہا: "ہاں، ایک کام ہے تو سہی۔" فضلو ہاتھ باندھے انتظار میں کھڑا رہا۔ یوسف سگریٹ جلا کر تین چار کش لگانے کے بعد بولا: "اِدھر آؤ۔"

فضلو چند قدم آگے بڑھا۔

"اور آگے آؤ، یہاں بیٹھ جاؤ پلنگ پر۔" یوسف نے بستر کے ایک حصے کو تھپک کر کہا

"پلنگ پر حضور؟" فضلو دم بخود رہ گیا۔ "پلنگ پر کیسے صاحب!"

یوسف نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور اپنے پاس بٹھا کر بولا: "ایسے۔" فضلو کچھ ایسے انداز سے بیٹھا جیسے وہ نرم نرم گدے کے بجائے تپتے توے پر بیٹھا ہے۔ "حضور!" اس نے حیرت سے کہا اور یوسف کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا

یوسف آج کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کے چہرے کا آدھا حصہ روشن تھا۔ فضلو کو گمان سا ہوا کہ اس کی آنکھ بھیگ رہی ہے اور گال پر پانی کا ایک قطرہ چمک رہا ہے۔ باہر پھوار کی مسلسل گنگناہٹ سے فضا پر اسرار ہو رہی تھی۔ پھوار نے فضا میں خنکی کے علاوہ کاجل بھی گھول دیا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے دور کسی بنگلے کے روشن دان ذرا سے روشن تھے۔ میز پر رکھے ہوئے گلدان میں درختوں کے پتے بے ترتیب ہو رہے تھے۔ لالٹین

کی زبان ہر تیز جھونکے کے ساتھ چلّو بھر دھواں اوپر اچھال دیتی تھی۔ قسم قسم کے پتنگوں کے ہجوم نے لالٹین کی شیشی پر ہلہ بول رکھا تھا۔ ان پتنگوں میں ایک بھڑ بھی تھی جس کے پروں کی بھنبھناہٹ دوسرے پتنگوں پر چھائی ہوئی تھی۔ فضلو نے ایک بار پھر یوسف کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا۔ اب گال پر چمکتا ہوا قطرہ ٹھوڑی کی طرف بہہ آیا تھا اور آنکھ کے گوشے میں ایک نیا قطرہ ڈھلک جانے کو تیار کھڑا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو فضلو؟" یوسف نے پوچھا۔

فضلو نے جھجکتے ہوئے ہاتھ اٹھایا اور انگلی سے اس کے گال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بس اتنا کہہ سکا "یہ حضور، یہ —" اور اس نے انگلی کو مٹھی میں شامل کر کے ہاتھ کھینچ لیا۔

"یہ آنسو ہیں۔" یوسف فضلو کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "آنسو بہانا میری عادت ہے۔ اسی لیے تو مجھے ساون کا انتظار تھا، مریم انہی دنوں مجھ سے چھنی تھی نا، اسی لیے ساون کی راتیں میں نے ہمیشہ روتے روتے گزاری ہیں۔ رونا بزدلی نہیں۔ ایک آنسو بہانے کے لیے اتنا بہت سا لہو جلانا پڑتا ہے اور میں رات رات بھر روتا ہوں، میں بہت دکھی ہوں فضلو، میرے پاس روپیہ ہے، جاگیریں ہیں، زمینیں ہیں، کوٹھیاں ہیں، لیکن میں کتنا غریب ہوں، مریم کے بغیر میں کتنا غریب ہوں۔" اس نے ایک طرف سے رومال اٹھا کر آنکھیں پونچھیں اور فضلو کے پاس کھسک کر بولا "میں تو ایسا لٹا ہوں فضلو کہ اب کبھی آباد نہیں ہو سکوں گا۔"

"کیوں نہیں آباد ہوں گے حضور — ضرور ہوں گے۔" فضلو نے کچھ بولنا اپنا فرض سمجھا۔

"مگر کیسے؟" یوسف نے پوچھا۔

فضلو خاموش رہا، وہ صرف تسلی دینا چاہتا تھا۔ اس کے پاس آبادی کی کوئی تجویز نہ تھی۔

ویسے فضلو ۔۔۔ ،یوسف نے بڑے راز بھرے لہجے میں کہا "اگر تم میری مدد کرو تو اس ٹھنٹھ میں کونپلیں پھوٹ سکتی ہیں۔"

"میں حضور؟" فضلو پر حیرتوں کی تہیں جم رہی تھیں۔

"ہاں تم ۔۔۔ تم اپنے آپ کو اتنا چھوٹا کیوں سمجھتے ہو، فضلو تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو۔ دنیا کا کوئی انسان معمولی نہیں اور تم چاہو تو میرے لیے سب کچھ کر سکتے ہو ۔۔۔ کرسکو گے؟"

"کروں گا حضور" اس نے کہا "کرسکا تو ضرور کروں گا، پر میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔"

"پھر وہی بات! دیکھو فضلو، بات یہ ہے کہ میں یہاں رئیس خانے میں اکیلے پڑا راتیں گزار رہا ہوں تو سچ کہتا ہوں اکیلے رہنا کوئی نعمت نہیں مجبوری ہے، اور ۔۔۔"

"تو حضور" فضلو کے ذہن ایک تجویز آئی۔ "میں سو جایا کروں آپ کے کمرے میں۔"

"نہیں بھئی" یوسف ذرا سا مسکرایا "تم مجھے آباد کرنے کے لیے اپنی مریاں کو برباد کر دوگے، ایسی بات نہیں، بس تم مجھے یہ بتاؤ کہ ۔۔۔ خیر، رہنے دو، تم بُرا مان جاؤ گے۔"

"برا کیوں ماننے لگا صاحب، آپ حکم تو دیجیے۔"

"بات یہ ہے کہ تم میری مدد کر سکتے ہو، لیکن اس کے لیے تمہیں بہت دلیر بننا پڑے گا، دیکھو، کیا اس سکیسر پر ۔۔۔ یا نیچے اس وادی میں ۔۔۔"، وہ خاموش ہو گیا، اٹھا اور ایک کھڑکی بند کر کے اور لالٹین کو ذرا سا دھیما کر کے پھر فضلو کے پاس آ بیٹھا۔ فضلو ہمہ تن گوش بنا بیٹھا تھا۔

اور پھر یوسف تیزی سے بولنے لگا۔ "دیکھو فضلو دوست کیا اس سکیسر پہاڑ پر کوئی ایک بھی عورت ایسی نہیں ہوگی جو میری راتیں آباد کر سکے، کوئی ایسی لڑکی نہیں ہوگی جو مجھ سے ایک سو روپے لے کر رات بھر میری زندگی کی جلی شاخ پر پھول بن کر مہکے اور صبح کو چلی جائے، کیا خدا کے ایک دکھی بندے کی دنیا کو چند گھڑیوں کے لیے آباد کر کے تمہارا دل خوش نہیں ہوگا؟ فضلو تم گھبرا کیوں رہے ہو؟ تم تو ہانپ اور کانپ رہے ہو، میں تمہیں ہر رات کے دس روپے دوں گا۔ میں مفت خور نہیں ہوں، مجھ پر جوانی کا بھوت سوار ہوتا تو میں لاہور واپس جا کر

ہیرا منڈی ہیں ڈیرے ڈال لیتا، لیکن مجھے کاغذی پھول نہیں چاہییں، سی لیے تو میں رنگون سے کوئٹے تک بھٹکتا پھرا۔ مجھے سچ مچ کی ایک عورت چاہیئے، سچ مچ کی ایک عورت ــــــ"

یوسف ایک لمحے کے لیے رُکا، فضلو یوں ہانپ رہا تھا جیسے کوئی بہت اونچا پہاڑ طے کر کے آ رہا ہے۔ یوسف کی خاموشی کے دوران میں اس کی سانسیں اور تیز ہو گئیں، اس کے ہونٹ اوپر اٹھ گئے، وہ ایک دم کھڑا ہو گیا اور بولا: "نہیں صاحب میں غریب ہوں، کمینہ نہیں ہوں، مجھ سے ایسا نہیں ہوگا، میں نے ایسا کام کبھی نہیں کیا۔"

"فضلو" یوسف نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اس کی آواز بچوں کی طرح بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں بہہ نکلیں "نہیں فضلو تم میرے لیے ضرور ایسا کرو گے، میرا دل اتنی مدت سے ویران پڑا ہے، تم چاہو تو اسے آباد کر سکتے ہو اور یہ بڑا نیکی کا کام ہے، ایک پیاسے کتے پر ترس کھا کر اسے پانی پلا دینے سے لوگ جنت میں جگہ پاتے ہیں تو ایک انسان کی بھوکی روح کو سیراب کرنے سے تمہیں کتنا ثواب ملے گا اس کا اندازہ ــــــ"

فضلو اپنا ہاتھ چھڑا کر پرے ہٹ گیا اور کہیں رُکے بغیر دروازے میں سے نکلتے ہوئے بولا: "نہیں صاحب، میں کسان کا بیٹا ہوں، کنجر نہیں ہوں!"

فضلو نہایت غصے میں برآمدہ اور صحن طے کر کے اپنی کوٹھری کے دروازے تک آیا تو اندر مٹی کے چراغ کی جناتی روشنی دیکھتے ہی اسے اپنی اور مریاں کی جھڑپ یاد آگئی۔ کھانا کھانے کے دوران میں بھی وہ اس سے نہیں بولی تھی۔ پھر جب وہ صاحب سے رات کے لیے رخصت ہونے جا رہا تھا تو اس نے دھم سے کھاٹ پر گر کر چادر تان لی تھی اور پھر اب تک اس نے چراغ نہیں بجھایا تھا۔ فضلو دروازے پر یوں ٹھٹک گیا جیسے صاحب نے اسے ننگا کر دیا ہے، وہ سوچ تک نہیں سکتا تھا کہ کوئی شخص

کبھی اس سے عورتوں کی دلالی کی خدمت بھی لے گا، اور خاص طور سے یہ صاحب۔

وہ اندر آ گیا۔ پگڑی اتاری اور چراغ بجھائے بغیر کھاٹ پر سیدھا لیٹ گیا، اور بجھنگ چھت میں سے کہیں دور دیکھنے لگا۔ پھوار رُک گئی تھی، ایک مینڈک کہیں قریب کے گڑھے میں ٹرّا رہا تھا، چراغ کی نوکا دھواں برمے کی طرح چھت میں سیدھا گھسا جا رہا تھا۔ شیرو نیند میں بڑبڑایا "اِتنا تھوڑا سا تو پلاؤ دیا ہے ماں —— اور کبھی دونا —— وہ سی بوٹی دے دونا ——" فضلو نے سر اٹھا کر شیرو کی طرف دیکھا۔ وہ پرانے کھیس میں کچھ ایسے سمٹا ہوا تھا جیسے اس سے زیادہ سمٹے گا تو پسلیاں توڑ بیٹھے گا۔ مریاں بھی گٹھری بنی پڑی تھی۔ خود اس کا بستر بھی یخ ہو رہا تھا اچانک اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے چادر اوڑھ لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ کہیں سے سردی کی ایک دھار اندر آ رہی تھی۔ دروازے کی جھریوں میں سردیوں ہی میں اس نے گارا تھوپ دیا تھا، تو پھر یہ سردی کھڑکی میں سے آ رہی ہوگی، وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا، اس کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا، اسے بھیڑنے لگا تو اسے رئیس خانے کی کھڑکی نظر آ گئی، پہلے تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے گہرے پیلے رنگ کی ایک چادر رئیس خانے کی دیوار میں جڑ دی گئی ہے، مگر پھر اسے چادر کے نچلے حاشیے پر کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی —— تو یہ صاحب کا سر تھا! —— تو وہ ابھی تک اسی طرح بیٹھا تھا؟ —— بیٹھا رہے —— اس نے سوچا —— دیکھتا رہے عورتوں کے خواب، اس نے کھڑکی کا پٹ دھک سے بند کر دیا۔ مریاں نے چونک کر چادر میں سے سر نکالا اور ایک لمحے کے بعد پھر چادر میں چھپ گئی۔

"جاگ رہی ہو؟" فضلو نے پوچھا، مگر وہ خاموش رہی، اور کہیں اندر سے وہ دعا مانگ رہا تھا کہ وہ خاموش رہے، سب خاموش رہیں، اور اس سناٹے میں وہ اپنے دماغ میں بھڑکتے ہوئے الاؤ کو بجھانے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہوا سو جائے —— وہ پھر سے کھاٹ پر لیٹ گیا۔

"چراغ بجھا دو۔ چادر کے اندر سے مریاں کی آواز آئی۔

"بجھا دوں گا۔" اس نے ناگواری سے کہا "جاگ رہی ہو؟"

مریاں خاموش رہی۔

فضلو نے مریاں کو ایک زناٹے کی گالی دینا چاہی، مگر اس سے اس سناٹے کے مجروح ہو جانے کا احتمال تھا جو اس وقت فضلو کے لیے ہوا کی طرح ضروری تھا۔

دیر تک اسے اپنے آپ سے شرم آتی رہی۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ رو دے۔ آنسو اس کی پتلیوں کے پیچھے مچل رہے تھے، اور گلے میں کچھ اٹک سا گیا تھا، اور سارا خون دماغ میں جمع ہو رہا تھا، پھر اچانک کھولتے ہوئے خون میں کوئی چیز جھنجھنائی، اور فضلو نے تیزی سے کروٹ بدل لی، ایک اور جھنکار ہوئی، اور وہ تڑپ کر دوسری کروٹ پر آ گیا۔ یہ جھنکاریں اور چھناکے اب اس کی رگوں میں دوڑنے لگے اس کے ٹخنے تک بج رہے تھے، اس کے کانوں کی لویں تک تپ رہی تھیں، وہ اٹھ بیٹھا، چراغ بجھا دیا اور پھر دیر تک وہیں کھڑا بجھے ہوئے چراغ کی لو کا بدبودار دھواں پیتا رہا، دروازہ کھول کر باہر جھانکا، کوئی بھیگا ہوا پرندہ چولہے کے پاس آ گرا، پھر اڑا اور دیوار پر کھلونے کی طرح جا بیٹھا، وہ شاید سو گیا تھا۔

ساری دنیا سو گئی تھی، صرف صاحب جاگ رہا تھا یا فضلو ـــــ صاحب کی جیب میں روپے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ فضلو کی جیب خالی تھی اور آنکھوں میں جلن تھی، اور اندر شیرو مارے سردی کے اب بے چین ہو ہو کر کروٹیں بدل رہا تھا، اور کراہ رہا تھا۔ اندر جا کر اس نے دروازہ بند کر لیا۔ چراغ جلایا، خالی صندوق کے اوپر پڑا ہوا ایک لحاف اٹھا کر شیرو کو اوڑھا دیا، چراغ بجھایا اور پھر کھاٹ پر آ رہا۔

دیر تک اس نے سو جانے کی کوشش کی آیت الکرسی تین بار کی بجائے سو بار پڑھ ڈالی، اپنے بالوں کی ایک لٹ کو اتنی دیر تک مروڑتا رہا کہ بالوں کی جڑیں دکھنے لگیں، ٹھوڑی

کے ایک طرف ننھے سے مہاسے کو اتنی دیر تک کھرچا کہ وہ زخم بن گیا، اٹھ بیٹھا، اور دیوار کا سہارا لے لیا۔ پھر جب بیٹھ دکھنے لگی تو کھاٹ پر پیٹ کے بل لیٹ گیا۔ پسلیوں میں چھریاں چبھنے لگیں تو پھر اٹھ بیٹھا۔ اور دماغ میں دھماکے کے ساتھ ایک چھناکا ہوا —— دس روپے روز —— بیس دنوں میں دوسو روپے —— دس مہینوں کی تنخواہ —— اور پھر سب سو رہے ہیں، سب سو جاتے ہیں، اور اسے روپیہ چاہیئے۔ عورتوں کو بھی روپیہ چاہیئے —— ماؤں باپوں کو بھی روپیہ چاہیئے —— مولوی حلیم نے دو لڑکیوں کو خراب کیا۔ پکڑا گیا، قید ہوا، چھوٹ کر آیا، لعنت ملامت ہوئی۔ اور پھر دنیا بھول گئی اور وہ پھر سے مسجد کا امام ہو گیا۔ دنیا بھول جاتی ہے، دنیا سو جاتی ہے، چوکیدار تک سو جاتے ہیں، اور اندھیرا اتنا گہرا ہے کہ لوگوں کو عورت تو کیا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔ اور بشنتو کے کانوں میں سونے کے کانٹے ہیں، اور سر پر آبی دوپٹہ ہے —— اور مریاں کے کانوں کی لوؤں کے سوراخ اداس ہیں اور اتنے لمبے لمبے بالوں پر ایسے موٹے کھدر کی چادر ہے جو لوہے کی چادر پر رگڑی جائے تو اسے بھی گھسا کر کاغذ بنا دے —— اور صاحب آدھی رات کو اسی طرح بیٹھا ہے، وہ رو رہا ہے، وہ مرد ہو کر عورت کی طرح رو رہا ہے، اس کی آواز میں للکار کی جگہ پکار ہے، وہ اتنا بڑا آدمی ہے، اتنا بڑا زمیندار ہے، اور اتنا غریب ہے، اتنا محتاج ہے کہ ایک چوکیدار سے ایک عورت کی بھیک مانگ رہا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اس بھیک کی قیمت بھی ادا کرے گا۔

"مریاں، جاگ رہی ہو؟"

"کیا ہے؟" غصے سے بھری ہوئی مریاں کی آواز آئی۔

"ارے! تم جاگ رہی ہو؟" وہ یوں گھبرا کر بولا جیسے مریاں کے سامنے اچانک ننگا ہو گیا ہے۔

وہ دیر تک چت لیٹا رہا۔ اس کی سانسیں تک بے آواز تھیں۔ اسے اپنا

باپ یاد آگیا جس کے ایک ہاتھ میں ہل کی ہتھی اور ایک میں تسبیح ہوتی تھی، اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جس روز اس کی کوئی نماز قضا ہوئی اسی روز قیامت آئے گی اور وہ جیل میں مرا کیونکہ مہاجن نے قرضے کی واپسی سے ناامید ہو کر نالش کر دی اور وہ بخار کی حالت میں اندر بھیج دیا گیا، اور مر گیا ــــ فضلو کی انگلیوں کی پوروں میں چل سی ہونے لگی، جیسے سرسریاں جلد کے اندر گھس کر پوروں کے دائرے میں گھوم رہی ہیں ــــ روپیہ ہے تو عزت ہے، نیک نامی ہے، صحت ہے۔ روپیہ نہیں تو اجڑے ہوئے رئیس خانے کی چوکیداری ہے، اور مریاں کی گالیاں ہیں اور رشیدو کی کراہیں ہیں۔ روپیہ نہ ہو تو آدمی خدا تک کی راہ میں کچھ نہیں کر سکتا، مسجد میں تیل تک نہیں دے سکتا۔ جمعرات کو مولوی کے لیے ایک روٹی تک نہیں پکوا سکتا۔ سر جھکا کے چلتا ہے، ہاتھ جوڑتا ہے، منت کرتا ہے، منہ میں بھر آنے والا پانی تھوکتا ہے ــــ اور پھر یہاں حوریں تو نہیں بستیں، عورتیں بستی ہیں اور یہ عورتیں وہ پریاں نہیں کہ چھو لو تو طوطے بن جائیں، بہشتو ہی کو لو، اس کی آنکھوں میں وہ باولا پن ہے جیسے ذرا سا اشارہ کر دو تو بھاگ کر آئے گی اور گود میں بیٹھ جائے گی۔ مریاں جیسی عورتیں ذرا کم ہی ملتی ہیں یہاں، جو پردہ نہیں کرتیں، مگر پھر بھی ایسا پردہ کرتی ہیں کہ کوئی دیکھ لے تو خود ہی پانی پانی ہو جائے۔ اور وہ سرائے کے بھٹیارے کی رانی خوبصورت ایسی کہ لٹھے کے تھان کی مورت، اور ندیدی ایسی کہ اٹھنی دکھاؤ تو بھوکی کتیا کی طرح بھاگی آئے اور پھر یہ مسافر عورتیں جو سروں پر پوٹلیاں رکھے سڑک پر سے گزرتی ہیں۔ اور یہ کنواریاں جن کی مدت تک شادیاں نہیں ہو سکتیں مارے غریبی کے، اور یہ بیاہی عورتیں جن کے شوہر ہانگ کانگ پولیس میں ہیں اور پانچ سال کے بعد ہی تین مہینے کے لیے گاؤں کا چکر لگا پاتے ہیں جب کہ ان کی بیویاں گاؤں کی بوڑھی دایا کو چار بار انعام دے چکی ہوتی ہیں، لاحول ولا قوۃ، آدمی ایسا بزدل بھی نہ ہو کہ عورت کا نام سنا اور گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ ایک دم اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ رئیس خانے کی کھڑکی اسی طرح

روشن تھی، اور صاحب کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا. فضلو نے کھڑکی کو کھلا چھوڑ کر دروازہ کھولا اور تیزی سے صحن کو طے کر کے برآمدے میں آگیا۔ دروازے پر جاتے ہی لوہے کی لاٹھ کی طرح جم گیا. زندگی کے سارے آثار، اس کے وجود سے غائب ہوگئے۔ اور اگر فوراً یوسف کی آواز اسے نہ چونکاتی تو شاید وہ قیامت تک یونہی جما کھڑا رہتا۔

"رک کیوں گئے فضلو؟" یوسف بولا۔

اور فضلو کے پاؤں تلے جیسے ایک سپرنگ نے اسے اچھال کر اندر پھینک دیا۔

"بیٹھو"، یوسف نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

فضلو نے دروازے کی طرف دیکھا، پھر چھت پر ایک نظریوں دوڑائی جیسے وہاں بھی کوئی دروازہ کھلا ہے۔ پھر سامنے دیوار پر نظریں گاڑ دیں، اور ہاتھوں کو ملتے ہوئے رک رک کر بولا: "جی میں کروں گا —— کل سے کروں گا"

اور اس کے بعد جیسے اسی سپرنگ نے اسے اچھال کر پھر سے دروازے پر پھینک دیا، مگر یوسف نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا، اور دوسرے ہاتھ سے اپنی جیب میں سے دس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اسے فضلو کی انگلیوں کی پوروں سے چھواتے ہوئے بولا: "تم اتنے شریف، اتنے نیک اور اتنے اچھے آدمی ہو کہ میں تمہاری جھجک پر حیران ہو رہا تھا۔ یہ تمہارے وعدے کا انعام ہے۔"

فضلو کی پوروں کی جلن اب ٹھنڈک میں بدل گئی، اس نے نوٹ کو پوروں میں جکڑ لیا، اور اسی ہاتھ کو ماتھے تک لے جاتے ہوئے "سلام" کہا اور چلا گیا۔ کوٹھری کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا، لالٹین بجھ گئی تھی اور رئیس خانہ اس کی کوٹھری کی طرح اندھیرے میں ڈوب گیا تھا. فضلو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کئی دنوں کے بھوکے کو پیٹ بھر کھانا کھلایا ہے۔ وہ اندر کھاٹ پر لیٹ گیا. کچھ دیر اندھیرے

میں آنکھیں کھولے پڑا رہا، پھر نوٹ کو جیب سے نکال کر تکیے کے نیچے رکھا اور نہایت اطمینان سے سوگیا۔

صبح وہ دیر تک سویا رہا۔ مریاں نے چائے تیار کرنے کے بعد اس کا شانہ ہلایا اور وہ بھڑک کر اُٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے سامنے مریاں کو دیکھا، پھر باہر ننھی ننھی پھوار کی جھالر کے پار ٹین کی چھت تلے چولہے کے پاس شیرو کو بیٹھے دیکھا جو مٹی کے پیالے میں چائے کو پھونکیں مار رہا تھا اور پھر اس نے آسمان کے ایک ٹکڑے کو دیکھا۔ "ابھی تو سورج بھی نہیں اُبھرا" اس نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"سورج نہیں ابھرا!" مریاں نے طنز کی۔ رات کا غصہ شاید ابھی تک باقی تھا۔ "سورج بادلوں بادلوں میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے اور اس کے لیے ابھی پو بھی نہیں پھٹی، رات بھر کیا کرتے رہے ہو؟ چوہوں بلیوں کی طرح کبھی لحاف گھسیٹ رہے ہو، کبھی کھڑکی کے پٹ کھڑکا رہے ہو، کبھی دروازہ کھل رہا ہے، کبھی باہر کی سیریں ہو رہی ہیں —— بھت تو نہیں کھا گئے تھے؟"

فضلو کی نظریں اس وقت بند کھڑکی پر جمی تھیں۔ اسے آہستہ آہستہ یاد آرہا تھا کہ اس نے کھڑکی کھول کر رئیس خانے کی طرف دیکھا تھا اور پھر کھڑکی بند کیے بغیر باہر چلا گیا تھا۔ "یہ کھڑکی کس نے بند کی؟" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں نے" مریاں بولی۔

"کب؟" اس نے پوچھنا چاہا مگر نہ پوچھ سکا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ کوٹھری کے صاف ستھرے فرش میں اسے جا بجا گڑھے نظر آنے لگے، مریاں سے اسے خوف آنے لگا "مریاں!" اس نے کہا، "بات یہ ہے کہ تمہارے روٹھ جانے کی وجہ سے میں رات بھر اداس رہا، نیند نہیں آتی تھی۔"

"حرامزادہ!" مریاں نے کہا، مگر اس انداز سے کہ فضلو نے اس گالی کا جواب دینا کچھ

ضروری نہ سمجھا۔ ''میں روٹھی تھی تو تم بھی تو روٹھے تھے، تم نہیں سوئے تو میری آنکھ کب لگی۔ ذرا اِدھر دیکھو۔''

تو وہ رات بھر جاگتی رہتی ہے! —— تو اس کو سب کچھ معلوم ہے!

''اِدھر دیکھو۔'' مریاں نے دوبارہ کہا۔

اس نے مریاں کی طرف دیکھا، اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور سوج رہی تھیں اور تھکی ہوئی تھیں لیکن ان میں غم یا غصہ نہیں، پیار کی روشنی تھی۔ ''آؤ من جائیں۔'' وہ بولی، ''دایاں ہاتھ اِدھر لاؤ۔''

فضلو اطمینان سے مسکرایا، اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور مریاں چیخ اٹھی: ارے یہ تو دس روپے کا نوٹ ہے! یہ اتنے بہت سے روپے کہاں سے لائے ہو تم؟ —— تنخواہ تو ابھی پرسوں ہی ملی تھی!''

''صاحب نے بخشش دی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ہماری خدمت سے بہت خوش ہے۔''

''بخشش!'' مریاں جیسے نشے میں بولی۔ ''جیتا رہے، پھلے پھولے، خوشیاں دیکھے —— اور فضلو آج بڑا غضب ہو گیا، صاحب کے لیے مکھن کہیں سے نہیں ملا۔ سب کہتے ہیں رات اچانک سردی پڑی اس لیے دہی نہیں جما، بلونے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ بڑی شرم آ رہی ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہمارا صاحب قلندر آدمی ہے۔ اور سور کی بچی صلح بھی ہو چکی اور ابھی ایک پیار تک کی توفیق نہیں ہوئی تجھے۔ کچھ شرم ہو تو ڈوب مر چائے کی کیتلی میں۔''

مریاں ہنس دی، اس نے بھی فضلو کی گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا۔ وہ جھکی، اس کے ایک گال کو چوما اور پھر اپنا گال آگے کر دیا۔ فضلو نے پہلے تو اسے ہلکا سا طمانچہ مارا، پھر جب وہ سنجیدہ سی بن کر پلٹنے لگی تو فضلو نے اسے جکڑ لیا اور اتنے پیار کیے کہ باہر شیرو چائے پینا تک بھول گیا۔

چائے کا طشت لے کر وہ رئیس خانے کو چلا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس پر گھبراہٹ

طاری ہوگئی۔ بڑی مشکل سے سنبھلا، اور اندر کچھ یوں جھینپا جھینپا گیا جیسے اپنے چہرے سے رات کی کالکھ دھونا بھول گیا ہے لیکن یوسف نے رات کی کوئی بات نہ کی، خوشگوار موسم کا ذکر کیا اور اس سے کہا: "ذرا یہ دوربین لے کر سکیسر اور سون کے نظارے دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دنیا کی بڑی بڑی لینڈسکیپ پینٹنگز بکھیر دی گئی ہیں ہر طرف ــــ یعنی بڑے اچھے نظارے ہیں۔" فضلو دوربین لے کر باہر صحن میں آ گیا۔ نیچے وادی میں جھیل کے کنارے کے درختوں کے عکس دیکھتا رہا۔ پھر چٹا اور کوٹلی اوگالی کے دیہات پر سے ہوتا ہوا انگہ پہنچا جہاں سفید سفید دو منزلہ مکان آسمان کے ابر آلود ہونے کے باوجود چمک رہے تھے۔ لمبائی میں بکھرے ہوئے انگہ سے اتر کر وہ ٹکر کوٹ اور سرال پر آیا، اور ان دیہات کے جنوب میں بکھرے ہوئے سبزہ زاروں میں جا بجا گھنے توتوں میں گھرے ہوئے کنوؤں اور ان کے گرد تراشی ہوئی کیاریوں کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔ وہاں سے وہ سون کے مرکزی قصبے نوشہرہ کی طرف گھوما، شہر سے زیادہ ہسپتال اور سکول کی عمارتوں پر جا کر رکا، پھر تھانے پر آیا، کالی بھجنگ عمارت ایک پرانے قبرستان کے سرے پر شاید پرانی قبروں میں ہی اپنی بنیادیں گاڑے کھڑی تھی، پھر وہ بھرالی کھری، اور کروڈھی پر سے ہوتا ہوا اچھالی پہنچا۔ یہ گاؤں جھیل کے جنوب مغربی کنارے پر آباد تھا، گاؤں کے ارد گرد کنوؤں کے پاس توتوں کے چھتناروں تلے بہت سے خیمے تنے ہوئے تھے۔ ان خیموں میں ایسے میدانی رئیس بستے تھے جو سکیسر کی بلندیوں پر آنا برداشت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ سکیسر پر مرغی کا ایک انڈا چار آنے میں اور گلاب کا ایک پھول آٹھ آنے میں ملتا تھا اور ڈاک بنگلے کے مالی کی غیر حاضری میں تو اس کی بہن بھشتو نے کئی لوگوں سے ایک پھول کا ایک روپیہ تک وصول کیا تھا۔ فضلو فوراً پلٹا اور دوربین کو سکیسر کے بنگلوں پر گھمایا، صحن سے ڈاک بنگلہ نہایت صاف نظر آتا تھا مگر دوربین کی وجہ سے وہ ابھی ڈاک بنگلے تک نہیں پہنچنے پایا تھا۔ درخت نہا کر نکھر گئے تھے۔ ننھی ننھی پھوار نے پتوں پر موتی ٹانک دیے تھے اور رئیس خانے کے درختوں کے پتے تو فضلو کو صاحب کے بٹوے کے برابر بڑے

نظر آ رہے تھے۔ پھر ایک دم گھومتی ہوئی دوربین ڈاک بنگلے پر جا کر رک گئی۔ باغیچے میں بہشتو پھول توڑ رہی تھی۔ وہ اسے اتنی قریب محسوس ہوئی کہ اس کا جی چاہا، اس سے بات کرے ـــــــ اس کا لباس علاقے کی دوسری عورتوں کی طرح ڈھیلا ڈھالا تھا، مگر پھوار کی وجہ سے وہ جگہ جگہ سے اس کے جسم سے چمٹ گیا تھا، اور بھری بھری آپے سے باہر جوانی کے بڑے کافر دائرے اور ظالم قوسیں نمایاں تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے، شاید وہ کچھ گنگنا رہی تھی اور ایک درخت پر بیٹھے ہوئے لال چونچوں والے سبز طوطے گردنیں یوں جھکائے بیٹھے تھے جیسے بہشتو کو دیکھ رہے ہیں، اور دیکھ نہیں رہے تو سُن ضرور رہے ہیں۔

"بھئی تم تو دوربین کے ہی ہو رہے" اندر سے آواز آئی، اور وہ چونکا۔ چائے کے برتن واپس پہنچا کر اور خود جلدی جلدی چائے پی کر وہ باہر سڑک پر آ گیا۔ روزانہ اس وقت باہر جانا اس کا معمول تھا۔ مرغیاں خریدتا تھا، انھیں ٹٹولتا تھا، انھیں ہاتھ پر تولتا تھا، ان کے دام چکاتا تھا اور پھر انھیں گھر لا کر اور انھیں ذبح کر کے ان کی چمڑی ادھیڑتا تھا۔ لیکن آج وہ کچھ اور خریدنے نکلا تھا۔ زندگی میں یہ اس کا پہلا تجربہ نہ سہی، پہلا عملی تجربہ ضرور تھا۔ شادی سے پہلے اس نے جی ہی جی میں گاؤں کی ہر خوش رُو لڑکی سے عشق کیا، چوراہوں پر بیٹھا، الغوزے بجائے، ہیر گائی لیکن اس نے آج تک کسی لڑکی کا پلّو نہیں کھینچا تھا، کسی کے کنکری نہیں ماری تھی، کسی کے قریب سے گزرتے ہوئے آہ نہیں بھری تھی، بس سب کو آنکھ بھر کر دیکھا تھا اور بہت دنوں تک سب کے لیے ترس ترس کر جیا تھا، اور پھر اُسے مریاں مل گئی جسے دیکھ کر وہ ساری دنیا کا حُسن بھول گیا تھا، اسے تیلی کی اس لڑکی تک کا حسن بھول گیا تھا جس کے بارے میں سوچتے سوچتے اس نے خوابوں میں اس کے کولہو چلائے تھے اور نمبردار کے گھر سے سرسوں اور تارامیرا کی بوریاں چوری چوری اس کے ہاں ڈھو لایا تھا۔ مریاں سب سے مختلف تھی، بڑی بڑی آنکھوں کے پپوٹوں پر کاجل کی دھندلی سی لکیر

آج پانچ چھ سال سے بار بار دھوئے جانے کے باوجود نہیں دُھلی تھی۔ اس کے چہرے کی لالی اور گالوں کی شفق کو سوکھے ٹکڑے تک نہیں چھین سکے تھے، اور اس کے بالوں کی لہریں لکڑی کی بے رحم کنگھیوں میں سینکڑوں بار کسے جانے کے باوجود نہیں مٹنے پائی تھیں۔

مریاں کے بارے میں اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ اگر وہ بات بات پر گالی نہ بکتی تو اس کی ٹکر کی عورت کسی نواب کو بھی نصیب نہ ہوگی۔ وہ پانچ چھ برس تک مریاں سے آگے سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور آج وہ بہشتو کے پاس جا رہا تھا ـــــ اور اگر بہشتو نے لمبے بھائی سے کہہ دیا ـــــ اس کے بھائی نے کسی افسر سے کہہ دیا ـــــ اور پھر کسی نے اگر مریاں سے کہہ دیا ـــــ تو؟ تو کیا! بہشتو اُسے تو نہیں چاہیئے تھی اور ـــــ لیکن سامنے کھڑی ہوئی بہشتو کی آواز نے اس کے ڈولتے ہوئے ارادے کو سنبھالا دیا۔ "کہاں چلے فضلو بھائی، مرغیوں کی تلاش میں ہو گے۔ یہ صاحب سکیسر پر مرغیوں کی نسل ختم کر کے ہی دم لے گا" ـــــ وہ زور سے ہنسی، اس ہنسی میں گھنٹی کی سی ٹنٹناہٹ تھی۔ ایسی ہنسی جو صحت مند خون کے کھولاؤ ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

"پھول چاہئیں؟" اس نے پوچھا۔ "ارے حیران کیوں کھڑے ہو؟ میں نے کبھی تم سے قیمت لی ہے جو آج لوں گی، مریاں اپنی سہیلی ہے!"

ہیر پھیر سے بات کرنے کی اَن گنت تجویزیں فضلو کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئیں، اس کا رنگ فق ہو گیا، ہونٹ اچانک خشک ہو گئے، آنکھوں سے پتلیاں جیسے غائب ہو گئیں اور وہ پاگلوں کی نہایت بھولے طریقے سے بولا: "بہشتو۔"

"کہو۔"

"رات صاحب کے پاس گزارو گی؟ ـــــ سو روپے ملیں گے۔" اور وہ خیال ہی خیال میں زمین کے اندر دھنسنے لگا ـــــ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ سکیسر کی چوٹی پر کھڑا ہے یا جھیل کی تہہ میں بیٹھا ہے، اور آسمان سے پھوار گر رہی ہے یا کنکریاں برس رہی ہیں۔

بھشتو نے اس کے ہاتھ کو اس تیزی سے جکڑا کہ انگلیوں کی ٹیس نے اس کے سب حواس کو چوکنا کر دیا۔ وہ سرگوشی میں بولی: "کس وقت؟"

ارے!

فضلو جھیل کی تہہ سے اٹھ کر ڈاک بنگلے کے باغیچے میں آگیا۔

"عشا کی نماز کے بعد۔" وہ بولا۔

"کہاں ملوگے؟"

"سڑک سے ادھر پرانے کھوکے نیچے۔"

"سو بھی ملیں گے نا؟"

"ہاں ہاں پورے سو۔"

"بھیا کو خبر نہ ہو۔"

"مجھے کیا پڑی ہے!"

"آہستہ بولو۔"

"تم بھی ذرا آہستہ بولو۔"

کچھ دیر رک کر وہ مسکرائی اور بولی: "صاحب آج پانچ چھ دن سے تمہارے وہاں ہے۔"

"ہاں۔"

"مریاں نے کتنے سو کمائے ہیں؟"

ایک دم جیسے آسمان ٹوٹ پڑا اور سکیسر بیٹھ گیا۔ "سؤر کی بچی۔" اس نے بھشتو کو گالی دی اور مٹھیاں بھینچ کر اور نچلے ہونٹ کا ایک حصہ دانتوں تلے دبا کر بھاگا۔

"فضلو بھائی۔" بھشتو کی آواز آئی۔

مگر وہ بھاگا چلا گیا۔ رئیس خانے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کی رفتار اور تیز ہو گئی اور پھر بہت نیچے سڑک کے بڑے موڑ پر جھپٹتے ہوئے بادلوں میں اتر گیا۔ وہ کافی دیر کے بعد

واپس آیا۔ نہایت گنجان بوندیں گر رہی تھیں اور ہوا نے اچھی خاصی خنکی پیدا کر دی تھی۔ نیچے وادی کا ایک حصہ دھوپ کی وجہ سے سنہری ہو رہا تھا، مگر سورج کا کہیں نشان نہ تھا۔ فضلو ٹھٹھرا اور بھیگا ہوا کوٹھری میں آیا، صاحب کو کھانا کھلانے کے بعد پھر کوٹھری میں آگھسا اور کھاٹ پر لیٹ رہا۔ مریاں وقت سے پہلے اس کے لیے چائے بنا لائی "آج تم کچھ سست سے لگ رہے ہو، موسم ایک دم بدلا ہے نا ـــــ چادر اوڑھ کر باہر جایا کرو، سکیسر کا ساون تو سون کے اسوج کے برابر ہوتا ہے، لو چائے پیو۔ اٹھو۔"

وہ چپ چاپ چائے پینے لگا، پھر چادر اوڑھ کر صاحب کو چائے پلانے گیا اور واپس آکر کھاٹ پر پڑا رہا۔ صاحب کو کھانا کھلانے گیا اور پھر آکر کھاٹ پر گر پڑا۔ اس نے صاحب سے کوئی بات نہ کی اور صاحب نے بھی اس کی سنجیدگی کو نہ توڑا۔ جیسے اسے معلوم تھا کہ اس سنجیدگی کی تہہ میں کچھ ہے۔ سکیسر کی مسجد میں عشا کی نماز پڑھ کر جب نمازی باتیں کرتے ہوئے رئیس خانے کے قریب سڑک پر سے گزرے تو فضلو چونکا مگر پھر چادر سے منہ تک چھپا لیا۔ اندر اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور کھدّر کی چادر میں سے اسے چراغ کی روشنی بہت ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی۔ مریاں اور شیرو آج اطمینان سے سو رہے تھے۔ مریاں نے دیر تک اس کا سر دبایا تھا اور پھر اس کی کھاٹ پر سے یوں دبے پاؤں اُتری تھی جیسے وہ سو گیا ہے۔ مریاں پر اسے بہت پیار آنے لگا۔ پھر اچانک اس کے جی میں آئی، وہ کوٹھری سے نکل کر سیدھا ڈاک بنگلے میں پہنچے اور وہاں باغیچے میں کھڑے ہو کر پشتو کو ایسی ایسی گالیاں دے جو آج تک کسی نے نہ سنیں نہ سوچیں۔ وہ چادر لپیٹے چپکے سے باہر آ گیا۔

رئیس خانے کی کھڑکی روشن تھی، روشنی سے کترا کر سڑک کی طرف جانے لگا کہ پرانے کہو کے تنے کے پاس کچھ ہلا اور آواز آئی: "فضلو بھائی۔"

وہ گڑ گیا، اس کے دماغ میں پٹاخے چھوٹنے لگے۔ گالیاں اس کے دماغ سے نکل کر اس کے گلے میں ایک دوسرے پر سوار ہو کر بیٹھ گئیں، اور اس کی زبان کی نوک تپ گئی۔

بہشتو اس کے قریب آ گئی۔ "میں تو بھیگ گئی فضلو، اتنی دیر سے تو بیٹھی ہوں، نماز تو کب کی ہو چکی۔"

فضلو وہیں جما رہا۔

"اور فضلو، مجھے بخش دو، مجھے کیا خبر تھی کہ میرے ذرا سے مذاق پر تمہیں اتنا تاؤ آ جائے گا۔ میں تو صرف مذاق کر رہی تھی۔ اور ــــــ"

فضلو نے اُس کا ٹھنڈا اور بھیگا ہوا ہاتھ پکڑا اور چپ چاپ رئیس خانے کی طرف چلا۔ برآمدے میں قدم رکھنے سے پہلے اس نے پلٹ کر کوٹھری کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ایک جھری نظر آ رہی تھی۔ وہ چراغ بجھانا بھول گیا تھا، اور یہ جھری جیسے اس پر ہنس رہی تھی، پھر دو ایک جھری بن گئی، پھر سمٹ کر مریاں کی غصے اور اور دکھ سے بھری ہوئی آنکھ بن گئی، اور جب فضلو نے اپنی آنکھیں ملیں تو وہ پھر سے جھری بن گئی۔ اُس نے بہشتو کو ہاتھ سے گھسیٹ کر تیزی سے اندر جانا چاہا، مگر بہشتو اپنا ہاتھ کھینچ کر آہستہ سے بولی: "پورے سو ہی ملیں گے نا؟"

"پورے سو۔" فضلو پہلی بار بولا اور اسے اندر لے گیا۔

یوسف گھٹنوں کے ارد گرد باہیں لپیٹے، سر کو گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا، آواز سُن کر چونکا، اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی، جو اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں تک میں پھیل گئی۔ وہ تیزی سے اُٹھا، کھڑکی بند کر دی، فضلو کو باہر برآمدے میں لے گیا اور اس کی پیٹھ تھپتھپا کر بولا: "تم بہت اچھے آدمی ہو فضلو، میں جیتے جی تو تمہارے احسان کا بدلہ شاید ہی اتار سکوں، یہ لو ایک سو کا نوٹ، یہ بہشتو کے لیے اور دس روپے ــــ یہ تمہارے ہیں ــــ کل نیا حساب چلے گا ــــ میں بُرا آدمی نہیں ہوں فضلو ــــ یہ دنیا بُری ہے، یہ ساون بُرا ہے ــــ سمجھے؟ ــــ خدا حافظ۔"

فضلو کی پوروں میں صبح والی جُل جاگ اُٹھی، اس نے دونوں نوٹ اپنی مُٹھی میں چھپائے

اور اپنی کوٹھری میں آگیا۔

وہ ساری رات جاگتا رہا، دیا بجھانے کے باوجود اُسے نیند نہ آئی، مریاں کی سانسوں تک کی آواز سے اسے وحشت ہو رہی تھی، شیرو کے کھٹولے کی ایک ذرا سی آواز سے وہ لرز اُٹھتا تھا۔ اس کی آنکھیں دُکھنے لگیں، زبان جڑ تک خشک ہو گئی، سانس تک مشکل سے آنے لگی، ہاتھ اور پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا، صبح قریب تھی۔ وہ رئیس خانے کی طرف لپکا۔ اندر لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں گیا، وہاں ٹین کا ایک دیا جل رہا تھا اور جھنتو پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، فضلو کے اندر جاتے ہی وہ بھڑک اُٹھی، اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، وہ بولی: "یہ کیسا صاحب ہے فضلو، یہ تو کچھ انوکھا صاحب ہے۔ میں نے تو یہ رات کانٹوں پر گزاری ہے، ایسا لگتا تھا جیسے ہاتھ پیر کاٹ کر گھورے پر ڈال دی گئی ہوں۔ سو روپے کا سودا، اور ہوا یہ کہ تمہارے جانے کے بعد اس نے بڑے پیار سے میرے لیے یہ بستر بنایا، پھر مجھے یہاں بیٹھ جانے کو کہا، لالٹین وہ سامنے رکھ دی، اور مجھے پاگلوں کی طرح ٹکر ٹکر بھوکی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے گھبرا کر رُخ بدلنا چاہا تو بولا: "نہیں یونہی بیٹھی رہو۔ میں تمہیں دیکھوں گا۔ میں صرف دیکھوں گا تمہیں۔ تمہیں نیند آنے لگے تو سو جانا، میں تمہیں سوتا دیکھوں گا۔ تم رونا چاہو تو رو دینا، میں تمہاری بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھوں گا۔ بس میں تو صرف دیکھوں گا تمہیں، اور فضلو، وہ مجھے اسی طرح دیکھتا رہا، میں تھک کر لیٹ گئی جب بھی وہ مجھے دیکھتا رہا، میری ذرا سی آنکھ لگ گئی۔ پھر جب کھلی تو وہ اسی طرح میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔ بس میں آنکھیں بند کیے پڑی رہی، اور وہ سامنے بیٹھا رہا اور ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جب پہلے مرغے کی بانگ سنائی دی تو لالٹین اُٹھا کر ادھر کمرے میں چلا گیا، اور میں جب سے نہیں سو پائی، جانتی تھی کہ ابھی صبح ہو جائے گی۔ میرا تو جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے مجھے گھٹنوں تلے دبا کر خوب پیٹا ہے، اور اس نے

مجھے چھوا تک نہیں فضلو!"

فضلو کی حیرانی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ صاحب اس کی نظروں میں اچانک ان ولیوں کی صورت اختیار کر گیا جو لڑکوں لڑکیوں سے محبت کر کے خدا کی محبت تک پہنچے۔ گاؤں کا مولوی حلیم بھی اسے بالکل بے گناہ نظر آنے لگا، ممکن ہے وہ بھی خدا تک پہنچنے کی کوئی سبیل ڈھونڈھ رہا ہو — اور یہ صاحب — !

اس نے ایک سو کا نوٹ بشنتو کے زانو پر رکھ دیا۔

"سو کا ہے نا؟" اس نے دیے کی طرف جھک کر نوٹ کو الٹا پلٹا۔

"پورے سو کا ہے۔" وہ بولا۔ "جاؤ، پوچھنے ہی والی ہے۔"

"تمہارا حصہ؟" بشنتو نے شاید تجربے کی بنا پر پوچھا۔

"جاؤ۔" فضلو گھبرا کر بولا۔

بشنتو اٹھی اور کراہی۔ پھر ایک لمبی انگڑائی لی۔ اٹھتے ہوئے ہاتھ تیزی سے نیچے گرائے اور رانوں پر چٹاخ سے مارے، الٹے ہاتھوں سے آنکھیں مل کر اس نے دوپٹہ یوں احتیاط سے لپیٹا جیسے تہجد پڑھنے چلی ہے، وہ بولی "تم کل والی بات سے خفا تو نہیں؟"

فضلو نے نفی میں سر ہلا دینا کافی سمجھا۔

"میں تو نوکر ہوں تمہاری، جب چاہو بلا لینا۔" وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

فضلو بالکل ہلکا پھلکا ہو کر وہاں سے نکلا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا، صاحب نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا، بشنتو نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ اس نے تو صرف بشنتو کو دیکھا تھا، اور عورت کو دیکھتا کون نہیں۔ خود فضلو نے بشنتو کو کئی بار دیکھا تھا۔ دیکھنے میں کیا برائی ہے — وہ کوٹھری میں واپس آ کر بڑی گہری نیند سو گیا۔

صبح اسے مریاں نے جگایا۔ "یہ دیر تک سونے کی کیا عادت ڈال رہے ہو — چوکیدار کو یہ زیب نہیں دیتا۔" اس نے بڑے پیار سے فضلو کو سمجھایا۔

پھر جب وہ صاحب کے پاس چائے لے گیا تو وہ بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور کچھ گنگنا رہا تھا۔ آج اس کے چہرے پر بہت رونق تھی، اور اگرچہ آنکھیں تھکی تھکی تھیں مگر اس تھکن میں بھی ایک کیفیت تھی۔ فضلو نے اسے نہایت عقیدت سے دیکھا، دونوں مسکرائے، اور صاحب بولا: "معلوم ہوتا ہے آج دھوپ نکلے گی، بادل بھاگے پھر رہے ہیں۔"

"جی ہاں۔" فضلو نے اس سے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا، مارے عقیدت کے اس کا گلا بھرا آ رہا تھا۔

چائے پی کر وہ پھر کسی نئی عورت کی تلاش میں نکل گیا۔ اور نہایت آسانی سے سرائے کے بھٹیارے کی بیوی سے معاملہ طے کر لیا۔ وہ خوبصورت تو نہیں تھی مگر اس کی شخصیت ایسی زوردار تھی کہ بڑی بڑی حسین عورتوں کے مجمعے میں بھی سب پر چھائی رہتی تھی اور اس کے ہونٹوں میں پکے پھلوں کی سی دعوت تھی —— فضلو نے دن بھر اطمینان سے دوسرے کام کیے، رات کو وہ پرانے کھونٹے آ نکلی، اسے رئیس خانے تک پہنچایا، کوٹھری میں آ کر سو رہا، ٹھیک وقت پر آنکھ کھلی، دبے پاؤں رئیس خانے تک پہنچا، لالٹین جل رہی تھی اور یوسف سو رہا تھا۔ ساتھ کے کمرے میں دیا روشن تھا اور جوان بھٹیارن پلنگ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی، فضلو کو دیکھتے ہی وہ رونے لگی۔

"کیا بات ہے؟" فضلو نے اسے تسلی دینے کا ارادہ کیا۔

"بات تو کوئی نہیں فضلو" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی: "اور دکھ کی بات بھی یہی ہے کہ کوئی بات ہے ہی نہیں۔ صاحب نے تو رات بھر مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا، بس بیٹھا دیکھتا رہا دیر تک۔ کہنے لگا، بس میں تمہیں دیکھوں گا۔ میں نے صرف دیکھتے رہنے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ سونا چاہو تو سو جاؤ، مجھے تو بس دیکھنا ہے ——"

"تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟" فضلو نے پوچھا۔

وہ اور زور سے روتے ہوئے بولی روپے جو نہیں ملیں گے، صرف دیکھنے کے کون دیتا ہے سو روپے"

فضلو نے سو روپے کا نوٹ بھٹیارن کو تھما دیا۔ وہ پہلے تو منہ کھولے سو روپے کے نوٹ کو دیکھتی رہی، پھر آنسو پونچھے اور چپکے سے باہر چلی گئی۔

فضلو دیر تک وہیں کھڑا رہا، پھر اس نے دیا بجھایا اور یوسف کے کمرے میں آیا، وہ سو رہا تھا، فضلو کو اس کے چہرے کے اردگرد ایک ہالا نظر آنے لگا، اس کے ماتھے میں سے لالٹین کی سی روشنی نکل رہی تھی "کتنا اچھا ہے میرا صاحب —— کتنا پیارا ہے —— کتنا نیک ہے —— ا —— اللہ یہ ساون کبھی ختم نہ ہو —— اللہ یہ جھڑی کبھی نہ رُکے —— اللہ صاحب کبھی یہاں سے نہ جائے" —— وہ چپ چاپ باہر آگیا۔

آج وہ نئی عورت کے لیے باہر سڑک پر آیا ہی تھا کہ ایک دم بادل پھٹ پڑا اور سڑک پر جاتی ہوئی ایک عورت گھبرا کر پرانے کھنڈ تلے آگئی۔ وہ کوٹھی کی طرف بھاگنا چاہتا تھا مگر اس عورت کو دیکھ کر اس نے قسمت آزمائی کی ٹھانی، پتلی دُبلی سی تھی مگر ناک نقشہ ایسا کہ معلوم ہوتا تھا چینی کی گڑیا میں جان پڑ گئی ہے۔

وہ اس کے پاس گیا۔ "کہاں جانا ہے بہن؟"

"میاں والی جانا ہے۔" وہ پوٹلی کو دامن تلے چھپاتے ہوئے بولی "وہاں میرا گھر والا جیل میں ہے، ملاقات پر جارہی ہوں۔"

"آج رات یہیں رہ جاؤ۔" فضلو نے کچھ سوچے سمجھے بغیر کہا۔

"کیا؟" عورت نے حیرت سے پوچھا۔

"میں کہہ رہا ہوں، رات ہی کی تو بات ہے، یہیں میرے پاس رہ جاؤ، ایک صاحب آیا ہوا ہے، رات کے سو روپے دیتا ہے۔"

عورت تن کر کھڑی ہوگئی، پوٹلی نیچے گر کر ایک طرف سے کھل گئی اور اس میں سے

دیہاتی بسکٹ ــــ گوگڑے ــــ جھانکنے لگے۔ اس نے چلا چلا کر فضلو کو اتنی بہت سی گالیاں دیں کہ وہ وہاں سے گھبرا کر بھاگا۔ ''اپنی ماں کو لے آ ــــ اپنی بہن کو بلا لا ــــ اپنی بیوی سے کہہ ــــ'' دور تک اس کی آواز سنائی دیتی رہی۔ وہ سڑک پر سے بڑی پگڈنڈی اور بڑی پگڈنڈی پر سے چھوٹی پگڈنڈی پر بھاگتا چلا گیا۔ معلوم ہوتا تھا عورت کی آواز اور بادل کی گرج اور موسلا دھار بارش اس کے تعاقب میں ہیں۔ اس کا لباس اس کے جسم سے چپک گیا۔ مارے ٹھنڈ کے دانت بجنے لگے، ہاتھ پاؤں سن ہو گئے اور وہ بھاگتا چلا گیا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر مسافر عورت کی آواز کو مریاں نے سن لیا، اور مریاں نے اسے بھاگتا دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔

آخر وہ ایک بنگلے کے پہلو والی کوٹھریوں میں ایک کوٹھری کا دروازہ کھلا دیکھ کر اس طرف بھاگا۔ اندر ایک نوجوان عورت بیٹھی مٹھی بھر دال کو چنگیر میں پھیلائے اس میں سے کنکریاں چن رہی تھی۔ فضلو کو دیکھتے ہی بولی: ''پھنس گئے بارش میں؟''

''ہاں۔'' اس نے کہا اور چوپے اور چادر کو نچوڑنے لگا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' عورت بولی۔

وہ بیٹھنے کی جگہ منتخب کرنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

''اُدھر چولہے میں کچھ آگ ہوگی۔'' وہ بولی۔

فضلو چولہے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ بارش اسی شدت سے ہو رہی تھی۔

لڑکی کا چہرہ عام سا تھا، مگر اس کے ہونٹوں کے گوشے بڑے پیارے تھے۔ بھرے بھرے گالوں میں پھنسے ہوئے اور گہرے۔ بات کرتی تھی تو اس کے ایک گال پر دو گڑھے بنتے اور مٹتے رہتے تھے، وہ بولی: ''تم رئیس خانے کے چوکیدار ہو نا۔''

''ہاں۔'' اس نے حیرت سے کہا اور پھر سوچا، یہ تو بہت بُری بات ہوئی، یہ تو مجھے پہچانتی ہے۔

"تم یہاں کیا کرتی ہو؟" فضلو نے پوچھا۔

"نوکرانی ہوں، بیگموں کے جسم دابتی ہوں رات کو ـــــ دس روپے اور روٹی ـــــ کٹ رہی ہے۔"

"اکیلی؟"

ہاں، کوئی ہے ہی نہیں، سب ایک ایک کر کے مرتے چلے گئے۔ ماں یہیں پچھلے جمعے کو مری ہے، کفن بیگم نے دیا تھا ـــــ" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ دال میں سے کنکریاں چننے کے بجائے چہرے پر سے آنسو سمیٹنے لگی۔

فضلو کو یہ عورت بشتو اور بھٹیارن سے کچھ الگ سی معلوم ہو رہی تھی، وہ اس سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے جی ہی جی میں اپنے آپ کو بہت کوسا کہ خواہ مخواہ مولوی بنا پھرتا رہا اور اُسے آج تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ سکیسر پر وہ کون سی عورتیں ہیں جو آسانی سے خریدی جا سکتی ہیں۔ مسافر عورت کی گالیاں ابھی تک اُس کے دماغ میں سوئیوں کی طرح چبھی ہوئی تھیں۔ وہ دیر تک لکڑی کے ایک ٹکڑے سے چولہے میں بجھے ہوئے انگاروں کو الٹتا پلٹتا رہا، پھر جب کافی دیر کے بعد بارش تھمی تو وہ اُٹھا۔

"جاتے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"ہاں، اب چلیں۔" اس نے کہا اور باہر آ گیا۔

باہر آتے ہی اس نے اپنے آپ کو بڑا بزدل محسوس کیا، اگر وہ یہاں سے کچھ کہے بغیر پلٹ گیا تو پھر اور کون ہے سکیسر بھر میں۔ کیا وہ مریاں سے جا کر کہے گا؟ ـــــ اس نے وحشت میں اپنے بالوں کی ایک لٹ یوں کھینچی جیسے جڑ سے اکھیڑ لے گا ـــــ تو کیا وہ یہاں سے ناکام پلٹ جائے گا۔ اور اس کے صاحب کی راتیں اُجڑ جائیں گی اور اس کے روز کے دس روپے، مہینے کے تین سو روپے، الگ مارے جائیں گے ـــــ وہ گھوم کر پھر دروازے پر آ گیا۔

"کچھ بھول گئے ہو؟" عورت نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"کیا؟"

"ایک بات کہنا بھول گیا۔"

"کیا بات؟"

"ایک بات ہے۔"

"کیا بات ہے؟

"ذرا سی بات ہے۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا "سو روپے ملیں گے۔"

"سو روپے!" عورت نے حیران ہو کر کہا "مگر کس بات کے؟"

"بس ایک رات کی بات ہے۔" فضلو نے بڑی جرأت سے کہا۔

عورت نے اس کی طرف دیکھا اور پھر دیکھتی رہ گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں بہت سے آنسو بھر گئے اور جب اس نے پلکیں جھپکیں تو اکٹھے بہت سے آنسو ایک دوسرے کے پیچھے چنگیر میں گرنے لگے، اور وہ جیسے کنکریوں کے بجائے آنسو چننے لگی، پھر وہ چنگیر کو ایک طرف رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

فضلو شرمندہ ہو کر واپس چلا آیا۔ اس روز سکیسر کے بنگلوں کے چکر پر چکر لگاتا رہا۔ بہت سی نوکرانیاں، چوکیدارنیاں، سبزی بیچنے والیاں اور مسافر عورتیں اسے دکھائی دیں، مگر وہ کسی سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ صاحب کے سامنے بھی نہ گیا۔ شیرو نے بڑی مشکل سے ایک ایک کر کے برتن صاحب تک پہنچائے، اور پھر شام کو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی عورت سے ضرور بات کرے گا، آخر ایسی بزدلی بھی کیا —— وہ یہ فیصلہ کر کے سڑک پر آیا تو اسے ایک طرف بنگلے والی نوکرانی دکھائی دی۔ وہ اس کے پاس آئی، وہ اسی طرح رو رہی تھی، اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، ہونٹ نیلے ہو رہے تھے، اور ہونٹوں کے گوشوں میں تھرتھری تھی، اس نے فضلو کی طرف دیکھے بغیر رکتے رکتے کہا "آؤں گی۔"

فضلو کا اچھلنے کو جی چاہا، سرگوشی میں بولا "تو پھر عشا کی نماز کے بعد بیگموں کے جسم

داب کر وہاں اس کہو کے تلے آجانا۔ آجاؤ گی نا؟"

"آؤں گی"۔ وہ بولی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرے جا رہے تھے۔

عشا کی نماز کے بعد وہ بیچ بیچ کہو تلے آ گئی۔ وہ اس وقت بھی رو رہی تھی، اور جب وہ اسے صاحب کے کمرے میں چھوڑ کر برآمدے میں آیا اور پلٹ کر دیکھا تو وہ تب بھی رو رہی تھی۔

منہ اندھیرے اس کی آنکھ کھلی، وہ رئیس خانے میں گیا، یوسف لالٹین جلائے سو رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں دیا جل رہا تھا اور وہ بستر پر مزے سے سو رہی تھی۔ فضلو مسکرایا۔ اس نے عورت کے پاؤں کا انگوٹھا آہستہ آہستہ ہلایا، وہ جاگ اٹھی۔ پہلے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پھر ایک سکون بھری انگڑائی لی اور مسکرا کر بولی: "میں تو ایسی ڈر رہی تھی، ایسی ڈر رہی تھی ——— خواہ مخواہ ڈرتی رہی۔ اس نے تو مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس دیکھتا رہا، اور دیکھنے میں کیا پڑا ہے۔"

مسکراتے ہوئے اس نے چادر اوڑھی، مسکراتے ہوئے اس نے سو کا نوٹ لیا، مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی اور فضلو کو محسوس ہوا جیسے اس نے تین سو روپے چولہے میں جھونک دیئے ہیں، تین سو روپے ——— پندرہ بیسیاں! ——— جن سے وادی میں ایک کچا گھروندہ بن سکتا ہے اور اگر تین سو اور مل جائیں تو ہل، او ربیل خریدے جا سکتے ہیں یا دال گڑ کی ایک دکان کھل سکتی ہے ——— اور پھر وہ کچھ کہتا تو ہے ہی نہیں کسی سے، بس دیکھتا ہے، جانے کیا دیکھتا ہے، اپنی مریم کی صورت دیکھتا ہے یا اللہ کی قدرت دیکھتا ہے، بس صرف دیکھتا ہی ہے نا۔ کچھ چھین تو نہیں لیتا، کوئی خرابی تو نہیں کرتا۔

وہ دوسرے کمرے میں آ گیا، صاحب سو رہا تھا۔ وہ اسے کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اپنی کوٹھری کی طرف آہستہ آہستہ آیا، اور جب دروازہ کھولا تو سامنے مریاں کھڑی تھی ——— وہ تیورا کر پیچھے ہٹا، اسے بڑے زور کا چکر آ گیا، جسم کا سارا خون سر میں جمع ہو کر کھولنے لگا۔

"کہاں گئے تھے؟" مریاں نے تلخی سے پوچھا۔

"صاحب کے پاس" اس کے دماغ میں قسم قسم کے بہانوں نے اُدھم مچا دی۔

"اس وقت کیوں گئے تھے؟" اس نے اسی تلخی سے پوچھا۔

"اس کے سر میں درد تھا" ایک بہانہ اس کی زبان پہ آگیا۔

"کیا روز اسی وقت اس کے سر میں درد ہوتا ہے؟" مریاں نے سختی سے کہا "تم آج تین چار دنوں سے جا رہے ہو۔"

فضلو نے دروازے کا سہارا لے لیا۔ اسے ایک اور بڑے زور کا چکر آگیا تھا۔ گھبراہٹ پر بڑی مشکل سے قابو پاتے ہوئے بولا: "ہاں کچھ ایسا ہی درد ہے، اسی وقت ہوتا ہے۔"

"اور یہ رئیس خانے میں سے ابھی ابھی نکل کر کون گیا ہے؟" — مریاں کے لہجے میں چھریاں تھیں "تم کہو گے یہ صاحب کے سر کا درد تھا۔"

فضلو نے محسوس کیا جیسے اس کا دل پسلیوں کو توڑ کر باہر گر پڑے گا اور اس کا بھیجا تالو کو پھاڑ کر اوپر اُڑ جائے گا، لیکن اس نے ایک دم بڑے زور کا کھسیانا قہقہہ لگایا اور بولا: "چلو تمہیں ساری بات بتا ہی دوں، تم سے کیا پردہ، بالکل ذرا سی بات ہے، کوئی ایسی ویسی بات نہیں، راستہ دو۔"

وہ اندر کھاٹ پر بیٹھ گیا، شیرو سو رہا تھا۔ چراغ کی لو بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی اور کھڑکی کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ مریاں اپنی کھاٹ پہ بیٹھنے لگی تو فضلو نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس گھسیٹ لیا۔ "ادھر میرے پاس بیٹھو، تین دن سے سور کی بچی نے ایک چُمی تک نہیں دی۔"

"حرامزادے گالی بکتا ہے۔" وہ بولی، "اب بتا کیا بھید ہے راتوں کو اُٹھ اُٹھ کے جانے میں تم سمجھتے ہو میں سوتی رہتی ہوں، آج بھی تمہیں باہر جاتا دیکھا تو کہا لاؤ ذرا دیکھوں تو یہ جاتا کہاں ہے، اور جو دیکھا تو ایک عورت اندر سے نکلی اور سڑک کی طرف چلی گئی، شور مچا دیتی پر تمہاری بدنامی کا ڈر تھا، صاحب نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں؟ کیا ہم کنجر ہیں؟ — اور تمہارا کیا ہاتھ ہے اس میں؟"

"تم نہیں جانتیں۔" وہ بولا۔ اندر سے گھبرا رہا تھا، اس کی نسیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھیں ویران ہو رہی تھیں، اس کی کنپٹیوں کی رگیں صاف تڑپتی ہوئی نظر آ رہی تھیں، مگر جھوٹ موٹ کے اطمینان سے اس نے اپنی آواز ضرور سنبھالے رکھی۔ اس نے اپنا ایک بازو مریاں کی پیٹھ پر پھیلا کر اس کا شانہ پکڑ لیا اور بولا "یہ صاحب تو مجھے بڑا اللہ والا معلوم ہوتا ہے مریاں، یہ تو کوئی پہنچا ہوا بزرگ ہے، سوچو تو، ایک جوان عورت اس کے سامنے رات بھر بیٹھی رہتی ہے، وہ جو چاہے اس سے سلوک کرے، پر وہ ہے کہ بیٹھا دیکھ رہا ہے، عورت کو چھوتا تک نہیں، صرف دیکھ رہا ہے، اور صبح سے پہلے ایک سو روپے دے کر اسے چلتا کرتا ہے، سن رہی ہو؟ — ایک سو روپیہ — پانچ بیسیاں — اور وہ صرف دیکھتا ہے۔"

فضلو نے محسوس کیا کہ مریاں کا سارا خون اس کے چہرے پر جمع ہو رہا ہے۔

"سن رہی ہو مریاں؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

"اور یہ عورتیں لاتا کون ہے؟" مریاں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

فضلو نے ہیر پھیر کی کوشش کی۔ "بھئی اس میں بری بات ہی کون سی ہے! اب تم کتنی بار چشمے سے پانی لینے گئی ہو، کتنوں نے تمہیں دیکھا ہے، تو کیا میں سب کی آنکھیں نکال لوں؟ دیکھنے میں کیا رکھا ہے اور صاحب عورتوں کو صرف دیکھتا ہے —" اس نے تیس روپے نکال کر مریاں کی گود میں رکھ دیے۔

مریاں نے نوٹوں کو نفرت سے نیچے گراتے ہوئے کہا: "پر لاتا کون ہے عورتیں؟"

"بھئی کوئی بھی لائے، وہ کچھ کہتا تو ہے نہیں۔ تکتا ہے اور سو روپے نکال دیتا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ آہستہ سے بولا "میں ہی لاتا ہوں۔"

مریاں نے فضلو کا ہاتھ اپنے شانے پر سے جھٹک دیا اور ایک دم رونے لگی، فضلو مریاں سے لپٹ گیا، اس کی پیٹھ اور گردن اور بالوں کو چوما، اور بولتا چلا گیا: "مجھے خدا کی قسم مریاں۔ قرآن کی قسم — مریاں مجھے تمہاری قسم، آج تک تین عورتیں لایا ہوں اور تینوں پاک صاف واپس گئی ہیں، ایک

بھشتو ہے، ایک سرائے والی بھٹیارن ہے۔ ایک ادھر ایک دکھنی بنگلے کی نوکرانی ہے تینوں تین سو روپے لے گئیں اور وہ انھیں دیکھتا رہا بس دیکھتا رہا، سُن رہی ہو؟ اس نے انھیں چھوا بھی ہو تو شیرو مرے، میں مروں، تم مرجاؤ۔"

مریاں نے آنسو پونچھے اور بولی "پتہ ہے تو کس کا بیٹا ہے؟"

فضلو ہنسا۔ "تو کون کہتا ہے کہ میں اچھی بات کر رہا ہوں، اور یہ بھی کون کہتا ہے کہ میں کوئی بُری بات کر رہا ہوں۔"

"بُری بات تو ہے ہی" مریاں نے کہا، مگر اب اس کا لہجہ اتنا سخت نہ تھا۔

"کیسے بُری ہے۔" اس نے مریاں کو اپنی طرف کھینچ کر مجبور کر دیا کہ وہ اس کے سینے کا سہارا لے کر بیٹھے اور وہ بیٹھ گئی۔ ایک عورت کو سامنے بٹھا کر کچھ دیر دیکھتا ہے اور اسے سو روپے دے کر اپنے کمرے میں آکر سو رہتا ہے۔ بتاؤ اس میں کون سی بُری بات ہے؟"

مریاں خاموش رہی۔

"میں تو کہتا ہوں کہ بھشتو کی جگہ پہلے دن سے تمھی کو وہاں بٹھا دیتا تو کچھ ایسی خراب بات نہ تھی۔"

مریاں اس کی گرفت سے چھوٹ کر وحشت سے قدم اٹھاتی شیرو کے پاس گئی۔ اس کے منہ پر سے کھیس نوچ لیا اور بولی: "اسے دیکھ رہے ہو؟"

شیرو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور رونے لگا، فضلو نے لپک کر اسے لٹایا، تھپکا اور پھر مریاں سے پوچھا۔ "مجھے تم نے ایسا ہی کمینہ سمجھ لیا ہے؟ میرے چھ سال تمھارے سامنے ہیں، میں اپنی مریاں کو کسی دوسرے کے حوالے کروں گا؟ چوٹی پر سے نیچے چٹانوں پر نہ کود جاؤں گا اس کے بدلے! سؤر کی بچی۔ یقین ہی نہیں کرتی ہفتے میں روز ایک سو روپیہ مل رہا ہو تو ہمارا بگڑے گا کچھ نہیں اور بنے گا بہت کچھ۔ اور ابھی ساون کے دس بارہ دن باقی ہیں، ہم آسانی سے ایک ہزار کما کر نیچے وادی میں جا سکتے ہیں۔ اور عزت سے جی سکتے ہیں، وہ تمھیں صرف دیکھے گا، تم اسے دیکھتی رہنا، قصہ ختم۔"

لیکن مریاں پر تو ایک ہی وحشت سوار تھی، وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی، پھر زور زور سے پاؤں پٹخنے لگی "بے شرم، بے حیا" وہ چیختی رہی، اور دروازے میں بہت سی چھریاں اُگ آئیں۔ باہر درختوں پر چڑیاں اور کوے بولنے لگے تھے اور بادل کہیں بہت دور گرج رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور کہتی رہی "بیٹھے بیٹھے کنجر پنے پر اتر آیا کمینہ کہیں کا۔ حرام زادہ۔ شرم نہیں آتی، جوتوں سمیت گھسا آرہا ہے آنکھوں میں۔ آگ جلاتا ہے اور اوپر سے تیل گراتا ہے اور کہتا ہے کہ آگ بجھ رہی ہے۔ کہتا ہے یہ آگ نہیں جل رہی، یہ تو چاند چمک رہا ہے، اور مجھ سے کہہ رہا ہے اس کے پاس رات بھر رہنے کو ــــ مجھ سے ا ــــ" وہ سینہ کوٹ کوٹ کر زور زور سے رونے لگی۔

فضلو شیرو کی کھاٹ سے اُٹھ کر اُس کے پاس بیٹھ گیا، اس سے لپٹ جانا چاہا مگر وہ چھوٹ کر پرے جا گری، فضلو نے اُٹھ کر اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، مریاں نے اس کی طرف امید سے دیکھا۔

وہ بولا "ارے وہ کچھ بھی نہیں کہتا"

مریاں پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فضلو بولتا رہا: "سور کی بچی، تمہاری قسم کھا کر کہہ چکا ہوں کہ وہ تو چھوتا تک نہیں، بس دیکھتا ہے اور سو روپے دے کر سو رہتا ہے۔ تو مانتی ہی نہیں"

اچانک مریاں تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی: "اگر تم ایسے ہی بے غیرت ہو گئے ہو تو ایک شرط ہے"

"بتاؤ" فضلو بھی کھڑا ہو گیا۔

"میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ اس پر قائم رہو گے"

"پہلے شرط بتاؤ" اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"میں رات صاحب کے پاس جاؤں گی۔ اگر اس نے مجھے چھو لیا تو پھر میں تمہاری نہیں رہوں گی، پھر میں جہاں چاہوں گی چلی جاؤں گی" اُس کی آواز میں کوئی اتار چڑھاؤ نہ تھا۔

فضلو نے بغیر کسی جھجک کے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مان لی شرط، پگلی تو سمجھتی ہے کہ

تینوں کی تینوں جھوٹ بولتی ہیں، تو سمجھتی ہے میں ایسا ہی ذلیل ہو گیا ہوں؟"

"خدا کی قسم بھی کھاؤ۔" مریاں نے کہا۔

"خدا کی قسم بھی کھاتا ہوں۔" وہ ہنس کر بولا "ارے وہ تو صرف دیکھتا ہے ——— اچھا میری بھی ایک شرط ہے۔"

"کہو۔"

"اگر وہ تمہیں چھوئے تک نہیں تو جب تک وہ یہاں ہے تم اُس کے پاس جاتی رہو گی۔"

مریاں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "قبول ہے۔"

وہ باہر جا کر چائے کا سامان کرنے لگی۔

"اور اس نے تمہیں دیکھا تک نہیں مریاں۔" اس نے باہر جا کر کہا "اسے تو یہ بھی پتہ نہیں چلے گا کہ تم کون ہو۔"

وہ خاموش رہی، وہ دن بھر خاموش رہی، اور جب شام کا کھانا بھی ہو چکا اور رشیدہ سو گیا تو وہ پہلی بار بولی "لے چلو۔"

اس کی آواز میں اتنے بہت سے کانٹے تھے جو فضلو کے کانوں کے پردوں میں ٹھنس گئے، مگر وہ اٹھا اور کوٹھری سے باہر آ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ پھر جب وہ صحن میں پہنچے تو مریاں نے کہا "فضلو۔"

فضلو رُک گیا "ہاں۔"

وہ بولی "شرط یاد ہے نا؟"

"یاد ہے" فضلو بولا "بے فکر رہو۔"

اور جب وہ مریاں کو صاحب کے کمرے میں چھوڑ کر اور ایک سو دس روپے لے کر باہر صحن میں آیا تو پلٹ کر دیکھا، کھڑکی اور دروازہ دونوں بند ہو چکے تھے۔ یہ روز ہی تو بند ہو جاتے تھے اس وقت ——— ! وہ کوٹھری میں آیا وہاں جیسے بھوت کونوں میں دبکے بیٹھے تھے اور چراغ کی لو میں ایک

چڑیل ناچ رہی تھی، وہ شیرو کی کھاٹ پر بیٹھ گیا، پھر اسی کے پاس لیٹ گیا، شیرو کچی نیند میں تھا، بولا: "کیا ہے؟ کون ہے؟"

"میں ہوں۔" فضلو نے پیار سے کہا "آج میں اپنے بیٹے کے پاس سوؤں گا۔"

شیرو مارے خوشی کے اس سے لپٹ گیا اور پھر اپنی گرفت کو ڈھیلا کر کے سو گیا۔ فضلو دیر تک اسی طرح اکڑا پڑا رہا، اور جب کمر دکھنے لگی تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کتنی دیر تک وہ ٹہلا کیا، پھر چراغ بجھا کر سونے کی کوشش کی، مگر بھڑک کر اٹھا، چراغ جلایا اور اسے مریاں کی کھاٹ کے پائے پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ وہ اس کی لَو کو دیر تک دیکھتا رہا۔ باہر شاید بادل کھل گئے تھے، کیونکہ سفید چاندنی نے جھریوں میں جان ڈال دی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آیا، مگر رئیس خانے کی طرف نظر اٹھتے ہی وہ بھاگ کر اندر آ گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ اس سے کچھ یوں لگ کر کھڑا ہو گیا جیسے اب وہ دنیا کی کسی طاقت کو اپنی کوٹھری میں نہیں گھسنے دے گا۔ وہ دیر تک اسی طرح کھڑا رہا حتیٰ کہ پہلے مرغے نے کہیں دور بانگ دی۔ اس کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو گئی کہ اس کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا، وہ کھاٹ پر لیٹ گیا، پھر بیٹھ گیا پھر کھڑا ہو گیا۔ اور دھم سے دروازہ کھول کر رئیس خانے کی طرف بھاگا۔

ایک موٹر رئیس خانے کے پہلو سے نکل کر سڑک پر آ گئی اور ناگن کی طرح تیزی سے نیچے وادی کی طرف تیر گئی۔ فضلو پاگلوں کی طرح سرپٹ بھاگا۔ رئیس خانے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے کو گھونسوں سے کوٹ ڈالا۔ "مریاں" وہ چلایا۔ اور مریاں کے نام کے حروف بہت سی نیچی اونچی چیخیں بن کر پہاڑوں میں بجنے لگے۔ دور موڑ کاٹتی ہوئی موٹر کی روشنی اس کے فق چہرے پر سے گزرتی ہوئی غائب ہو گئی۔ اس نے موٹر کا پیچھا کرنے کے لیے نیچے گھاٹیوں کی طرف کود جانے کی سوچی، اور پھر آہستہ سے دروازہ کھلا، لالٹین کی روشنی باہر برآمدے میں سے گزرتی ہوئی صحن کے ایک حصے تک بہتی چلی گئی، دروازہ مریاں نے کھولا تھا۔

"آپہنچے؟" مریاں نے کہا۔ "تم شرط ہار گئے ہو حرامزادے۔" اس کی آواز بھرا گئی ــــــ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "کمینے، ذلیل، وہ مجھے لوٹ لے گیا، اس نے مجھے بھنبھوڑ ڈالا، رات بھر وہ مجھ سے چمٹا رہا، اس نے مجھے نوچا، کھسوٹا، اس نے میرے گال چاٹ ڈالے، اس نے ــــ"

مگر فضلو وہاں نہ تھا، وہ سر جھکائے کوٹھری کی طرف جا رہا تھا۔ ایک بدلی نے چاند کو چھپا لیا تھا، ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تھی، اور شیرو رونے لگا تھا۔ مریاں اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ اور روتی اور بلکتی ہوئی بھرائی ہوئی آواز میں بولتی چلی گئی "تم نے کہا تھا کہ وہ مجھے چھوئے گا ہی نہیں، اور اُس نے تو مجھے کاٹ کاٹ لیا ہے۔ وہ تو پچھلے ساون میں بھی میرے ہی لیے یہاں رُکا رہا۔ اس نے تو پہلے ہی دن یہاں صحن میں مجھے دوربین سے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو اب کے بھی میرے ہی لیے آیا تھا، سُن رہے ہو؟ سُن رہے ہو حرامزادے؟ بھاگے کہاں جا رہے ہو؟"

فضلو اب نہایت تیز تیز چل رہا تھا، اور مریاں اس کے پیچھے بھاگنے لگی تھی، وہ بولتی گئی۔ تم شرط ہار گئے، لیکن وہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو، کہیں سے عزت، آبرو بکاؤ ملے تو چٹکی بھر خرید کر رکھ لینا، کیونکہ آج سے تم پرلے درجے کے بدذات، کمینے اور کنجر ہو گئے ہو، سمجھے؟ اور اب میں جا رہی ہوں، میں جہاں کہیں بھی جا رہی ہوں تمہیں اس سے کوئی واسطہ نہیں، میں اب کسی کی نہیں رہی۔ تم نے میرا غرور توڑ دیا ہے، تم نے میرا سب کچھ لٹوا دیا ہے حرامزادے۔"

فضلو اپنی کوٹھری کی دیوار سے ٹکرا گیا، تیورایا، اور پھر دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر دروازے کی طرف رینگا۔ اندر شیرو زور زور سے رو رہا تھا، اور مریاں چیخے جا رہی تھی ــــــ

"وہ دو مہینے اس ایک گھڑی کے لیے سکیسر پہ پڑا رہا، اور وہ "مریم، مریم" کی رٹ لگانے اور رونے کے بعد مجھ پر یوں جھپٹا جیسے کتا کچے گوشت پر جھپٹتا ہے، کرائے کی موٹر کا اس نے رات ہی انتظام کر لیا تھا، اور وہ ابھی ابھی مجھے آخری بار بھنبھوڑ کر موٹر میں بیٹھ کر لاہور چلا گیا ہے، اور تمہیں بخشش دے گیا ہے سو روپے کی، اور ایک ایسی مریاں کی جو اب اس کوٹھری میں نہیں گھسے گی۔ وہ نیچے وادی میں اُتر جائے گی۔ وہ ادھر میدانوں میں چلی جائے گی، اور جب بھوک

کے مارے اس کا پیٹ زخم بن جائے گا تو کپڑے اُتار کر راستے میں بیٹھ جائے گی ننگے مردوں کو لوگ پتھر مارتے ہیں پر ننگی عورتوں کو بستر دیتے ہیں اور روٹی کھلاتے ہیں۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔"

آس پاس کے بنگلوں میں کتے مریاں کی چیخیں سُن کر بھونکنے لگے تھے اور سکیسر کی پہاڑیاں جھیل کی طرف اُترتی ہوئی موٹر کی بھنبھناہٹ کو دُہرائے جا رہی تھیں اور مریاں کی واویلا کو دُہرائے جا رہی تھیں اور کتوں کی آوازوں کو دُہرائے جا رہی تھیں۔

پھر ایک دم جیسے مریاں پر وحشت سوار ہو گئی۔ لپک کر اس نے لڑکھڑاتے ہوئے فضلو کے منہ پر زور کا طمانچہ مارا۔ فضلو سر اور گھٹنوں کے بل دھب سے گیلی زمین پر گرا اور بے حس و حرکت ہو گیا۔

وہ پلٹی اور کوٹھری کی پچھلی طرف پرانے کھُو کے نیچے سے گزرتی ہوئی سڑک پر آ گئی سر پہ ہاتھ رکھے وہ روئے جا رہی تھی اور نیچے وادی کی طرف بھاگی جا رہی تھی، اور چاند بدلی کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔

ایک موڑ پر جا کر وہ تھم گئی، شیرو کی چیخیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔"اس دوسرے حرامزادے کو ایک آخری بار دیکھ لوں"۔ اس نے فیصلہ کیا اور واپس رئیس خانے کی طرف بھاگی۔

فضلو اسی طرح دروازے کے پاس سر اور گھٹنوں کے بل بے حس و حرکت اوندھا پڑا تھا اور شیرو کا گلا چیختے چیختے بیٹھ گیا تھا۔ مریاں نے دروازہ کھول کر اندر جانا چاہا مگر پھر جیسے بجلی کی سی تیزی سے فضلو کے پاس آ گئی۔ ایک لمحہ بت کی طرح جمی رہی، پھر جھک کر اسے بٹھانا چاہا تو وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ کیچڑ اور لہو نے اس کے چہرے کو نہایت خوفناک بنا دیا تھا، اور اوپر بدلیوں میں دوڑتے ہوئے چاند نے اس گھناؤنے پن کو چمکا دیا تھا۔

"میرا فضلو" اس نے فریاد کی۔

پھر اندر کوٹھری میں جا کر چراغ اٹھایا۔ شیرو بھاگ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ وہ چراغ اٹھائے باہر آئی تو شیرو بھی اس کا پلو تھامے باہر چلا آیا۔ وہ چراغ کو فضلو کے چہرے کے قریب لا کر اور اس کے پپوٹے اٹھا کر اس کی پتلیوں میں زندگی کے آثار ڈھونڈنے لگی۔

"میرا فضلو! میرا مالک، میرا سائیں!" اس کے بین چار طرف گونج اٹھے اور پھر ایکا ایکی تھم گئے۔ فضلو کی آنکھیں ذرا سی کھلیں، اس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا، مٹھی کھلی اور اس نے مٹھی میں دبے ہوئے سو روپے کے نوٹ کو چراغ کی لو سے جلاتے ہوئے کہا: "میں تمہیں نہیں جانے دوں گا، تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔"

شیرو اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ تھامے اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے میری غریبی دھوکا دے گئی مریاں۔" فضلو نے رکتے رکتے کہا۔

نوٹ کی راکھ سکڑ کر گری اور رئیس خانے کی طرف اڑ گئی۔

"مریاں۔" فضلو نے التجا کی۔

"تم مر گئے تو نہیں؟" مریاں نے سسکیوں میں پوچھا۔

"نہیں۔" فضلو نے بڑے یقین سے کہا۔

"حرامزادے۔" وہ بلک بلک کر روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"سؤر کی بچی۔" وہ اس کے بالوں کو خون آلود ہونٹوں سے چومنے لگا۔

موٹر نیچے جھیل کے کنارے کنارے تیرتی جا رہی تھی۔

آتشِ گُل

اس قدر چونکا دینے والا زرد رنگ میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرا جائے تو تتلیوں کے پروں کی طرح سونے کے سے ذرے چھٹ کر انگلیوں میں چلے آئیں گے۔ اسے دیکھتے ہی بے اختیار جی چاہتا تھا کہ اس کے چہرے کو مس کرنا چاہیئے، سہلانا چاہیئے، نچوڑ لینا چاہیئے۔ نہ جانے یہ اس کی قطعی غیر قدرتی یا آسیبی زردی کا اثر تھا یا اس کی سر راہ لٹ کر رہ جانے والی جوانی کا تقاضا، لیکن مجھے صرف اتنا اعتراف کرنا ہے کہ اس کی رنگت کی زردی میں بجلی کی لہروں کا سا اثر تھا۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اس کی طرف کھچا چلا جا رہا ہوں اور پھر ایک دم ذہن کو سن کر دینے والا جھٹکا محسوس ہوتا تھا اور میں دبی زبان سے صرف اتنا ہی کہہ پاتا تھا "اور کیا لکھنا ہے؟"

وہ صرف مجھی سے خط لکھواتی تھی۔ میں ان دنوں بیمار اور بے روزگار ہو کر گاؤں چلا گیا تھا۔ وہاں ڈی ایچ۔ لارنس اور آسکر وائیلڈ کی کتابوں سے دل بہلاتا تھا اور جب ان کی گدگداتی ہوئی لذتیت میرے اعصاب کو جھنجھنا دیتی تھی تو اقبال کے لیکچر میری دستگیری کے لیے تیار رہتے تھے۔ اقبال مجھے فلسفے کی شاہراہوں پر سے ماضی میں لے جاتا تھا۔ اور ماضی مجھے خلفائے عباسیہ کے درباروں میں گھسیٹ لے جاتا تھا، اور پھر ایک دم دفیں بجتی تھیں اور ناچنے والیوں کا ایک انبوہ کہیں سے امڈ پڑتا تھا۔ پھر اچانک مجھے ان ناچنے والیوں میں آسکر وائیلڈ کی سلومی دکھائی دے جاتی تھی اور عنبر و لوبان کی لہریں میرے

حو اس میں گھس کر سرگوشیاں کرنے لگتی تھیں "تم مجھے بوسہ نہیں لیتے تھے نا؟ —— نہیں لینے دیتے تھے نا؟" اور پھر میں سلومی پڑھنے لگتا تھا۔

میں سلومی ہی کو پڑھ رہا تھا جب وہ دبے پاؤں میرے قریب آئی، اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے سلومی کتاب کے صفحوں میں سے نکل کر میرے سامنے آگئی ہے۔ ایک لمحے کے لیے میں اسے گھورتا رہ گیا۔ وہ سمجھی کہ میں اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید اسی لیے وہ بولی "میں گلابو ہوں —— گلابو دھوبن!"

میں گلابو دھوبن کو جانتا تھا لیکن گلابو دھوبن کے چہرے کی زردی میرے لیے اجنبی تھی۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ لیکن عام چیزوں کے ہجوم میں بھی ایک نہ ایک چیز میں کوئی خصوصیت ایسی ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم اسے چن لیتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ یہ چیز ان سب چیزوں سے اچھی ہے۔ کیوں اچھی ہے؟ اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہوتا اور اسی لیے میرے پاس بھی اس سوال کا کوئی جواب نہیں کہ جب گلابو ایک عام سی لڑکی تھی تو ایک زمانے میں وہ گاؤں کے سب نوجوانوں کی گفتگو کا موضوع کیوں بن گئی تھی۔ میں نے ایک بار اس کے ہونے والے منگیتر ممنو سے یہی سوال پوچھا تو وہ دم بخود سا رہ گیا تھا چند لمحوں کے بعد وہ مسکرا دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی چمک آگئی تھی جیسے اس کی پتلیوں کے ادھر اچانک چراغ جل اٹھے ہیں اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا "جس دن مجھے یہ پتا چل گیا، اس دن میرے لیے گلابو مر جائے گی۔ مزا تو اسی میں ہے کہ کچھ خبر تک نہ ہو اور لٹ جاؤ۔"

اور اب بھی گلابو سرسوں کے پھولوں کا سا زرد چہرہ لیے میرے سامنے کھڑی تھی اور مجھ سے اپنا تعارف کرا رہی تھی، اور باہر صحن میں سے امی کی آواز آرہی تھی "اسے جلدی سے خط لکھ دو بیٹا، بے چاری بڑی دکھی ہے، میں تو جب بھی اسے دیکھتی ہوں تو کلیجہ دھک سے رہ جاتا ہے، لکھ دو بیٹا جلدی سے۔"

"خط لکھوانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں، درخواست لکھوانی ہے، کمانڈنگ افسر کے نام —— پنشن کا جھگڑا ہے۔" —— وہ پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گئی، اور پھر بکل کے اندر سے ایک مڑا تڑا کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "اس چٹھی کا جواب لکھنا ہے۔"

اس چھٹی کو پڑھ کر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ رمضو مر چکا ہے۔ وہ ۱۹۴۲ء میں بھرتی ہو کر کلکتے گیا تھا اور پھر برما میں سپاہی ہوتے وقت مارا گیا تھا۔ بعد میں مجھے اس کے ایک ساتھی نے بتایا کہ جب برما کے جنگلوں میں سے گزرتے ہوئے ایک دم گنجان جھنڈوں میں سے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی تو وہ سب دھب سے زمین پر لیٹ گئے، اور جب وہ درختوں کے تنوں کی آڑ لینے کے لیے رینگ رینگ کر بڑھنے لگے تو رمضو ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اسی طرح منہ کے بل زمین سے چمٹا رہ گیا۔ اور جب اس کے ساتھی نے رمضو کے پاس جا کر اسے پکارا اور اس کا سر اُٹھایا تو وہ مر چکا تھا، اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی اور لہو کے چند قطرے اس کی ناک سے پھوٹ کر اس کی مونچھوں کی جڑوں میں جمع ہو رہے تھے —— "پھر؟" میں نے رمضو کے ساتھی سے پوچھا، اور اس نے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میرا سوال قطعی احمقانہ ہے۔ "پھر کیا! پھر ہم وہاں سے چلے آئے۔"

ٹھیک ہے، میرا سوال واقعی احمقانہ تھا۔ اس کے بعد سب وہاں سے چلے آتے ہیں۔ سرکاری رجسٹروں میں دو لفظوں کا اندراج ہوتا ہے، پنشن کے جھگڑے چلتے ہیں، مرحوم سپاہی کی قیمت چکائی جاتی ہے، اس کے والدین اور اس کی بیوی بچوں کے درمیان دس یا پندرہ یا بیس روپوں کی ننھی سی دیوار ایک فصیل بن کر ابھر آتی ہے اور ان فصیلوں کے رخنوں میں سے کوئی پیار سے نہیں جھانکتا۔ یہاں سے ایک دوسرے کی طرف صرف گالیاں منتقل کی جاتی رہتی ہیں، اور ماں باپ کے ہاتھوں میں رعشہ آجاتا ہے

اور بیواؤں کے چہروں پر سرسوں پھولتی ہے۔

میں نے زرد رُو گلابو کی طرف دیکھا۔ میں افسوس کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔ جب اس نے بغل میں سے ایک صاف ستھرا کاغذ نکالا اور بولی "درخواست کے لیے یہ میں ایک کاغذ بھی لیتی آئی ہوں، انگریزی میں اتنا لکھ دیجیے کہ حضور! یہ میں مانتی ہوں کہ رمضان کی پنشن پر اس کے باپ کا حق ہے، اس لیے کہ وہ بوڑھا ہے، پر اس کی بیوی کا بھی تو حق ہے، اس لیے کہ وہ جوان ہے، اور اس کے تین بچے ہیں اور غلہ مہنگا ہے اور کپڑا ملتا ہی نہیں اور جب عورت کے پاس نہ شوہر باقی رہے نہ روپیہ تو ___ تو ___ بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے، آپ ذرا کوئی اچھی سی بات بنا کر ڈھنگ سے لکھیں گے۔ میری تو بکواس کی عادت ہو گئی ہے!"

بات بنی بنائی تھی۔ میں نے گلابو کی پنجابی کو انگریزی میں منتقل کر دیا۔ وہ درخواست لے کر چلی گئی اور پھر بسلومی نے کتاب کے صفحوں میں اُٹھ کر کہا "اچھا تو تم مجھے بوسہ نہیں دو گے؟ نہیں دو گے؟"

اسی روز شام سے پہلے میں کھیتوں میں ٹہلنے گیا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں اور شام سے پہلے ڈھلتی دھوپ اور لمبے لمبے سایوں کے اتصال سے ایک بڑی لطیف سی خنکی ہوا میں رچ جاتی تھی۔ اعصابی بیماری کے باوجود مجھ پر اس لذیذ خنکی کا یہ اثر ہوتا تھا کہ کبھی میں گنگناتا ہوا دور نکل جاتا، کبھی کسی ٹیلے پر چڑھ کر چھاتی پھیلا لیتا، لمبی لمبی سانسیں لیتا اور مجھ پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی جیسے رقص سے کچھ دیر پہلے رقاص کو محسوس ہوتی ہو گی۔ لیکن اس شام مجھے نہ گنگنانے کا خیال آیا نہ لطیف ہوا کی خنکی کو پھیپھڑوں میں جمع کرنے کا۔ میں کچھ سوچتا ہوا دور نکل گیا۔ "کچھ" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ بعد میں جب میں ان سوچوں سے چونکا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک رَو میں نہیں سوچ رہا تھا۔ ابتدا گلابو کے چہرے سے ہوئی تھی، پھر مجھے لاہور میں بسنت کا تہوار یاد آ گیا تھا، جب میرے ایک ہندو دوست نے انڈوں

کی زردی کا حلوہ کھلایا تھا۔ اس کے بعد جانے مجھے چین کیوں یاد آ گیا۔ بہر حال میں نے چین کے بارے میں بھی بہت کچھ سوچا تھا، قدیم چینی شہنشاہ اور پھر قبلائی خان کے دربار کی شان و شوکت اور اس کے مردہ جسم پر سجے ہوئے شاہی گھوڑوں کا ناچ ——— قبلائی خان کی روندی ہوئی لاش نے مجھے اپنا ایک دوست یاد دلایا جس نے ہڑتال اور سنکھیا پھانک کر خود کشی کر لی تھی اور اس کی محبوبہ جو تنور میں روٹیاں پکا کر گزر کرتی تھی، تیسرے ہی روز ایک تنور والے سے اپنی مرضی سے ایک سو میں بک گئی تھی اور اس نے کہا تھا "پگلے نے خواہ مخواہ مجھ بے چاری کو بدنام کر دیا، ورنہ میری ایسی صورت والے تو ایک ہزار میں بھی سستے ہیں!" ———

روپوں کی جھنکار سے مجھے رمضو کی پنشن یاد آ گئی اور پھر گلابو اور ——— پھر جب میں چونکا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ دور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں پر اونگھ رہی تھی، سرسوں کے پھولوں کی صاف ستھری صحت مند زردی میں چمک سی آ گئی تھی، اور آسمان کے وسط میں اڑتی ہوئی ایک پتلی سی بدلی کو ڈوبتے ہوئے سورج نے بسنتی دوپٹے میں بدل دیا تھا۔

اور یوں جب میں اپنی بے ربط اور غیر مسلسل سوچوں کا جائزہ لے رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے اور میرے ذہن میں زرد رنگ تیر رہا تھا تو اتفاق سے وہاں پگڈنڈی پر حافظ سے میری مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ گلابو کا بوڑھا خسر تھا۔ اندھا تھا اس لیے لوگ اسے حافظ کہنے لگے تھے۔ آنکھوں کا کام لاٹھی سے لیتا تھا۔ اس کی لاٹھی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھتی تھی اور پھر جھک کر پگڈنڈی کا صاف ستھرا سینہ ٹٹول لیتی تھی اور حافظ ایک دو قدم آگے بڑھا لیتا تھا۔ میں سیدھا پگڈنڈی پر آ رہا تھا اس لیے اب کے حافظ کی لاٹھی کا پھن اٹھا تو جھکا نہیں، بلکہ مجھے سونگھ کر خبردار ہو گیا اور حافظ رک گیا "کون ہے بھائی؟" اس نے پوچھا۔ اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو ایک دم اُس کے ہونٹ کانپنے لگے اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "مجھ سے تمہیں کیا دشمنی تھی بیٹا؟ میں تو تمہارے سارے خاندان کا

پرانا خادم ہوں میں تو برسوں تمہارے بزرگوں کی رکاب تھام کر کوسوں پیدل چلا ہوں اور اپنے مقسوم پر ناز کیا ہے۔ اور اب بیٹا تم میرے رمضو کی پنشن اس حرامزادی کے نام لگوانا چاہتے ہو جس نے تین بچے جنے ہیں تو دس نکلوائے ہیں، اور جس نے مسجد کا تیل چرا کر اپنے یاروں کے لیے پکوڑے تلے ہیں، اور جس روز میرے رمضو کی موت کا تار آیا ہے تو اسی روز اس نے کاجل لگایا ہے اور بین کرتے ہوئے سارے گاؤں کو بتایا ہے کہ میں سہاگن ہوں، میں سدا سہاگن ہوں ــــــ" بوڑھے حافظ نے یہ الفاظ عورتوں کی طرح بین کے انداز میں کہے اور پھر اس کے چہرے میں تناؤ سا پیدا ہو گیا "نہیں بیٹا تم اس کے لیے چٹھیاں نہ لکھا کرو، یہ پندرہ روپے رمضو کے ماں باپ کے لیے رہنے دو، رمضو کی گھر والی تو خود بڑی کماؤ ہے"۔

میں نے بوڑھے سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چلا آیا۔ لیکن اس کے بعد روزانہ بار بار میرا جی چاہا کہ حافظ اور گلابو کے ہاں جا کر سب کو جمع کروں اور رمضو کی پنشن کے سلسلے میں ان کی صلح کرا دوں۔ یونہی خواہ مخواہ اپنائیت کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ جیسے پندرہ روپے کے پیچھے یہ کشمکش خود میرے گھر میں ہو رہی ہے، اور ایک دن جب میں نے امی سے بھی اس کا ذکر کر دیا تو وہ باغ باغ ہو گئیں "جاؤ بیٹا، ابھی جاؤ۔ دس در دنیا ستر در آخرت جو ایک بھلا کرے گا اس کا سدا بھلا ہو گا۔ ان سے کہو آدھی آدھی پنشن بانٹ لیا کریں ـــ"، میرے سامنے اچانک رمضو کی لاش ابھری، ٹھک سے ایک تلوار گری اور رمضو دو ہو کے رہ گیا۔ اور پھر جیسے اس کے ایک حصے کو اس کے ماں باپ گھسیٹے لیے جا رہے تھے تو دوسرے حصے سے اس کی بیوی اور بچے چمٹے چلے گئے تھے اور اب میرے سامنے جمے ہوئے خون کے ایک دائرے کے سوا کچھ نہ تھا ــــ میں نے فوراً اس تصویر کو جھٹک دیا، اعصابی بیماریوں پر قابو پانے کے لیے میں کسی تصور، کسی خیال، کسی سوچ کو سختی سے جھٹک ڈالنے کا عادی ہو رہا تھا، مگر اس کے بعد ایک دم جیسے میں چکرا کر رہ گیا میرے

سامنے گلابو کھڑی تھی۔

گلابو سے کچھ کہے بغیر یکایک امی نے بڑے غصے اور رقت سے بولنا شروع کر دیا۔

"حافظ بکواس کرتا ہے۔ اس کی ساری عمر بکواس کرتے گزری ہے۔ اس نے کچہری میں جا کر قرآن شریف کی قسمیں کھائی ہیں اور جھوٹی گواہیاں دی ہیں، اور اب وہ گلابو کے خلاف بکتا ہے، بکنے دو، چاند کا تھوکا منہ پر آتا ہے۔ تم افسر کو ایک اور چٹھی لکھ دو۔ پورا زور لگا دو اپنے علم کا، اور کہو کہ رمضان کی پنشن کا کوئی حقدار ہے تو یہ گلابو ہے، اس کی بیوی۔ آ ڈ بیٹی بیٹھ جاؤ، خط لکھوانا ہے؟"

اور گلابو کے چہرے کی سرسوں کو جیسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی نے چمکا دیا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ حافظ کی بکواس سے بد دل ہو کر منہ لٹکا لیتی، مسکرانے لگی اور بولی "تو میرے آنے سے پہلے اس گھر میں میرا ہی ذکر ہو رہا تھا!" — جیسے ہم ماں بیٹے نے اس سے پہلے اس کا ذکر کر کے اسے ایک سنہری سند دے ڈالی تھی۔ امی نے تو خیر حسب عادت گلابو سے اظہار محبت شروع کر دیا، اس کی بے بسی اور بے کسی پر وہ قربان ہو ہو گئیں اور حافظ کی بکواس کی ساری تفصیلات گن گن کر ان کو رد کرتی رہیں، لیکن میں وہاں سے اپنے کمرے میں چلا آیا، اور ابھی ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ گلابو میرے کمرے میں آ گئی۔ پلنگ کے پائے سے لگ کر بیٹھ گئی اور بغل میں سے ایک لفافہ نکال کر بولی "یہ جواب آیا ہے، پڑھ دیجیے۔"

جواب یہ آیا تھا کہ چونکہ رمضو نے اپنی زندگی ہی میں تنخواہ اور پنشن کا حقدار اپنے باپ کو قرار دیا تھا اور سولجرز بورڈ نے بھی اسی کے نام کی سفارش کی ہے اس لیے پنشن اس کے باپ ہی کے نام جائے گی، گلابو اگر چاہے تو اپیل کر سکتی ہے۔

"تم چاہو تو اپیل کر سکتی ہو" میں نے بڑے دکھ سے کہا۔

"اپیل بھی کر لوں گی۔ میرا کیا لگتا ہے" گلابو نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور پھر مسکرا کر

کہنے لگی: "میرے آنے سے پہلے آپ میرا ہی ذکر کر رہے تھے؟"

"ہاں!" میں نے تعجب سے کہا۔ اور سوچا کہ کیا اس کا ذکر اس کی اپیل پر ترجیح رکھتا ہے

"حافظ تمہارے خلاف بہت بک رہا تھا۔"

میرے یہ الفاظ اس کی مسکراہٹ کو بجھانے کے لیے کافی تھے، مگر وہاں تو جیسے جلتی پر تیل پڑ گیا، مسکراہٹ ہنسی میں بدل گئی اور وہ بولی: "پندرہ روپے بڈھے کے دماغ میں اس زور سے بجے ہیں کہ میں تو کہتی ہوں کہ اگر اب اسے جیتا جاگتا رمضو مل جائے تو یتیم بند ہو جانے کے ڈر سے وہ اسے اپنے ہاتھ سے مار ڈالے گا، رہ گئے میرے بچے، سو بچے تو گلیوں میں رُلتے رُلتے بھی پل جاتے ہیں اور میرے بچوں کے سر پر تو ایک چھت بھی ہے" — اس نے اپنی مسکراہٹ سمیٹ لی اور پھر ایک صاف ستھرا کاغذ نکال کر بولی "اپیل لکھ ڈالیے اور آخر میں کہیے کہ خدا آپ کا بھی بھلا کرے اور میرا بھی، ملک پنجاب میں لوگ بھوک سے کم ہی مرتے ہیں، اور میں مر جاؤں گی، پر اپنے بچوں کو بھوکوں نہیں مرنے دوں گی، آپ نے تو یتیم بڈھے کے نام لگا کر اپنے سپاہی کے بچوں کو مارنا چاہا پر میں بھی تو انہیں مرنے دوں — اور میں انہیں نہیں مرنے دوں گی۔" — رُک کر اس نے گلا صاف کیا اور پھر ذرا بدلی ہوئی آواز میں بولی: "جی چاہتا ہے ایک موٹی سی گالی بھی لکھوا دوں" — اور پھر مسکرا کر کہنے لگی "انگریزی میں گالیاں ہوتی ہیں جی؟"

میں بھی مسکرا دیا — اور پلنگ کے پائے کا سہارا چھوڑ کر اس نے اپنا ایک بازو پلنگ پر پھیلا دیا اور اس پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر مسکرائے چلی گئی۔ ایک معقول اپیل لکھ کر میں نے اس کے حوالے کی۔ اس نے کاغذ کو تہہ کر کے اسے بغل میں رکھا اور پھر اسی طرح بازو پر ٹھوڑی رکھ کر بولی: "سارا گاؤں کہتا ہے آپ کے قلم میں بڑی طاقت ہے، سوچتی ہوں اگر آج رمضو زندہ ہوتا تو آپ سے ایک خط اس کے نام لکھواتی۔"

میں اداس ہو گیا اور وہ مسکراتی رہی۔ پھر ایک دم جیسے اسے کچھ یاد آ گیا، ہڑبڑا کر اُٹھی

اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک بیٹھا لارنس کی ایک کہانی پڑھتا رہا۔ مگر جب چند صفحے پڑھ لینے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اس دوران میں پڑھا کچھ نہیں بلکہ سوچا ہے اور وہ بھی گلابو کے بارے میں، تو میں سلومی کا ڈرامہ پڑھنے لگا۔ اور جب سلومی اپنے سوتیلے باپ اور سگی ماں کے سامنے ناچنے لگی تو مطالعہ ختم ہو گیا اور ناچ شروع ہو گیا اور جب میرے اعصاب تن کر تقریباً بج اُٹھے تو امی اندر آئیں، بولیں "پڑھ رہے ہو؟" میں نے کہا "امی! سوچ رہا ہوں کہ اگر میرے پاس ہر مہینے پندرہ روپے ہوتے تو میں انھیں حافظ کے سامنے بجا کر گلابو کو دے آتا۔ بڑا غصہ آ رہا ہے۔"

"پندرہ روپے ہوتے تو میں اپنے بچے کا نیا لحاف نہ بنوا لیتی؟" وہ کیل سے چنگیر اتارتے ہوئے بولیں، "ایسی باتیں نہیں سوچتے بیٹا۔ تمہارے پاس علم کی دولت ہے، وہ جتنی چاہے بانٹو اور روپے بانٹنے کی نہ سوچا کرو۔ کبھی بتاؤ آج کتنے دنوں سے میں نے تمہاری چائے کے ساتھ پراٹھا نہیں پکایا۔ بتاؤ!"

اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری شدید اعصابی بیماری پھر سے عود کر آئی ہے، اور ڈاکٹر کہتا تھا کہ یہ بیماری ذہنی ہوتی ہے۔ آج وہ ڈاکٹر میرے سامنے ہوتا تو میں اس سے کہتا "لاؤ میری دونوں جیبیں روپوں سے ٹھونس دو، پھر میں تم سے پوچھوں گا کہ یہ بیماری ذہنی ہے یا اقتصادی۔" میں فوراً اُٹھ کر باہر کھیتوں میں چلا گیا اور "کچھ" سوچتے ہوئے بہت دور نکل گیا۔

"کچھ" میں ابہام ہے اور میں اس کے لیے معافی چاہتا ہوں، لیکن جب سوچوں میں کوئی تسلسل نہ ہو تو کہا ہی کیا جائے۔ اتنا یاد ہے کہ میں روپے کے بارے میں اور پھر جنوبی افریقہ میں سونے کی کانوں کے متعلق اور اس کے بعد شاید ڈوبتے چاند کے بارے میں اور پھر سرسوں کے پھولوں کے متعلق سوچتا رہا۔ اس روز اختلاجِ قلب بھی بڑھ گیا اور

خون کا دباؤ اتنا شدید ہو گیا کہ معلوم ہوتا تھا کنپٹیوں میں سیسا بھر دیا گیا ہے۔ پھر جب میں واپس آیا تو یہ واپسی بھی میری سوچوں ہی ایک حصہ تھی اور جب میں گلابو کے گھر میں داخل ہوا تھا تو یہ بھی محض ایک سوچ ہی تھی۔ بعض سوچیں اس نوعیت کی بھی ہوتی ہیں کہ سوچ میں جسم بھی ذہن کا ساتھ دیتا ہے، جسم بھی سوچتا ہے اور جب جسم سوچتا ہے تو اس سوچ میں حرکت ہوتی ہے، یہ سوچ کا عمل ہوتا ہے، اور یہی سوچ مجھے گلابو کے گھر میں لے آئی۔ لیکن جب آنگن کے غیر مانوس ماحول اور بچوں کی چیخ پکار نے میرے ذہن اور جسم کو اس کیفیت سے چونکایا تو ٹھٹک کر رہ جانے کی بجائے میں تیورا کر پیچھے ہٹا جیسے کسی نے میری ٹھوڑی کے نیچے زناٹے کا مکا مارا ہے! اور میں بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ میں نے محاورہ نہیں استعمال کیا، میں وہاں سے سچ مچ بھاگ آیا، مگر بھاگ کر گھر نہیں گیا، کھیتوں میں نکل گیا، اس وقت سرسوں کے پھول اندھیرے میں ڈوب چکے تھے، البتہ اِدھر اُدھر چند جگنو یوں اڑتے پھر رہے تھے۔ جیسے سرسوں کے پھولوں کو پر لگ گئے ہیں۔

گھر واپس آ کر میں نے اکٹھی چار خواب آور گولیاں کھائیں اور رات بھر سلومی کے ہاتھوں پر سجے ہوئے سنہری طشت میں سلومی کے محبوب کا کٹا ہوا سر دیکھتا رہا جس کے نیم وا مردہ ہونٹوں پر بار بار سلومی کے جذبات اور وحشت سے ابھرے ہونٹ پیوست ہو جاتے تھے اور سلومی کہتی تھی ۔۔ ''اچھا تو تم مجھے بوسہ نہیں لینے دیتے تھے نا؟ —— نہیں لینے دیتے تھے نا؟''

شاید میں نیند میں سلومی کے الفاظ بھی بڑبڑاتا رہا، اس لیے کہ جب دوسرے دن کافی دن چڑھے امی نے مجھے جگایا تو ان کی چتون پر کچھ ایسے ہی بل تھے جیسے اُس روز اُبھرے تھے جب میرا اوولٹین ملا دودھ پی جانے پر میں نے بلّی کو ماں کی گالی دے دی تھی۔

نیم خوابی کی حالت میں چائے پی کر میں پھر سو گیا اور دن ڈھلے اُٹھا میرا سارا بدن

ٹوٹ رہا تھا۔ اور امی، جو باہر صحن میں بیٹھی تھیں، بولیں" نہ خدا کا نام نہ رسول کا۔ بس پڑا پلنگ توڑ رہا ہے، شام کو سویا ہے تو اب دوسری شام ہونے کو آئی ہے کہ آنکھ کھل سکی ہے، یہ تم بیمار ہو کہ کوئی نشہ پیتے ہو؟ــــــ" وہ اسی طرح بولے چلی گئیں اور میں حالات کو سنبھالنے کے لیے لپک کر ان کے پاس پہنچا، ان سے لپٹ گیا، ان کے ہاتھوں کو چوما، ان کے پاؤں دابے اور بڑی لجاجت سے کہا" نہیں امی، سچ پھر ایسا نہیں ہوگا۔ رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے نیند لانے والی گولیاں کھا لیں۔ یہ سب انھیں کا کیا دھرا ہے۔ اب تک آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔"

"اور یہ تم رات بھر کیا بکتے رہے؟" امی کی چتون کے بل اور گہرے ہو گئے۔

"خواب دیکھتا رہا" میں نے گھبرا کر کہا۔ "وہ میں ایک کتاب پڑھ رہا ہوں، اس میں ایک شہزادی ہے جو ــــــ"

"بس بس مجھے بخشو" وہ بولیں۔ "سوتے میں تھوڑے بکے ہو کہ اب پوری کہانی سنانے چلے ہو مجھے؟ ــــــ اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ اولاد کو علم پڑھاؤ ــــــ اور جو پڑھاؤ تو سوتے جاگتے شہزادیاں دکھی جا رہی ہیں اور اُن سے ــــــ ان سے بکواس کی جا رہی ہے۔"

بڑی مشکل سے امی کو منا کر میں تہیہ کر کے اٹھا کہ آسکر وائیلڈ کی کتاب تلف کر دوں گا۔ ادب اور فن اعصابی امراض میں اضافے کا موجب ہوتے ہیں، اور خاص طور سے آسکر وائیلڈ تو سراسر اعصاب ہے۔ میں اٹھا ہی تھا کہ حویلی کے دروازے میں سے گلابو داخل ہوئی اور میں نے سوچا کہ اس کتابی سلومی کو تلف کروں یا اس جیتی جاگتی سلومی کا گلا گھونٹ دوں جو میرے پاس چار منٹ بیٹھتی ہے تو مجھے چار خواب آور گولیوں کا محتاج کر جاتی ہے۔

امی کے پاس بیٹھ کر اس نے چادر کا پلو کھولا اور مسکرا کر بولی" ابھی ابھی شیرا یہ ننھے ننھے بیر لایا ہے، میں نے کہا موسم کا پھل ہے شاید یہ پسند کریں" ــــــ اس نے میری طرف دیکھا

اور میں گھبرا کر بیروں کو دیکھنے لگا۔ خون کے آنسو میں نے کبھی دیکھے نہیں اس لیے بیروں کو ان سے تشبیہہ نہیں دوں گا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گلابو کے دامن میں ننھے ننھے بیر نہیں بلکہ وہ اپنے ہی خون کے آنسو جمع کر لائی ہے —— لیکن وہ تو مسکرا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں بڑی صاف ستھری چمک تھی —— ایسی آنکھیں تو صرف چمکنے کے لائق ہیں لیکن یہ چمک آتی کہاں سے ہے؟ خون میں بھی تو چمک ہوتی ہے! میں نے حسب عادت سر جھٹکا اور ان خیالوں کو شبنم کی طرح جھاڑ دیا۔

مٹھی بھر بیر اٹھا کر میں بولا "بڑے خوبصورت بیر ہیں۔"

"میٹھے بھی ہیں۔" اس نے کہا۔

"اتنے پیارے بیر میٹھے نہیں تو کیا کھٹے ہوں گے۔" امی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، حسن کا ذائقہ بڑا لطیف ہوتا ہے۔" میں نے فلسفہ بگھارا لیکن افسوس ہے کہ نہ اسے امی سمجھیں نہ گلابو۔

امی نے پوچھا "کیا کہا؟"

گھبرا کر میں نے اپنی تھیوری کی تشریح کی "خوبصورتی کا بھی ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ ہم خوبصورت چیز کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن ذائقہ زبان پر محسوس ہوتا ہے۔"

"اے ہے اس میں تو کیڑا ہے!" امی نے بڑی نفرت سے ایک بیر کو دور پھینک دیا اور گلابو کی آنکھوں کی چمک غائب ہو گئی۔ اس کا رنگ ایک دم خوفناک حد تک زرد پڑ گیا اور وہ گنہگاروں کے سے انکسا سے بولی "میں تو سمجھی تھی کہ اس موسم میں کیڑے ہوتے ہی نہیں۔"

"کیڑوں کا بھی کوئی موسم ہوتا ہے!" امی نے بیروں کو گلابو ہی کے دامن سے ڈھانک دیا تھا، اور پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "پھینک دے انھیں۔ تو تو پہلے ہی بیمار ہے۔"

میں دوگونہ صدمے سے دوچار تھا۔ ایک تو حسن کے ذائقے کی تھیوری غلط ہو گئی تھی، دوسرے گلابو اداس ہو گئی تھی اور گلابو کی اداسی تھیوری کی شکست سے زیادہ اہم تھی، اس لیے میں نے کہا "کھاؤں گا نہیں امی، انہیں اپنے پاس رکھوں گا، بڑے خوبصورت ہیں۔ موتی ہیں بالکل" ــــ اور یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ پھر جب گلابو میرے پاس آئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میری اس بات نے اسے کافی سنبھالا دیا ہے۔ چہرے کی زردی میں سے آسیب کا عنصر غائب ہو چکا تھا۔ وہ آ کر چپ چاپ میرے پاس کھڑی ہو گئی، اور چینی کی اس پلیٹ کو دیکھنے لگی جس میں ننھے ننھے تازہ بیر چمک رہے تھے۔

"ایک دن کی بہار ہے۔" وہ بولی "کل تک مرجھا جائیں گے۔"

نہ جانے مجھے یوں کیوں محسوس ہوا جیسے گلابو کو میرے سامنے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں! کیسی باتیں؟ یہی بہار کی اور مرجھا جانے کی! کیوں نہیں کرنی چاہئیں؟ بس نہیں کرنی چاہئیں۔ وہ شوق سے آئے، خط پڑھوائے، خط لکھوائے اور اپنی راہ لے، یہ آگ مانگنے آنا اور گھر کی مالکن بن بیٹھنا تو خلافِ تہذیب بھی ہے اور بھونڈا بھی "کوئی خط پڑھوانا ہے؟" میں نے اسی جذبے کے تحت یہ سوال کیا۔

اس کا چہرہ ایک دم متغیر ہو گیا، اور اس وقت اس نے مجھے یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کہ اگر میں فوراً نظریں نیچی نہ کر لیتا تو میری پتلیاں پھٹ جاتیں۔ میں یونہی نیچے ہی دیکھ رہا تھا، جب وہ پلٹی اور چلی گئی۔ اور جب وہ چلی گئی تو مجھے اپنے آپ پر بڑا غصہ آیا۔ جی چاہا کہ فوراً اس کے تعاقب میں بھاگوں اور اس سے معافی مانگ لوں اور کہوں کہ ہاں یہ بیر تو مرجھا جائیں گے، مگر مرجھا کر بھی یہ خوبصورت رہیں گے، حسن تابوت میں بند ہو کر بھی حسن ہی رہتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مگر باہر امی کا پہرہ بیٹھا تھا اور اوپر آسمان پر سورج منہ پھاڑے کھڑا تھا، اور گلیاں جل رہی تھیں۔ میں نے اپنا پروگرام ملتوی کر دیا۔

میں کچھ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر جب باہر آیا تو امی نے پوچھا "کیا کہتی

ہتی گلابو؟" بڑا بے ڈھب سوال تھا۔ جب سوال کے جواب میں کوئی جھوٹ گھڑنا پڑے تو سوال کو بے ڈھب نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے۔ میں نے فوراً تو نہیں البتہ تھوڑا سا سر کھجا کر ایک آدھ بار کھانس کر ایک بھونڈا سا جھوٹ گھڑ ہی لیا۔ "کہتی تھی کل ایک اپیل کمانڈنگ آفیسر کے نام لکھی ہے، آج ایک اور کمانڈنگ انچیف کے نام لکھ دو۔"

"لکھ دیتے" انھوں نے کہا۔

"موڈ ٹھیک نہیں تھا" میں نے ٹالنا چاہا۔

"کیا ٹھیک نہیں تھا؟" انھوں نے پوچھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی"۔ میں نے تشریح کی۔

اور امی کو غصہ آگیا "اور کھاؤ نیند والی گولیاں ——" اور اس کے بعد انھوں نے طعن و تشنیع کا ایک سلسلہ جاری کر دیا، اور میں وہاں سے چلا آیا۔ جانے آج امی کو کیا ہو گیا تھا کہ بات بے بات پر ایک تقریر کر ڈالتی تھیں۔

حسب معمول کھیتوں میں ٹہلنے کے بعد دیا جلے میں گاؤں میں داخل ہوا تو گلیاں سنسان تھیں۔ میں گلابو کے گھر کی طرف سے ہو کر گزرا، آنگن میں جھانکا، اندر کوٹھے میں ٹین کے بکس پر ٹین کا دیا جل رہا تھا اور گلابو اپنے تینوں بچوں کے ساتھ زمین پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ کوٹھے کے دروازے تک پہنچنے میں مجھے کافی مسافت طے کرنی پڑی، یہی ذہنی مسافت۔ بڑی عجیب سی بات تھی نا۔ میں گلابو دھوبن سے شام کے سناٹے میں معافی مانگنے آیا تھا، اور نہیں جانتا تھا کہ معافی کیسے مانگوں گا۔ اور کیا وہ مجھے معاف کر دے گی، اور اگر وہ معاف نہ کرے گی تو میرا کیا بگڑے گا۔ یہی نا کہ وہ مجھ سے چٹھیاں نہیں لکھوائے گی! نہ لکھوائے! —— اور پھر یکایک مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میرا جسم کسی بوڑھے درخت کا کھوکھلا تنا بن کر رہ گیا ہے، خلا —— خلا —— اور اسی لیے میں پلٹنے کی بجائے آگے بڑھتا گیا، اور اسی لیے مجھے کافی مسافت طے کرنی پڑی۔

"آپ؟" وہ بوکھلا کر کھڑی ہوگئی۔ بچوں کے ہاتھ اور منہ بھی جہاں تھے وہیں رُک گئے سب سے چھوٹے بچے کا نوالہ منہ کے قریب آکر رک گیا تھا اور پتلی دال کے قطرے اس کی انگلیوں پر سے ہوتے ہوئے نیچے گر رہے تھے۔

اگرچہ میں بول نہ سکا مگر شاید میرا سارا وجود مجسم عذر خواہی بن گیا تھا۔ گلابو نے فوراً پلنگ پر کھیس بچھایا اور بولی "اندر آجایئے نا۔ آیئے، میرے دل پر آپ کی بات سے ذرا سا بھی میل آیا ہو تو مرتے دم مجھے کلمہ پڑھنا نصیب نہ ہو، آیئے۔"

میں اندر آگیا۔ اور پھر جب باہر گیا تو اتنا معلوم ہے کہ اس وقفے میں میرے وجود کی ساری خلا پُر ہو چکی تھی۔ گلابو نے مجھے معاف کر دیا تھا، اور وہ حیران تھی کہ میری آمد کی خوشی میں کیا کچھ کرے اور کیا نہ کرے! وہ ہانپنے لگی تھی، اسے ایک جگہ چین سے بیٹھنا مشکل تھا۔ وہ مجھے مسلسل دعائیں دیے جارہی تھی، اور مسلسل مجھے گھورے جارہی تھی۔ اس نے رمضو کی پنشن کا ایک بار بھی ذکر نہیں کیا، بوڑھے حافظ کی زیادتیوں کا قصہ ایک بار بھی نہیں چھیڑا۔ بچوں تک کی پروا نہ کی۔ اور جب میں وہاں سے اُٹھا تو بولی "بُرا نہ مانیے گا ایک بات کہنی ہے، ان بیروں میں کیڑے ویڑے نہیں ہیں۔ یہ جو آپ کی امی نے ایک بیر میں کیڑا دیکھا تھا نا، تو یہ کیڑا بیر میں نہیں تھا، مجھ میں تھا۔ اور آج کل مجھ سے کیڑے نکالنے کی رسم گاؤں میں عام ہو رہی ہے، آپ برا نہ مانیے گا۔" گلابو کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی تھی، لیکن جس اپنائیت سے اس نے یہ بات کی تھی وہ کچھ ایسی مبہم نہیں تھی۔ دروازے سے نکل کر جب میں باہر گلی میں آیا تو اچانک میرے ٹخنے سے ایک لکڑی بجی، یہ بوڑھے حافظ کی لاٹھی تھی۔ "کون ہے؟" اس نے اندھیرے میں کہا۔ اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو وہ دیر تک خاموش رہا، جیسے میرا جواب سنتے ہی اندھیرے میں گھل گیا ہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ کچھ بولے بغیر لاٹھی بجاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ لیکن موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور جیسے اسے یقین تھا کہ میں ابھی تک اسی جگہ کھڑا ہوں۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "کوئی بات نہیں بیٹا، کوئی بات نہیں۔ وقت وقت اور زمانے زمانے کی بات ہے۔"

"بے وقوف" میں نے جی ہی جی میں کہا اور وہاں سے چلا آیا۔

صبح کو جب میں چائے پینے کے لیے اٹھا تو امی نے پوچھا: "کل شام کو تم گلابو کے ہاں گئے تھے؟"

"جی ہاں"، میں نے تعجب سے کہا۔

"وہاں نہ جایا کرو"، انھوں نے ذرا تلخی سے کہا۔ "بیواؤں کے ہاں نہیں جایا کرتے۔"

"پر آخر کیوں امی؟" میں جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"لوگ باتیں بناتے ہیں۔"

"کیسی باتیں؟"

"بکواس!"

یوں تو بات آگے نہ چل سکی، مگر میرے خیالوں میں چلتی رہی اور کافی دیر کے بعد میں نے امی سے جاکر پوچھا "آپ کو کس نے بتایا تھا؟"

"گلابو کی ساس نے، کیوں؟"

"کچھ نہیں۔"

بہت دنوں تک گلابو میرے پاس نہ آئی اور نہ میں اس کے پاس گیا۔ البتہ اس کے بارے میں اِدھر اُدھر کی باتیں سنتا رہا اور کڑھتا رہا۔ گاؤں کی وہ کون سی بیوہ ہے، جس پر الزام نہیں تھوپے گئے۔ حولدار انور بیگ کی بیوہ کے متعلق تو یہ تک کہہ دیا گیا تھا کہ رات کو اپنے صحن میں ننگی لیٹ جاتی ہے اور یہ تک پوچھنے کی زحمت نہیں کرتی کہ کون آیا، کون گیا۔ اور پھر گلابو تو رمضو دھوبی کی بیوی تھی، پھر وہ غریب تھی، اور اس کے تین بچے تھے۔

میں نے امی سے ایک دن ان افواہوں کا ذکر کیا تو وہ بولیں: "الزام کس کس پر نہیں دھرے گئے بیٹا؟ حضرت مریم کو لو، حضرت عائشہ کو لو، ہندوؤں کے رام کی بیوی سیتا کو لو — بکواس بھی کبھی رُکے ہیں بیٹا؟ آدمی بکواس نہ کرے تو آدمی کیسے کہلائے؟ نیا نیا

بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں اذان دینے والا اذان نہیں پڑھتا، اس روپے کو یاد کرتا ہے جو اذان کے بدلے اسے ملے گا۔ اب بتاؤ اس بچے کو اللہ اور رسولؐ کے پاک نام کی برکت ملے گی کہ روپے کا لالچ، اور اس لالچ کے پیچھے بکواس کرنے کی عادت؟"

"میرے کان میں کس نے اذان دی تھی امی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا، مگر امی کو ایک دم ہنسی چھوٹ گئی اور مجھے ہلکے سے ایک چپت مار کر بولیں "بکواس نہیں کرتے۔"

ایک دن منشی جی نے قصبے سے آیا ہوا ڈاک کا تھیلا کھولا تو میں بھی وہیں موجود تھا، اس میں گلابو کے نام ایک سرکاری چٹھی بھی تھی، باقی ڈاک دیکھے بغیر میں سیدھا گھر آ گیا، اور اس یقین کے ساتھ کہ گلابو یہ خط پڑھوانے ضرور آئے گی، میں دن بھر بیٹھا سلومی پڑھتا رہا۔ آجکل یہ ڈرامہ صرف وقت ٹالنے کے کام آتا تھا، اس لیے اسے میں نے کئی مرتبہ پڑھ ڈالا تھا۔ آج ایک بار پھر پڑھ رہا تھا۔ اب نہ چاند کی زردی مجھے متاثر کرتی تھی، نہ سلومی کا حسن، نہ اس کے محبوب کی بے نیازی اور نہ مردہ ہونٹوں سے زندہ چپکتے ہوئے اُبھرے اُبھرے ہونٹوں کا مس۔ میرے تمام حواس سماعت میں بدل گئے تھے۔ آنکھوں تک سے سننے کا کام لے رہا تھا۔ قدموں کی ذرا سی چاپ مجھے چونکا دیتی تھی، مگر شام ہو گئی اور پھر رات آ گئی، مگر گلابو دوسرے دن بھی نہ آئی۔

وہ تیسرے دن بھی نہ آئی۔

چوتھے دن جب امی مجھے یوں بیکار رہنے پر جھڑک رہی تھیں تو گلابو کا بڑا لڑکا شیرا آیا اور میرے پاس آکر بولا: "ماں کہتی ہے میری ایک بات سن جائیے گا۔"

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"شام کو،" وہ بولا "ابھی ابھی تو وہ پانی بھرنے جا رہی تھی۔"

"پانی بھرنے جا سکتی ہے اور یہاں آتے ہوئے اس کے پاؤں گھستے ہیں۔" امی نے ڈپٹ کر کہا "جا کے کہہ دو کہ نہیں آئے گا میرا بیٹا، کام ہے تو خود آ جائے۔" لڑکا کل کی طرح مڑ گیا۔

مجھے امی پر بڑا غصہ آیا۔ اور یہ غصہ ابھی بڑھ ہی رہا تھا کہ شبرا دوبارہ میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے امی تھیں۔ وہ بولا "ماں کہتی ہے میں تو آجاؤں پر آپ کی بدنامی کا ڈر ہے۔"

امی نے میری طرف گھبرا کر دیکھا اور بچہ چپ چاپ جواب کے انتظار میں کھڑا رہا۔

"آؤں گا"، میں نے کہا اور وہ کل کی طرح گھوم گیا۔

امی بھی چپ چاپ پلٹ گئیں۔

ایک لمحے کے بعد وہ آئیں تو آنسو پونچھ رہی تھیں۔ "یہ لوگ بے چاری بیوہ عورتوں کو جینے تک نہیں دیتے۔ دے الزام پہ الزام اور بدنامی پر بدنامی۔ اور وہ لڑکی دھوبن ہو کر بھی اتنی شریف ہے کہ کہتی ہے میں آؤں گی تو آپ بدنام ہو جائیں گے۔ پیسے پیسے کو بھی ترسو اور مفت کی لعنتیں بھی ڈھوتے پھرو۔ یہ بھی کوئی جینا ہے۔" امی کی آنکھوں میں اچانک بہت سے آنسو آ گئے۔ انھیں پونچھ کر وہ بولیں "شام کو چلے جانا پر بیٹا چھپ کر جانا، بدنامی کا ڈر ہے!"

شام سے پہلے میں کھیتوں میں چلا گیا اور دیا جلے واپس آیا تو سیدھا گلابو کے آنگن میں جا نکلا۔ وہ میرے انتظار میں تھی۔ اندر کوٹھے میں ٹین کے بکس پر ہری کین لیمپ جل رہا تھا اور بچے وقت سے پہلے سو گئے تھے۔

میں نے یہ کہانی گلابو کے زرد رنگ سے شروع کی تھی، مگر آج اتنے دنوں کے بعد میں نے گلابو کو دیکھا تو سوچ میں پڑ گیا کہ کیا گلابو کا رنگ واقعی کبھی زرد بھی تھا؟ اس وقت تو گلابو کے چہرے کا یہ عالم تھا کہ ذرا سا چھو لو تو جیسے مساموں میں سے لہو کی دھاریں پھوٹ نکلیں گی۔ سچی بات کیوں نہ کہہ دوں، چند لمحوں کے لیے تو میں دیکھتا رہ گیا۔ اور جب اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اسے گھور رہا ہوں تو میں نے دیکھا کہ وہ بھی مسلسل مجھے گھورے جا رہی ہے لیکن نہیں وہ مجھے گھور نہیں رہی تھی، صرف دیکھ رہی تھی۔ اور اس دیکھنے میں کتنی بہت سی کیفیتیں تھیں! آج نہ وہ مجھے دعائیں دے رہی تھی، اور نہ بے چین تھی۔ بڑے سکون سے مجھے اس طرح دیکھے جا رہی تھی جیسے کوئی آسمانی صحیفہ پڑھ رہی ہے۔ میں اس تسلسل سے کچھ گھبرا سا گیا اور بے چین ہو کر بولا "چٹھی پڑھنی ہے؟"

وہ بیک وقت ہنس دی اور رو دی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے، اور اس نے پہلی بار میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر کہا "جہنمی جائے۔ بھاڑ میں تجھے پڑھیئے!"

میں کھسیانا سا ہو کر مسکرایا اور ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بچے نئے نئے صاف ستھرے لحافوں میں سو رہے تھے۔ سب سے چھوٹے لڑکے کا ایک ہاتھ کھاٹ کی پٹی پر سے لٹک رہا تھا۔ اس ہاتھ میں مٹھائی تھی۔

اور گلابو کا رنگ گلابی تھا۔

میں جیسے بھٹک کر کسی دوسری دنیا میں چلا آیا ہوں، میں نے کہا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔"

اور جیسے آپ باغ میں سیر کرنے جا رہے ہوں اور اچانک ایک پتھر تڑ سے آپ کی کنپٹی پر پڑے اور آپ درد سے زیادہ خوف کے مارے دم بخود رہ جائیں، بالکل اسی طرح گلابو نے تڑ سے یہ جملہ میرے دماغ پر دے مارا۔

"مجھے آپ سے پیار ہے" —— اور میں دم بخود رہ گیا۔

"یہ سرخ رنگ —— یہ ——" اس نے اپنے گالوں کو اپنے ہی ہاتھوں سے رگڑ لیا —— "یہ —— یہ سرخ رنگ!" اب اس کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے اور چہرے کے جس حصے کو ہاتھوں نے ملا تھا اس میں سرسوں پھولی پڑ رہی تھی "آپ تو پڑھے لکھے ہیں۔ آپ کو تو طمع سے دھوکا نہیں ہونا چاہیئے۔"

میں خاموش رہا۔ گلابو کی چوٹ کا خوف تو دور ہو چکا تھا، مگر اب شدید درد اور کرب نے میرے حواس کو سکیڑ دیا۔ اور اسی لیے میں کچھ نہ بول سکا اور وہ جیسے مجھے یقین دلانے کے لیے دوبارہ بالکل رو کر بولی "مجھے آپ سے پیار ہے۔"

"پھر؟" میں نے ڈاکٹروں کے سے انداز میں کہا۔

"پھر؟" وہ یوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے منجدھار میں گھر گئی ہے "پھر؟ ——" اس نے

یہ لفظ سرگوشی میں دوہرایا۔

اور پھر ایک لمحے کی خاموشی میں اچانک میرے ذہن میں اس معمے کا حل ابھرا خواہ مخواہ میرے ذہن پہ سلومی کا کتابی کردار چسپاں ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے جھٹک کر میں نے بڑے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "دیکھو گلابو! میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ انسان واقعی ایسے حالات میں مجبور ہو جاتا ہے۔" وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور آنسو پونچھ ڈالے۔ میں نے کہا "تمہیں مجھ سے پیار ہے اس لیے کہ تم بیوہ ہو اور تمہارے تین بچے ہیں اور تمہارے شوہر کی پنشن میں سے تمہیں ایک کوڑی تک نہیں ملتی لیکن میرے پاس بھی تو کچھ نہیں۔ میں تمہارے پیار کا کیا بدلہ دوں؟ میں بھی تو غریب ہوں!"

گلابو کی آنکھوں میں جو آنسو آ چکے تھے وہ تو خیر آ ہی چکے تھے اور وہ پلکوں کی جڑوں میں پھیل گئے تھے لیکن اس کے بعد اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہ پھوٹا۔ اس کے ہونٹ بری طرح کانپنے لگے اور ہونٹوں کے ساتھ ٹھوڑی بھی۔ اور پھر اس کے سارے جسم میں رعشہ سرایت کر گیا اور گالوں پر ہلدی کے سے پیلے پیلے داغ ابھر آئے۔ اس کی انگلیاں مرگی کے مریضوں کی طرح اینٹھ گئیں اور اس کے منہ سے آواز کچھ اس طرح نکلی جیسے وہ بہت گہرے کنوئیں کی تہہ میں پڑی بول رہی ہے "میں غریب نہیں ہوں، غریب ہوں آپ کے اور میرے اور میرے بچوں کے دشمن۔ میں کیوں غریب رہوں؟ میں نے کونسا گناہ کیا تھا کہ مجھے بھوکوں مرنے کی سزا دی گئی؟ —— پر میں یہ سزا نہیں بھگتوں گی۔ میں مروں گی نہ اپنے بچوں کو مرنے دوں گی۔ میں نے روپے کا انتظام کر لیا ہے۔ جب تک یہ سرخ ملمع میری زردی کو چھپا سکتا ہے میری پنشن بندھ گئی ہے۔ ہفتے میں ایک دو چھوکرے ضرور پھنسا لیتی ہوں اور ہر چھوکرے سے دو روپے بھی لوں تو مہینے میں پندرہ بیس تو ملتے ہی رہیں گے۔ کیا آپ نے ہمارے نئے لحاف نہیں دیکھے؟ آپ نے میری لالٹین نہیں دیکھی؟ آپ نے میری یہ سوسی کی قمیض اور تہبند بھی نہیں دیکھا؟ آپ نے تو صرف یہ پڑھا ہے کہ مجھے پیسہ چاہیئے ——" اس کی آواز میں

تحکم سا آ گیا" نہیں، پیسا دینے والے اور بہت ہیں، مجھے آپ سے پیار ہے، آپ سے مجھے پیسا نہیں چاہیئے، بوسہ چاہیئے، آپ مجھے بوسہ دیں گے؟"

میں بھڑک کر پیچھے ہٹا اور اٹھ کھڑا ہوا، اور دروازے سے نکل جانے کی ٹھانی۔

لیکن وہ مجھ پر یوں جھپٹی جیسے باز شکار پہ جھپٹتا ہے" تو کیا آپ مجھے پیار کے بدلے میں پیار نہیں دیں گے؟ ــــــ نہیں دیں گے؟ ــــــ نہیں دیں گے ــــ"

اور میں سوچتا ہوں کہ کیا سلومی کے محبوب نے اپنے مردہ ہونٹوں پر سلومی کے تر و تازہ جذبات کی شدت سے اُبھرے ابھرے ہونٹوں کے مس کی چکرا دینے والی تلخی میری طرح محسوس کی تھی! ــــــ لیکن یہ بالکل دوسری کہانی ہے!

مامتا

پنجاب سے مجھے برطانیہ کے ایک افسر نے بھرتی کیا اور چین کے ایک جزیرے ہانگ کانگ میں بھیج دیا جہاں چینی بستے تھے اور انگریز گورنر راج کرتا تھا۔ مدتوں سے ہانگ کانگ پولیس کے لیے پنجاب سے سپاہیوں کے گروہ کے گروہ برآمد کیے جاتے ہی تھے، لیکن اب ادھر یورپ میں ہٹلر نے جنگ چھیڑ دی تھی اور انگریز وہاں بہت عدیم الفرصت ہو رہا تھا، اس لیے ہانگ کانگ پولیس کے لیے پنجابی نوجوانوں کی مانگ دگنی ہو گئی تھی۔ میں کچھ ایسے گٹھے ہوئے جسم کا جوان نہیں ہوں، فوجی بھرتی میں کئی بار منہ کی کھائی ہے، مگر اب کے ڈاکٹر نے میری باہر نکلی ہوئی پسلیوں سے نظریں بچا کر میرے لمبے قد کی تعریف کی اور کہا کہ اتنے دراز قد نوجوان سپاہی کو دیکھتے ہی چینی باشندے دہل کر مر جائیں گے۔ ہانگ کانگ پولیس میں چھ فٹ سے کم قد کے نوجوانوں کو بھیجنا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے اور اس سیاسی غلطی کی تصحیح کا جذبہ مجھے ہانگ کانگ لے آیا۔

میں نے پرانے ہانگ کانگی سپاہیوں سے سن رکھا تھا کہ ہانگ کانگ میں بڑے مزے ہیں، ہر اس ملک میں پولیس کے بڑے مزے ہیں جس پر کوئی دوسرا ملک راج کرتا ہے، اور ہانگ کانگ تو پولیس کی جنت ہے۔ پستہ قد گدا گر چینی عورتوں کو سڑکوں اور بازاروں کی پٹڑیوں پر سے بھگا دو، اور جب ان کی گودوں میں سے ان کے بچے پاؤں سے جوتوں کی طرح نکل جائیں تو ان بچوں کو گندے چیتھڑے کی طرح چٹکی سے پکڑ کر ان کی ماؤں کی طرف اچھال دو،

اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں آکر اس رویئلی خدمت کی سنہری سند حاصل کر لو. کولون اور اصلی چین کی سرحد پر ہر آنے والے چینی مسافر کی تلاشی لو، اور اس کا بوجھ ہلکا کر کے اسے پھر چین میں دھکا دے دو سمندر کنارے کی سیر گاہوں میں گھومتی ہوئی نوجوان چینی لڑکیوں میں سے جسے چاہو چن لو اور اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوئی اس کی ماں کی مٹھی میں کوئی ٹھیکری تھما کر لڑکی کو اپنی بارک میں لے جاؤ اور پوری بارک کو محظوظ و ممنون کرو، اور اگر کوئی سارجنٹ چھاپا مار بیٹھے تو لڑکی کو اس کے حوالے کر کے چین کی نیند سو جاؤ. غرض بڑے مزے تھے. لیکن جب ہمارا جہاز سنگا پور پہنچا تو ایک مدراسی جہازی نے ہوائی اڑا دی کہ ادھر مشرقی سمندروں میں بھی جنگ ہونے والی ہے. جہاز کے انگریز کپتان نے یہ افواہ سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا. غلط افواہ پھیلانے کے جرم میں مدراسی جہازی کو ملازمت سے برطرف کر دیا، اور سنگا پور ہی میں انگریز پولیس کے سپرد کر دیا ـــــ تاکہ افواہ زیادہ نہ پھیلنے پائے۔

جب ہم ہانگ کانگ پہنچے تو فضا سرگوشیوں سے چھلکتی معلوم ہوئی. جنگ ہونے والی ہے، جنگ ہونے والی ہے. پھٹی پھٹی آنکھوں میں زبانیں پیدا ہو گئی تھیں اور لوگ یوں تیورا تیورا کر چلتے تھے جیسے قدم قدم پر ان کے سینے کے اندر ہی گولی چل جاتی ہے. ہانگ کانگ اور کولون کی بل کھاتی سڑکوں کی پٹڑیوں پر بیٹھے ہوئے چینی پناہ گزین افق کی طرف یوں تکتے رہتے تھے جیسے بمباروں کے انتظار میں ہیں. ان کے پھٹے ہوئے ہونٹوں اور اینٹھتی ہوئی پپڑیوں میں ایک ہی سوال کلبلا رہا، "جو کچھ ہونے والا ہے وہ ایک دم سے کیوں نہیں ہو چکتا" پناہ گزیں عورتیں مارے خوف دھڑا دھڑ قبل از وقت بچے جن رہی تھیں. بھوکے پیاسے چینی بچوں کے ہجوم روٹی کی تلاش میں سڑکوں پر مارے مارے پھرتے تھے. ایک انگریز حکمران نے تو انتظامیہ کے ایک اجلاس کے دوران میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اتنے بہت سے بچوں کا کفیل ہونا حکومت کا فرض نہیں. جن بچوں کے ماں باپ زندہ ہیں ان کے گلے میں کتوں کی طرح پٹے ہونے چاہئیں اور گلے میں پٹے کے بغیر جو لڑکا دکھائی دے جائے اسے کولون

کی سرحد پرلے جاکر اصلی چین میں دھکا دے دینا چاہیے۔ پولیس کے لیے پیدل سیر کرنے والے صاحب لوگوں کی آسائش کی خاطر پٹریاں صاف رکھنے کا کام سخت دشوار ہو رہا تھا مورچے کھد رہے تھے، پناہ گاہیں تعمیر ہو رہی تھیں، عمارتوں کے حسن کو ریت کی بوریوں نے چھپا لیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا کہ سارے کا سارا ہانگ کانگ زیر تعمیر ہے۔ شام کے بعد ہانگ کانگ اور کولون پر الو بول جاتا تھا۔ کہتے ہیں ایک زمانے میں ہانگ کانگ کی روشنیاں جب سمندر میں ڈبکیاں لگاتی تھیں اور پھر جب پانی ان روشنیوں کو اوپر انہی روشنیوں کی طرف اچھال دیتا تھا تو پرانے بوسیدہ جسموں میں بھی انگڑائی کی اینٹھن رینگنے لگتی تھی۔ مگر اب تو ہانگ کانگ اور کولون کا درمیانی سمندر ساری دنیا کے اندھیرے کا منبع معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت میں دن کی تربیتی پریڈ سے تھک ہار کر بارک میں چارپائی پر لیٹے ہوئے اِدھر اُدھر کی مزے مزے کی باتیں سوچنے کی کوشش کرتا، مگر اندھیرے اور سناٹے کی دہشت میرے کانوں میں بھیاروں کی بھنبھناہٹ بن کر گونجتی اور میں اپنی ماں کو یاد کرکے رو دیتا۔

دن کو بھی جب میں لوگوں کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور فق چہرے دیکھتا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ سب کے سب اپنی مائیں کھو بیٹھے ہیں، اور انہی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سب کے بشرے پر اس معصوم بچے کی سی لٹی لٹی کیفیت تھی جس کے منہ سے قبل از وقت دودھ کھینچ لیا جائے۔ مجھے بار بار اپنی ماں یاد آتی تھی، مگر دن کے ہنگاموں میں اس تصور سے بار بار کترا کر نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا، البتہ رات کو یہ تصور میرے ذہن میں اور میری آنکھوں سے چمٹ کر رہ جاتا اور میں تکیے میں منہ چھپا کر بچوں کی طرح روتا رہتا۔

ماں نے مجھے ہانگ کانگ آنے سے روکا نہ تھا اور کہا تھا "ہانگ کانگ... تو وہاں ہے جہاں سے آگے سنا ہے دھرتی ختم ہو جاتی ہے۔ بیٹا، تم دلی کلکتہ میں ہوتے تو میں تمہیں خوابوں میں تو ٹٹول لیتی۔ پر تم تو ہانگ کانگ جا رہے ہو۔ تمہارے میرے درمیان سمندر اور پہاڑ کھڑے ہو جائیں گے اور پھر میرے لال لام اگر اُدھر بھی ہونے لگی اور تمہارے دشمنوں پر

بھی کوئی آنچ آ گئی تو بتاؤ میں یہاں اس اُجڑے پجڑے گاؤں میں کس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اُٹھوں گی۔ نہ جاؤ میرے بیٹے، مجھے بھوکوں زندہ رہنا آتا ہے۔ میں سوچتی ہوں، وہاں تمہارے کپڑے کون دھوئے گا؟ تمہارے بالوں میں تیل کون ڈالے گا؟ تمہاری آنکھوں سے گری ہوئی پلک کون نکالے گا؟ تمہارے چولے کے بٹن کون ٹانکے گا؟ —— اور پھر پچھلے سال کی طرح تمہارے دشمنوں کو نمونیا ہوگیا، تو؟ پچھلے سے پچھلے سال کی طرح، میری زبان کو ٹلہ ہو جائے، اگر تمہارے دشمنوں کے آدھے سر میں درد اُٹھا تو تمہاری کنپٹیوں میں روغن بادام کون ملے گا؟ نہیں بیٹا نہ جاؤ۔ جاؤ میرے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤ، بھوکوں مریں گے پر اکٹھے تو مریں گے۔ اور بیٹا، اگر تم ہانگ کانگ میں ہوئے اور اِدھر میں مر گئی تو میری قبر میں تمہارے حصے کی دو مٹھی بھر مٹی کون ڈالے گا جو مولوی جی کہتے ہیں ماں کی قبر کے اندھیرے میں جھولی بھر ستاروں کی طرح چمکتی رہتی ہے، بتاؤ' —— لیکن میں چلا آیا تھا۔ اور جب آتے وقت میں نے ماں کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے کی کوئی جھری ایسی نہ تھی جس میں آنسو ندی بن کر پھیل نہ گئے ہوں۔ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا یہ چہرہ جیسے میری پتلیوں میں گھس گیا تھا، اور رات کو بارک میں مجھے اس فق چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا، اور پھر میں ماں کی جمی ہوئی نظروں سے ڈرنے لگتا اور حواس باختہ ہو کر اس سے سرگوشی کرتا تھا 'ماں تمہاری پلکیں جھپکتی ہی نہیں۔ تمہاری پتلیاں تو ہلتی ہی نہیں۔ تم کیسے دیکھ رہی ہو ماں؟' اور یہ سوال میں اس لیے پوچھتا تھا کہ مجھے میری ماں چینی پناہ گزینوں کی طرح اُفق کی طرف تکتی نظر آتی تھی۔ جہاں سے کہتے ہیں ایک منٹ میں ایک ہزار بم برسانے والے ہوائی جہازوں کو نمودار ہونا تھا۔

اور پھر ایک دن یہ نظریں افق پر جمی رہ گئیں۔ بمبار کسی اور سمت سے آ نکلے۔ پیانو اور آرگن کی صداؤں میں لپٹا ہوا ہانگ کانگ بموں کے دھماکوں سے بلبلا اُٹھا۔ طیارہ شکن توپیں چند مرتبہ بھونکیں، اور پھر گردنیں نہیوڑا کے تھکے اژدھوں کی طرح لیٹ گئیں۔ بجلی اور تار کے اکھڑے ہوئے کھمبے بلندی پر سے پٹخنیاں کھاتے ہوئے گرے اور سڑکوں پر بکھرے ہوئے

پناہ گزینوں کا بھیجا چاٹتے ساحل پر بکھر گئے۔ شہروں کی عمارتوں نے اپنی جگہ بدل لی، دیواروں کے ملبے باغیچوں میں آن گرے تو باغیچے کی جھاڑیاں بال کمرے میں بکھر گئیں۔ ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے ایک پنجابی سپاہی کے پیٹ میں بم کا ایک سپلنٹر پیوست ہو گیا، انتڑیاں باہر نکل آئیں موت کے کرب میں اس نے چند بل کھائے تو اس کی انتڑیاں اس کی گردن میں پھنس گئیں اور ایک انگریز افسر نے بموں کے خوف سے بے نیاز ہو کر اس کی تصویر اتار لی، ہم غیر تربیت یافتہ سپاہیوں کو پناہ گاہوں میں دھکیل دیا گیا، جہاں انگریز بچے اور انگریز مائیں تک "ممی ممی" کراہ رہی تھیں۔ ایک بوڑھی انگریز عورت پناہ گاہ کے دروازے کے پاس سے ہر چہرے کو پڑھتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تلے کھڑے تھے، اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلّی کو مسلے جا رہی تھی، اور جب وہ آخری چہرہ پڑھ چکی تو "میرا بیٹا" کہہ کر دھم سے گر پڑی، اور ہم سب کے منہ لٹک گئے۔

جاپانیوں کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ آئے اور قابض ہو گئے اور میں جو پنجاب سے ہانگ کانگ میں پولیس کا سپاہی بننے آیا تھا جنگی قیدی بنا دیا گیا۔ اس روز میں خوب خوب رویا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع یعنی اپنی ماں کو کھو بیٹھا ہوں، جیسے جنگ نے میری باہوں سے میری ماں کو گھسوٹ لیا ہے، جیسے اب تک میں ہانگ کانگ میں اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھا تھا مگر اب اس کی لاش کو دفن کر کے خالی ہاتھ رہ گیا ہوں باوجود ہزار کوشش کے اب ماں کا فق چہرہ بھی میرے سامنے نہیں ابھرتا تھا۔ اس چہرے کے مانوس نقوش دھندلا گئے تھے، ہر طرف جیسے غبار اڑنے لگا تھا۔

چند روز تک اسی کیفیت میں قیدیوں کے باڑے میں بند پڑا رہا۔ میرا بند بند ٹوٹ چکا تھا اور جسم بالکل کھوکھلا ہو گیا تھا۔ کبھی بھولے سے سر ہلایا تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے ایک پتھر ایک کان سے لڑھک کر دوسرے کان سے ٹکرا گیا ہے۔ بعض اوقات پھیپھڑوں میں سانس جاتی تھی اور وہیں کی ہو رہتی تھی اور میں سینے پر گھونسا مار کر دوسری سانس لے پاتا تھا۔

مگر جلد ہی میں اس قید سے مانوس ہو گیا اور پھر جاپانیوں سے مانوس ہونے میں تو مجھے کوئی دیر نہ لگی میری قمیص کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ ایک دن ایک جاپانی سے میں نے ایک بٹن کی بھیک مانگی تو اس نے میرے سینے کے بالوں کا ایک گچھا ایک جھٹکے سے توڑ کر میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا "اسے باندھ لو!" ٹوٹے ہوئے بالوں کی جڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے خون نے جاپانیوں سے مانوس ہونے کی پہلی منزل طے کرا دی۔ حکم ملا کہ سب قطار میں کھڑے ہو جاؤ۔ حکم دینے والا جاپانی افسر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹا تو ایک چھوٹے سے گڑھے نے اسے لڑکھڑا دیا، اس کی ٹوپی گر پڑی اور عینک کا ایک بازو کان سے ہٹ کر لٹکنے لگا۔ میرے قریب کھڑا ہوا سربلند مسکرا دیا۔ "مسکراتا ہے؟" ایک جاپانی افسر نے سوال کیا اور پھر ایک گولی سن سے آئی اور سربلند کی پسلیوں کو توڑتی باہر نکل گئی۔ ایک لمحے کے پیچھے میں مر گیا۔ پھر جب جاپانیوں کو بے تحاشا ہنستے سنا تو ہوش آیا۔ ہنسی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ گولی سربلند کے جسم سے نکل کر اس کے عقب میں کھڑے ہوئے وارث کے پیٹ میں گھس گئی تھی۔ اور سربلند پیچھے گرا تھا تو وارث منہ کے بل گرا تھا، اور موت کے کرب میں دونوں نے ایک دوسرے کے جسم نوچ ڈالے تھے، اور وارث کی موت جاپانیوں کے لیے لطیفہ بن گئی تھی۔ اس روز سے ہم سب نے ایکا ایکی جاپانیوں سے مانوس ہونے کی آخری منزل طے کر لی۔ حکم ملے تو مسکراؤ۔ حکم ملے تو نظریں اُٹھاؤ۔ حکم ملے تو خشک گلے تر کرنے کے لیے منہ کا لعاب نگلو اور اگر حکم نہ ملے تو مٹی کے مادھو کی طرح جس انداز اور جس رُخ سے کھڑے ہو کھڑے رہو۔ اور پھر میں جینے کے معاملے میں بہت لالچی ہو گیا تھا۔ میں ہر قیمت پر جینا چاہتا تھا کہ کبھی تو جنگ ختم ہو گی، کبھی تو کوئی جہاز مجھے اپنے سینے پر بٹھا کر سنگاپور سے گزرتا ہوا ہگلی میں داخل ہو گا اور ریل گاڑی مجھے کلکتے سے پنجاب لے جائے گی، جہاں میں اپنی ماں کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھ جاؤں گا اور قیامت تک یونہی بیٹھا رہوں گا۔ جینے کے اسی لالچ کے سبب میں نے جاپانیوں کے حضور

میں کبھی کوئی گستاخی نہیں کی۔

کافی دنوں تک ہم ہانگ کانگ ہی میں اپنے نئے حاکموں کی خدمت بجا لاتے رہے۔ ہم پھٹی ہوئی نیکروں میں کاغذ پھنسا کر ستر پوشی کرتے تھے اور ٹوٹے ہوئے بٹنوں والے گریبانوں میں سے جھانکتے ہوئے سینے کو بازوؤں سے ڈھانپے رکھتے تھے۔ اور ہم ایسے سدھ گئے تھے کہ ہم نے سرکس والے ہاتھیوں کو مات کر دیا تھا۔ ایک روز ہمیں ایک جاپانی افسر نے بتایا کہ ہانگ کانگ کے قریب ہی ساحلی جزیروں میں سے ایک چھوٹے سے جزیرے پر سو ڈیڑھ سو چینی مچھیروں نے جاپانی سرکار کے خلاف ایک محاذ بنا لیا ہے، اور اب وہ ہانگ کانگ تک پر چھاپا مارنے کی سوچ رہے ہیں۔ ان کی گوشمالی کے لیے ہانگ کانگ سے جاپانی فوجیوں کا ایک دستہ بھی جانے والا تھا جس میں دفادار اور تابعدار قسم کے قیدیوں کو بھی جانا تھا۔ ظاہر ہے اس دستے میں میرا نام سرفہرست تھا۔ رات کے دو بجے ہم سب ایک دخانی کشتی پر سوار ہوئے، آج ہوا معمول سے زیادہ خنک ہو رہی تھی۔ اور میری قمیص کے کھلے گریبان میں جیسے اولے سے بھر گئے تھے۔ ایک دوسرے میں گھٹتے سمٹتے ہم منہ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے، نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیے تھے۔ اتنی اُجلی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میں نے صبح کو عریانی کے عالم میں اس کے خلوت کدے میں دیکھ لیا ہے۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے سامنے ایک چھوٹی سی وادی چینی کی پیالی کی طرح نمودار ہو گئی۔ اس کے عین وسط میں چند جھونپڑے تھے اور چہار طرف ساحل کی سمت سے آتی ہوئی ان گنت پگڈنڈیاں، ان کے قریب آ کر غائب ہو رہی تھیں۔ جھونپڑوں

کے گرد گھاس کے قطعے تھے۔ان کے گرد درختوں کا ایک دائرہ تھا۔ان کے پیچھے جھاڑیوں کا ایک دائرہ اور پھر سب کے آخر میں ساحل کی سنہری ریت اور سانس لیتے ہوئے سمندر کا دائرہ، سارا منظر کچھ عجیب مصنوعی سا لگتا تھا، بالکل کھلونا سا اور جب میں سمندر کی بڑی بڑی لہروں کی طرف دیکھتا تھا تو میرے قدموں تلے چینی کی یہ پیالی تیرتی اور ڈولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ہم سب کو بڑی حیرت ہوئی کہ دیر تک انتظار کرنے کے باوجود ابھی تک ہمیں جھونپڑوں کے آس پاس کوئی بچہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔کسی جھونپڑے سے دھواں تک نہیں اٹھتا تھا۔کسی بوڑھے کے کھانسنے تک کی آواز نہیں آتی تھی۔صرف ایک کتا گھاس کے قطعوں میں لوٹیں لگا رہا تھا۔تنگ آکر دستے کے جاپانی لیڈر نے اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر کر دیا اور پھر ہم سب دبک کر زمین سے چمٹ گئے۔ مگر یہ فائر بھی جھونپڑوں کے آس پاس زندگی کا کوئی ثبوت نہ اُبھار سکا۔بس اتنا ہوا کہ کھیلتا ہوا کتا کان کھڑے کر کے ایک لمحہ ہماری طرف دیکھتا رہا اور پھر جھونپڑیوں میں بھاگ گیا۔چڑیاں بہت سی ڈاروں کی صورت میں مشرق کی طرف کچھ یوں اُڑ گئیں جیسے ابھرتے ہوئے سورج میں گھس کر ہی دم لیں گی۔

اب ہم نے ہلہ بول دیا۔جھونپڑوں کے قریب آکر ہم نے اکٹھے بہت سے فائر کر دیئے اور پھر جاپانی افسر نے کڑک کر چینی زبان میں کہا "اگر کوئی اندر ہے تو فوراً باہر آجائے ورنہ اس کے بعد ہم اندر آکر کسی کو جیتا نہ چھوڑیں گے"!

اور پھر میں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو صرف جنوں پریوں کی کہانیوں ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔یہاں سے وہاں تک تمام جھونپڑیوں میں سے پھٹے پرانے چیتھڑے پہنے ہوئی بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتیں اتنی بہت سی تعداد میں ایک دم باہر نکل آئیں جیسے وہ اسی حکم کے انتظار میں تھیں۔آن کی آن میں ہمارے سامنے جھریوں بھرے چہرے لٹکتی ہوئی جھلیوں اور بجھی ہوئی آنکھوں کی قطاریں تن گئیں اور مجھے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑا حادثہ

ہونے والا ہے۔ اس وقت کا سناٹا ہولناک تھا۔ ابھرتے ہوئے سورج کی وجہ سے ہم سب کے سائے ڈراؤنی حد تک لمبے ہو کر گھس کے قطعوں پر جیسے لیٹ گئے تھے، اور عورتیں زیر لب کوئی جاپ کر رہی تھیں۔ کچھ ایسی پراسرار فضا پیدا ہو گئی جیسے ابھی ابھی ایک پل میں چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر جائے گی اور الٹ کر سب کو سمندر میں گرا دے گی۔

جاپانی افسر کے حکم سے ہم نے انھیں گھیرے میں لے لیا، پھر جاپانی لیڈر آگے بڑھا اور گرج کر بولا "مرد کہاں ہیں؟"

ایک لمحے تک کچھ خاموشی رہی جیسے توپ میں گولا بھرا جا رہا ہے۔

پھر ایک بالکل سفید بالوں والی بڑھیا ایک قدم آگے آ گئی اور بولی "روز کے کام پر گئے ہیں!"

"روز کے کام پر" لیڈر کڑکا "یعنی جاپانی سرکار کی جڑیں کھودنے کے لیے چین کے ساحلوں پر فسادیوں کے اڈے بنانے؟"

"جی نہیں" بڑھیا بولی "مچھلیاں پکڑنے!"

"اور بچے اور بوڑھے؟" افسر نے پوچھا "اور تمہاری لڑکیاں؟"

"آج ہم مچھیروں کا سالانہ میلہ ہے" بڑھیا اسی انداز میں بول رہی تھی "سب ادھر پانیوں میں خوشیاں منائیں گے اور ــــ"

"ادھر آؤ" لیڈر نے بڑھیا کے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے کھینچا اور وہ منہ کے بل گر پڑی دوسرے افسر نے اس کی پیٹھ پر اپنے ریوالور کا فائر کر دیا۔ وہ چیخی اور یوں تڑپی جیسے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ پھر وہ چت گر پڑی اور دو ایک بار تن کر ٹھنڈی ہو گئی اور اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے جیسے ہم سب کو گھورنے لگی۔ سب عورتیں چہروں کو ہاتھوں سے چھپا کر رہ گئیں اور میں نے اپنے ہونٹ کے ایک گوشے کو اس زور سے کاٹا کہ کرچ سے میرا دانت میرے ہی گوشت میں اتر گیا۔

چڑیوں کے غول جو شاید پلٹ آئے تھے روتے ہوئے ہانگ کانگ کی طرف اُڑ گئے۔

لمبی لمبی ٹانگوں والے سمندری پرندے کچھ یوں منتشر ہو کر اِدھر اُدھر اُڑ گئے جیسے گولی انہی کے ہجوم میں سے گزری ہے۔

دور کے جھونپڑوں میں دو کتے بھونکنے لگے۔

ہم پنجابیوں کو عورتوں کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر جاپانی جھونپڑوں میں گھس گئے۔ خوب خوب اُٹھا پٹخ کی اور گالیاں بکیں۔ میں چینی عورتوں کے چہروں کو باری باری دیکھتا رہا۔ اُن کی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلی موت کے خوف سے یا جانے کس احساس سے کانپے جا رہی تھی، اور ان کی ذرا ذرا سی آنکھیں کہیں دور ہٹ کر کچھ سوچ رہی تھیں۔ جاپانی جھونپڑوں سے نکل کر دور گول ساحل کی طرف چلے گئے تھے، اور جھاڑیوں میں فائر کر رہے تھے۔

اچانک ایک عورت زمین پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا زیر لب جاپ جاری کر دیا۔ مجھے اپنی ماں یاد آ گئی۔ میں فوراً دوسری طرف دیکھنے لگا اور کچھ یوں ظاہر کیا جیسے میں ان سب سے بے پروا ہو گیا ہوں۔ آنکھوں کے گوشوں میں سے میں نے دیکھا کہ وہ عورت پھر زمین پر بیٹھ گئی اور دوسری عورتوں کی ٹانگوں میں چھپتی ہوئی آگے کھسکنے لگی۔ مردہ بڑھیا کے پاس آ کر اس نے نہایت خوفزدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ پھر جلدی سے لاش کے چہرے پر ایک بڑا سا کپڑا پھیلا کر وہ پیچھے ہٹی اور اپنی جگہ پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے ضبط کی کوشش کی، کانپتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو آ ہی گئے۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت تھوڑا سا آگے آ کر مجھے بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی پلکیں جھپک گئیں اور اکٹھے بہت سے آنسو

اس کی جھریوں میں ندیوں کی طرح بہہ کر پھیل گئے۔ سمندر کی ٹھنڈی نم آلود ہوا میرے کھلے گریبان سے فائدہ اٹھا کر میری پسلیوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھی اور میں رو رہا تھا۔ میں نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا، ان سب کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔ میں بڑھیا کی لاش کی طرف دیکھنے لگا، ہوا کے ایک جھونکے نے اس کے منہ پر سے کپڑا اڑا دیا تھا۔ میں نے جھک کر اس کا سر اٹھایا اور اس کے گرد کپڑا لپیٹ دیا۔ ایک جاپانی سپاہی چنگھاڑتا ہوا آیا اور میری کمر میں ایک زور کی ٹھوکر ماری۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے سوا دوسری سب عورتوں نے ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپا لیے اور میں کمر کی چوٹ کو سہلاتا کھڑا ہو گیا۔ جاپانی سپاہی نے لاش کے سر پر سے کپڑا نوچ ڈالا مری ہوئی بڑھیا کا ذرا سا سفید جوڑا کھل کر اس کے کھلے دہانے اور پتھرائی ہوئی آنکھوں پر پھیل گیا اور سب جاپانی واپس آ گئے۔

دستے کے لیڈر نے عورتوں کے سامنے بڑے غصے سے ایک تقریر کی اور کہا "معلوم ہوتا ہے کہ ہانگ کانگ میں بھی تم لوگوں کا خفیہ گروہ کام کر رہا ہے اور انہی میں سے کسی نے تمہیں ہمارے چھاپے کی خبر دی ہے۔ ورنہ یوں نوعمر لڑکیاں بچے، جوان اور بوڑھے جزیرے پر سے غائب نہ ہوتے۔ لیکن ہم یہاں سے جانے کے نہیں، ہم آج سارا دن ان کا انتظار کریں گے اور جب وہ آئیں گے تو تمہارے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں، بہنوں، شوہروں، بیویوں اور بابوں کو تمہارے ہی سامنے گولیوں سے اڑا دیں گے اور پھر تمہیں بھی سمندر میں دھکیل دیا جائے گا۔" وہ دیر تک ایسی باتیں کرتا رہا اور آخر ہم جنگی قیدیوں کو ان نئے قیدیوں کی نگرانی پر مقرر کر کے سب جاپانی دور درختوں کے دائرے میں چلے گئے اور اپنے اپنے تھیلوں میں شراب کی بوتلیں نکال کر قہقہے مارنے اور ناچنے گانے لگے۔

عورتیں ہمارے حلقے میں بیٹھ گئیں۔ بادل گھر آئے تھے، جن کی وجہ سے سورج غائب تھا۔ اتنی دیر بعد بھی وہی منہ اندھیرے کا منظر جاری تھا۔ تیز ٹھنڈی ہوا میرے سینے میں

برمے کی طرح گھسی جا رہی تھی ہیں گریبان کے دونوں حصوں کو ملاتا تو میرا ہاتھ سُن ہو جاتا اور جب چھوڑتا تو سر سے پاؤں تک لرز اُٹھتا۔ بڑھیا کی لاش کی موجودگی کے احساس سے بھی جسم کی کپکپی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عورتوں کا زیرلب جاپ جاری تھا۔ لاش کا منہ ڈھانپنے والی عورت کے چہرے پر آنسوؤں کی بجائے زردی کھنڈ رہی تھی اور وہ منہ کھولے مجھے گھورے جا رہی تھی۔

دیر تک یہی کیفیت جاری رہی۔ جب ایک جاپانی سپاہی ہمارے پاس آیا اور بولا کہ فی الحال ایک اور قریبی جزیرے پر جانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ اس لیے کچھ دیر کے بعد ادھر روانہ ہوں گے اور جب تک یہ عورتیں ہم سب کے لیے کھانا تیار کریں گی۔ اس نے عورتوں کو کھانا پکانے کا حکم دیا اور ہمیں اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہنے کا حکم دے کر واپس چلا گیا۔

عورتیں اپنے اپنے جھونپڑوں میں چلی گئیں، بادل گرجنے لگا۔ ہوا میں جمی ہوئی برف کے ٹکڑے اُڑنے لگے جو میرے سینے سے نکیلے پتھروں کی طرح ٹکرا رہے تھے اور میں اپنے گھر دند کے اس گوشے کو یاد کر رہا تھا جس میں دبک کر ہم ماں بیٹا سردیوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے تھے۔ اُپلوں کا دھواں ہمارا احاطہ کیے رکھتا تھا، اور ماں بار بار میرے سینے پر اپنی چادر پھیلا کر کہتی تھی "سینے کو سردی سے بچائے رکھو بیٹا۔ ہوا میں جو نمونیہ ہوتا ہے وہ سینے ہی کی راہ پسلیوں میں اترتا ہے"۔۔۔۔ آنسوؤں میں بھیگا ہوا ماں کا چہرہ ایک مدت کے بعد بڑی وضاحت سے میرے سامنے اُبھرا۔ جھریوں میں پھنسے ہوئے آنسو بجلی کی چمک سے جگمگا اُٹھے تھے۔ بجلی کانپ رہی تھی اور یہ چہرہ میرے قریب آ رہا تھا۔

وہ عورت جس نے لاش کا چہرہ ڈھانپا تھا، آہستہ آہستہ میری طرف آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی اور وہ بار بار پلٹ پلٹ کر جاپانیوں کی طرف دیکھتی تھی جو دور ابھی تک ناچ اور گا رہے تھے۔

اس کے چہرے اور میری ماں کے چہرے میں کتنی مماثلت تھی، بڑھاپے میں کتنی یکسانیت ہوتی ہے۔ اس وقت اس کی جھریوں میں بھی آنسو پھیل رہے تھے۔ قریب آکر رک گئی اور چینی زبان میں آہستہ سے۔ بولی ”قیدی ہو؟“

میں زبان سے کچھ نہ بولا، صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بولی ”میرا بیٹا جلدی میں تھا، میں پکارتی رہی مگر اس نے میری ایک نہ سُنی، اس کی قمیص میں بھی تمہاری قمیص کی طرح ایک بھی بٹن نہ تھا۔“

میں چونکا۔

وہ بولتی چلی گئی ”تمہاری ماں ہے نا؟“

میں اب کے بھی کچھ نہ بولا، صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش کی مگر بچے کی طرح رونے لگا۔

وہ آگے بڑھ کر میری قمیص میں بٹن ٹانکنے لگی، اور جب ٹانک چکی تو آنسوؤں میں مسکرائی۔ جاپانیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر اس نے جیسے چوری چوری میرے ایک گال پر بوسہ دیا، اور میری قمیص سے آنسو پونچھ کر پلٹ گئی۔

اور میں ایک لمحے کے لیے یوں سمجھا جیسے چینی کی یہ پیالی ہوا میں ابھر کر الٹ گئی ہے اور میں پنجاب میں اپنی ماں کی گود میں گر پڑا ہوں!

الحمدللہ

شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ تھے۔ کھدر یا لٹھے کی تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاری والی ریشمی خوشابی لنگی، دوگھوڑا بوسکی کی قمیص جس کی آستینوں کی چنٹوں کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا، اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی ایک جیب میں قطب نما ہوتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا ہوتی تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی مشہدی لنگی جس میں سے کلاہ کی مطلا چوٹی چمکتی رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس پر جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے کوکے جڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا کافرتیل جس کی خوشبو گلیوں میں لٹکتی رہ جاتی تھی۔ قدرے اوپر اٹھی ہوئی پتلیوں والی آنکھوں کے پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں حاجیوں کے لائے ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو وضو سے پہلے، دن میں چار پانچ بار اترتی تھیں مگران کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا گیا۔ اور پھر مولوی ابل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی یہ نعمت کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی ماہیے کی کلی الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کیے ہوئے ڈیڑھ سو روپوں کی پوٹلی چھن سے آکر گرتی تو وہیں نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے گاؤں کے مسکینوں محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا "مجھے دعائیں نہ دو، اس اللہ جل شانہٗ کو یاد کرو جو پتھر میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔ مجھے دعائیں نہ دو، مجھے اس نے

کیا نہیں دیا، صحت، اطمینان، بے فکری۔ مجھے تو اس کی رحمتوں کے خزانے سے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی، مولوی ابل کے یہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھ گیا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے ہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساء کے نظامِ تخلیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زیب النساء کے ہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر بھی سورج طلوع نہ ہو اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی ابل کی جان میں جان آئی یقیناً اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشابی لنگی صافی بن کر رہ گئی۔ بوسکی کی قمیص برسوں پہلے پوتڑوں کے روپ اختیار کرتی غائب ہو چکی تھی، اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چوغے نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود یوں میلا میلا سا لگتا تھا جیسے اسے بُنتے وقت جولاہے نے سوت کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بن ڈالی ہے۔ مطلا کلاہ کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی اور عصا کا گلٹ لڑکیوں کے بندوں جھمکوں کی نذر ہو چکا تھا۔ سرخ سرخ پپوٹوں والی آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح بہت اوپر اٹھ گئی تھیں کہ مولوی ابل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا۔ تابڑ توڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تابڑ توڑ تبدیلیاں ہو رہی تھیں مولوی ابل نے اپنی پہلوٹھی کی بیٹی مہر النساء کے لیے جو جوتا ایک روپے میں خریدا تھا، اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی بچی عمدۃ النساء کے لیے چھ روپے میں تیار کیا تھا۔ اور جب مولوی ابل نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے۔ قیمتیں یوں ایک دم زن سے اوپر گئی ہیں کہ لگتا ہے دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ قاف پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت ہے، ایک چونی کما رہا ہوں، چلیے آپ چونی کو بھی جانے دیجیے۔ اس میں ذرا سا

بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں، جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریات زندگی کا اترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی ابل خدا سے اپنی عمدہ کے لیے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا اور جب اس نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونا اٹھا کر مولوی ابل کو عمدۃ النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو دیا۔ اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پونے چھ روپے موچی کی نذر کر آیا۔ اور موچی کی دکان سے اٹھ کر گلی میں آیا تو اللہ جل شانہ کو حاضر ناظر مان کر نسوار سے توبہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی اور ضروریات زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی اور اولاد کے ساتھ مولوی ابل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہر النساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا، ادھر مولوی ابل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اٹھنے کا نام نہیں لے رہا۔ سجدے میں پڑا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت پر کھانسی کا دورہ نہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی ابل ایک ہی سجدے میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھنے کی سعادت حسب دستور اسی کے سپرد ہوئی، مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا، کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا البقرہ سے النساء میں جا نکلا۔ اور سورۂ رحمان پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دو بار پڑھ ڈالا۔ چوہدری فتح داد کرسی نشین و ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ نے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار تو مولوی ابل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھے "آپ کے ہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چوہدری صاحب۔ آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہوتی تو میں سمجھاتا کہ ایک سورت کو دو بار کیسے پڑھ لیا جاتا ہے۔" لیکن چوہدری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر مذہبی نوعیت کی تھی ورنہ یہ چوہدری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی ابل کے گھر

ہیں ہر شام کو گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا ایک سکورا اس التزام سے بھجوانا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہو گیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال سالن بھجوانے ہیں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چوہدری فتح داد بنفس نفیس مولوی ابل سے معافی مانگنے آتا۔ "آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا قبلہ! میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں چودھرائن ذرا بیمار تھیں اور کھانا نائن نے تیار کیا۔ وہ حرامزادی یہ بھول گئی کہ آپ کو یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہو گا۔"

یہ "وظیفے" مختلف نوعیت کے تھے اور جمعرات کو تو مولوی ابل کے ہاں نہ آٹا گندھتا تھا اور نہ ہنڈیا چڑھتی تھی۔ مولوی ابل کے عقیدت مندوں کے ہاں سے ایک درجن کے قریب بڑی جاندار روٹیاں آجاتی تھیں۔ اِدھر زیب النساء نے گھر میں لڑکیوں کو قرآن شریف کا درس دینے کا سلسلہ بیاہ کے تین مہینے بعد ہی سے شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو ہر لڑکی چھوٹے چھوٹے سے "وظیفوں" پر ذرا ذرا سی شکر رکھ کر لاتی تو زیب النساء کو دو چنگیریں ان کے لیے الگ رکھ دینا پڑتیں۔ اس روز دونوں وقت سب سیر ہو کر کھاتے۔ جو وظیفے باقی بچتے انھیں دھوپ میں سکھا لیا جاتا اور مہینے میں چار بار انھیں گڑ کے شربت میں ابال کر میٹھے ٹکڑے تیار کیے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی انسان کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لیے کپڑا بھی چاہیے۔ چوہدری فتح داد ہر نئی فصل پر مولوی ابل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا۔ لیکن جب بھی یہ پوشاک گھر میں آئی ایکا ایکی درزی کی دکان سج گئی زیب النساء، مہرن، زبیدہ اور شمسن کو پاس بٹھا کر لٹھے کے تہبند کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی اور یوں ننھوں کے بہت سے چولے نکل آتے۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ ایسا ہی برتاؤ ہوتا اور یوں چند مہینوں کے لیے مولوی کی اولاد بالکل ننگی ہونے سے بچ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے میں، یا نماز جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپے آنکلتے تو وہ مہر النساء کے جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دیئے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ رہے

تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا ـــــ زیب النساء کے کنگن جو کبھی اس کی سانولی کلائیوں میں کڑے رہتے تھے، اب ذرا سے جھٹکے سے پونہچے پر آجاتے تھے۔ اور اس کی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا بھوبھل سرد راکھ بن چکا تھا، اور جب وہ پلکیں جھپکتی تھی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اُڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی ابل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان بالکل پچی ہو کر رہ گیا تھا۔ انھی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی ابل کہا جانے لگا تھا۔ کنپٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانتوں پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں کی ریخوں میں سیٹیاں بج اٹھتی تھیں مگر آواز کا ٹھاٹھ وہی تھا۔ صحیح مخرج سے نکلے ہوئے حروف یوں بجتے تھے جیسے پیتل کی تھالی پہ بلور کی گولیاں گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں ایک لرزش سی ضرور آ گئی تھی، جو پرانے نمازیوں کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی لیکن چوہدری فتح داد کو اس ارتعاش کا سبب معلوم تھا کیونکہ مولوی ابل اس سے مہرالنساء کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے سلسلے بات کر چکا تھا۔ چوہدری نے اس مقصد کے لیے سارے گاؤں پر نظریں دوڑائی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا تھا، اور کئی نوجوان اسے جچے بھی تھے، مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی ابل کو سب جانتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ مہرالنساء سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے اور سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں خون کم ہوتا ہے اور آنسو زیادہ۔ پھر یہ بات بھی ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ اب مولوی ابل کو عیدین پر بیس پچیس روپے ملتے ہیں جن سے مہرالنساء کا جہیز تو کیا بنا ہوگا دوسرے نو بچوں کے لیے جوتا ٹوپی بھی شاید ہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چوہدری نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے جیسے پھول کی پتیوں میں سے اچانک بھڑ نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی ابل اور زیب النساء کی دعائیں رائگاں نہ گئیں۔ انھی دنوں سابقہ خدا یار اور حال نسیم احمد شہر سے گاؤں اُٹھ آیا اور یہاں کپڑے کی چھوٹی سی دکان کھول لی۔

خدا یار ایک حافظ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ والد کے مرنے کے بعد مولوی ابل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور جب مسیں بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے ہاں ملازم ہو گیا ہے، اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دکان کے سامنے گز بھر جگہ لے دی، جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدا یار کی بجائے شمیم احمد نام اختیار کر کے گاؤں آ گیا۔ اس نے بڑی منت خوشامد سے مولوی ابل کو مجبور کیا کہ وہی اس کی دکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز مولوی ابل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے کے لیے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس گیا۔ "عارف کی ماں! شمیم احمد کہتا ہے کہ وہ میری ہی بوہنی سے کاروبار شروع کرے گا۔ تم کہو تو مہرن کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا لے لیں، جہیز کے لیے ضرورت تو ہے ہی۔ ویسے سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی رسم ادا ہو گی۔ اس لیے ذرا سا رعب بھی بیٹھ جائے گا۔ پھر شمیم احمد کا دل رکھنا تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے، دوسرے حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا نورِ نظر ہے، تیسرے ——" مولوی ابل نے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا "عارف کی ماں، اللہ جل شانہٗ کی قسم، مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے اللہ جل شانہٗ نے اسے مہرن ہی کے لیے آسمان پر سے اتارا ہے۔"

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی راکھ ایک لمحے کے لیے تو بھوبھل میں بدل گئی "تمہارے منہ میں گھی شکر" وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چابی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی، صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر مولوی ابل کے سامنے رکھ دیا۔ "خدا تیری زبان مبارک کرے، میں تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پراٹھا توے پر دیر تک پڑے پڑے جلنے لگا

ہے!" وہ رونے لگی، ساتھ ساتھ مسکراتی بھی رہی، اور جب مہرالنسا کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بولا۔ "اٹھو بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں نا۔ وہاں ہنڈیا اُلٹ کر رکھ دو، ورنہ سب ٹکڑے کوؤں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤ میری بیٹی" ___ اور مہرالنسا کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں اماں۔ شمیم احمد کی دکان پر ابا میاں میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہرالنسا، باہر چلی گئی تو مولوی ابل نے ڈبے کی کل متاع تینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اُٹھتے ہوئے بولا: "دعا کرنا، مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لیے تو پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں۔"

زیب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی ابل شمیم احمد کی دکان کو چل دیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے، جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظریں رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہوں۔ مولوی ابل دکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں پر بچھ بچھ گیا۔ اور جب مولوی نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھول تھے اور نیلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے نقطے تھے۔ "ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو۔" مولوی ابل نے معمول سے زیادہ بلند آواز میں کہا، اور ایک نظر ہجوم کو بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی ابل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت میں ___ محض تحفۃً پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی ابل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا، صرف اپنی جیب میں ہاتھ ڈال لیا۔

شمیم احمد مارے احترام کے سمٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا، کھنکارا اور بولا "چھ روپے،

ر کے حساب سے بیالیس روپے ہوئے قبلہ!"

دکان میں سجے ہوئے سب تھان جیسے مولوی ابل کے دماغ پر دھب دھب گرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اُٹھ کر ناک، اور ناک سے ابھر کر ہوا میں جم کر رہ گئیں۔ مولوی ابل نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا "قبلہ نے یونہی قربانی ہے اس لیے میں نے نرخ میں کوئی رعایت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں، پھر تلافی کر دوں گا۔ انشاءاللہ تعالیٰ۔"

مولوی ابل کپڑے کو بغل میں لے کر اُٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد کو کہہ دے "اللہ جل شانہ، ہی تلافی کرے گا عزیزی شمیم احمد، اس لیے کہ اگر تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے۔" لیکن یہ تو ایک دم سے جیب کے خالی ہو جانے کا غبار تھا، جس پر اُٹھتے ہی اٹھتے اس نے قابو پا لیا اور بولا "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد، یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی! اللہ جل شانہ، تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے۔"

"آمین!" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین" زیب النسا نے کپڑے کی نرمی اور بے قراری اور پھبن کو دیکھ کر مولوی ابل کے ان الفاظ کے جواب کہا "اللہ کرے اس کپڑے میں ہماری مہرن کا سہاگ مہکے!"

چند ہی روز بعد ایک شام مولوی ابل کے دروازے کی زنجیر بجی۔ اس وقت آنے والے عموماً چاول یا حلوہ یا کھیر لانے تھے، اس لیے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے بچے ڈیوڑھی کی طرف لپکے، لیکن جانے مولوی ابل کو کیا سوجھی، خلاف معمول کڑک کر بولا "ٹھہرو" بچے رک گئے۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ عمدۃ النساء تو رو دی، مگر مولوی ابل ان کو دلاسہ دیے بغیر بڑی بے پروائی سے آگے بڑھا۔ جونہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک فوارہ سا امڈا اور ساتھ ہی آواز آئی "السلام علیکم قبلہ!"

یہ شمیم احمد تھا۔ مصافحہ کے لیے بڑھا تو لٹھے کا نیا تہبند ٹین کی طرح بج اٹھا اور جب اس نے

رک رک کر کہا "آپ کی خدمت میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں قبلہ۔ اس لیے آپ کو بے وقت زحمت دی۔" تو مولوی ابل کو شمیم احمد کی پوشاک سے اڑتی ہوئی مہک کچھ گنگناتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سنی جا سکتی تھی لیکن مولوی ابل گردن موڑ کر پکارا "میں ابھی آیا عارف کی ماں" اور پھر وہ شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے مسجد کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو نئے تہبند کا شور وغوغا روکنے کے لیے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند نمازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن سنا رہے تھے۔ دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا۔ یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا اور یہ اکتالیس اکتالیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لیے مخصوص تھا۔ شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی ابل پہلے حجرے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لایا، اور اندھیرے حجرے کے ایک گوشے میں چلا گیا۔ ڈیوٹ پر کڑوے تیل کا چراغ جل اٹھا۔ اس نے واپس جا کر لکڑی کو الاؤ میں پھینکا اور لپک کے شمیم احمد کے پاس آیا۔ شمیم احمد نے ان چند روز میں داڑھی نہیں منڈوائی تھی۔ گالوں اور گلے پر نہایت سلیقے سے خط بنے تھے اور داڑھی کے خشخشی بالوں پر عطر حنا دیے کی روشنی میں چکنے لگا تھا۔

"کہو۔" مولوی ابل کچھ اس انداز سے بولا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے مہمان کے لیے ایک ایوان کی آرائش و زیبائش سے فارغ ہوا ہے۔

شمیم احمد کی آنکھیں جھک گئیں اور ہونٹ ذرا سا کھل کر کانپنے لگے، پھر اس نے سر اٹھا کر چراغ کی طرف دیکھا، جس کی لو بے پناہ دھواں چھوڑ رہی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے تنکے سے چراغ کی بتی کو کم کیا اور بولا "آپ کی اجازت ہو تو عرض کروں۔"

"کہو کہو۔" مولوی ابل نے شمیم احمد کے کندھے کو تھپکا اور پھر چونک کر اس کے دوسرے کندھے پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔ شمیم احمد کے کندھے کی ہڈی پر گوشت کی اتنی بڑی گیندیں سی رکھی تھیں!

"رکھو نا عزیزم"

شمیم احمد نے اپنے ہاتھ ملنا شروع کیے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کوئی چیز بڑی مشکل سے نگلی اور بولا: اصل میں یہ کام تو میری اماں کا تھا۔ انہی کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہیے تھا، مگر پچھلے چند برسوں سے ان کا دل بہت کمزور ہو گیا ہے۔ بات بات پہ رو دیتی ہیں اور بُرا بھلا کہنے لگتی ہیں، سو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ہی حاضر ہو جاؤں۔"

"تم نے اچھا کیا" مولوی ابل نے بڑی شفقت سے کہا۔

"میں آپ کا پرانا خادم ہوں" شمیم احمد نے سمٹتے پھیلتے اور پھر سمٹتے ہوئے کہا۔ میری درخواست یہ ہے کہ حضور مجھے ہمیشہ کے لیے ــــ" اس نے ایک بار پھر چراغ کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر آستین پر سے کوئی خیالی دھبہ اڑا دیا ــــ "حضور مجھے ہمیشہ کے لیے اپنی غلامی میں لے لیں" شمیم احمد نے نزع کے سے عالم میں کہا۔

مولوی ابل کا جی چاہا کہ چٹکی بجا دے، رسماً ذرا ہنستے ہوئے بولا "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا شمیم احمد۔"

شمیم نے بڑی حیرت اور دکھ سے مولوی ابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ جس شخص نے قرآن مجید کے کئی مقامات اور فقہ کے بے شمار مشکل مسائل کو آن کی آن میں صاف اور سلیس انداز میں سلجھا دیا وہ "غلامی" کا مطلب نہیں سمجھتا۔ دبی دبی آواز میں جیسے اس نے نزع کی آخری ہچکی لی "جی میرا مطلب ہے کہ حضور ــــ حضور مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمالیں۔"

اور جیسے اس وضاحت سے مولوی ابل کی تسلی ہو گئی! اس نے مزید تشریح طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ شمیم احمد کچھ دیر تک نظریں جھکائے کھڑا ہاتھ ملتا اور مروڑتا رہا، اور جب مولوی ابل ایک لفظ تک نہ بولا تو اس نے اپنی نظروں کو جیسے دونوں ہاتھوں سے بصد مشکل اٹھا کر بے انتہا جھجک سے اوپر دیکھا۔ مولوی ابل کی داڑھی پر آنسوؤں کے قطرے

رک گئے تھے۔شمیم احمد کی داڑھی پر عطر چمک رہا تھا اور مولوی ابل کی داڑھی میں آنسو جگمگا اور تھرتھرا رہے تھے اور چراغ کی لو پھر ڈھیروں دھواں اُگلنے لگی تھی، مگر اب کے شمیم احمد کو بتی کم کر دینے کا خیال نہ آیا۔ وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب ہو گیا مگر صرف ہونٹوں کو کھول کر رہ گیا۔

مولوی ابل نے ایکا ایکی جیسے کچھ سوچ کر پگڑی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پھر بھرّائی ہوئی آواز میں بولا "لڑکی تیری کتنی مسکین مخلوق ہے اللہ جل شانہٗ! ـــــ کتنی مسکین!" اس کی آنکھوں سے بہت سے آنسو ایک ساتھ نکلے اور داڑھی کے بالوں نے انھیں پرو لیا۔ "دینے کا مال ہے شمیم احمد! دوں گا۔ کیوں نہیں دوں گا؟ دینا ہی پڑے گی۔ اور پھر تم تو میرے اپنے عزیز ہو، بھائی حافظ عبدالرحیم مرحوم و مغفور کا بیٹا میرا اپنا بیٹا ہے ـــــ آؤ، ادھر آؤ" ـــــ اور مولوی ابل نے شمیم احمد کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

جب وہ واپس گھر میں آیا تو زیب النساء نے چند قدم کے فاصلے پر سے ہی کہہ دیا "کہاں سے آرہے ہو؟ عطر کی لپٹیں آنے لگی ہیں۔"

مہرالنساء توے پر آخری روٹی ڈالے بیٹھی تھی، بولی "سچ ابا جی، سارا گھر مہک اٹھا ہے۔"

"کیا بات ہے" زیب النساء نے پوچھا۔

مولوی ابل نے بڑی آسودہ خاطری سے بچوں کی قطار کی طرف دیکھا۔ وہ خالی ہاتھ گھر میں آیا تھا اس لیے سب کے منہ لٹکنے لگے تھے، سب کو ایک ساتھ پیار کرنا مشکل تھا اس لیے بولا۔ "آج میرے سب بچوں کو روٹی کے ساتھ گڑ کا ایک ایک ٹکڑا بھی ملے گا۔" لٹکے ہوئے چہرے سنبھل اور سنور گئے اور مہرالنساء کی نظریں توے پر گڑ گئیں۔

"بات سنو عارف کی ماں۔" مولوی ابل باہر جاتے ہوئے بولا۔

زیب النساء نے سب حالات سن کر کہا "میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو۔"

مولوی ابل چمکا "اللہ جل شانہٗ کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں۔ اب تو اپنے سر کی قسم دیتی ہے تو نعوذ باللہ کیا تو اللہ جل شانہٗ سے بڑی ہے؟ کاش عورت کی عقل

یہاں کہیں کھوپڑی کے آس پاس ہوتی!" اور اس نے مسکرا کر زیب النساء کے تالو پر ایک چپت جڑ دی۔

زیب النساء بچوں کی طرح رونے لگی۔ وہ ان آنسوؤں کا مطلب سمجھتا تھا وہ بھی تو کچھ دیر پہلے ایسے ہی آنسو گرا چکا تھا۔ ایک لمحے کے بعد وہ آگے بڑھا اور زیب النساء کے بھیگے بھیگے گالوں پر اپنی داڑھی رکھ دی۔

"دعائیں یوں قبول ہوتی ہیں عارف کی ماں" مولوی ابل برسوں کی عبادت و ریاضت کا جلال چہرے پر لا کر بولا "الحمد للہ! یوں سنتا ہے سننے والا، یوں دیتا ہے چھپر پھاڑ کے سنتی ہو زبین" آج مولوی ابل نے سہاگ رات کے بعد شاید پہلی بار زیب النساء کو عارف کی ماں کے بجائے زبین کہہ کے پکارا تھا۔

زیب النساء آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "جب شمیم احمد خدا یار تھا جب وہ لڑکا تھا اور تمہارے پاس پڑھتا تھا تو یوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا تھا ہرن کو جیسے ــــ کبھی کبھی تم مجھے دیکھ لیتے ہو ــــ اللہ قسم"۔

اور ابھی میاں بیوی آنسوؤں کو اچھی طرح خشک بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک بار پھر دروازے کی زنجیر بجی، بچے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔

"ٹھہرو" اب کے مولوی ابل کی آواز میں ڈانٹ نہیں تھی "میں جاؤں گا"۔ پھر بچوں کے پاس آ کر ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا "ندیدہ پن بہت برا ہوتا ہے۔ سمجھے؟ ہر آنے والا حلوہ اور چاول دینے نہیں آتا۔ کئی لوگ دوسرے کاموں کے لیے بھی آ نکلتے ہیں۔ سمجھے؟ جاؤ"۔ پھر ذرا بلند آواز میں بولا "انھیں باہر سردی میں نہ نکلنے دو ہرن بیٹی، یہی بچے تو میری زندگی کا سرمایہ ہیں"۔

وہ ڈیوڑھی کی طرف بڑھا۔ دروازہ کھولا تو گرم چادر میں لپٹے ہوئے چوہدری فتح داد نے ہاتھ بڑھا کر مولوی ابل کو باہر گلی میں گھسیٹ لیا اور چھاتی سے لگا کر بولا "مبارک ہو قبلہ! ہزار بار

مبارک ہو، آخر میری کوششیں بیکار نہیں گئیں۔"

اس وقت مولوی ابل کی نظروں میں چوہدری فتح داد کے فرشتہ بننے میں بس پروں کی کمی رہ گئی تھی۔"اللہ جل شانہ، کا شکر اور آپ کا احسان ہے۔" اس نے چوہدری سے بڑے پگھلے ہوئے سیال لہجے میں کہا۔

"خدا نے مجھے آپ کے سامنے سرخرو فرما دیا۔" چوہدری فتح داد بولا "اب جلدی سے شادی کی تاریخ بھی طے کر لیجیے۔ شمیم احمد اچھا لڑکا ہے، پر آخر جوان لڑکا ہے اور پھر دکاندار ہے۔ دن میں بیسیوں عورتیں اس کی دکان پر آتی ہیں، اور آپ جانتے ہی ہیں کہ کیسا ننگا زمانہ آ لگا ہے۔ لڑکے لڑکیاں بارود کے گولے ہو رہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کب پڑے پڑے بھک سے ہو جائیں، شمیم احمد کو میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ رسم و رواج کے مطابق اس کی ماں آپ کے گھر میں آتی مگر بڑھیا سٹھیا سی گئی ہے۔ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہو تو سات پشتیں تو م ڈالتی ہے کمبخت۔ ابھی ابھی شمیم احمد نے آکر بتایا کہ آپ نے حامی بھر لی ہے۔ میں نے اسے جلدی سے شادی کر لینے پر زور دیا تو بولا کہ آپ ہی قبلہ مولوی صاحب سے تاریخ کا فیصلہ کرا دیجیے، سو میں اسی لیے حاضر ہوا۔ آپ کل تک سوچ لیجیے اور یہ ــــ یہ ــــ، چوہدری فتح داد نے گرم چادر کے نیچے سے ایک پوٹلی سی نکالی ــــ "یہ میری بیٹی کو دے دیجیے گا۔"

مولوی ابل نے خاموشی سے پوٹلی لے لی تو چوہدری نے آہستہ سے کہا "اللہ قبول فرمائے۔"

"آمین۔" مولوی ابل کے منہ سے عادتاً یہ لفظ نکل گیا۔

مولوی ابل نے اندر آکر پوٹلی کھولی تو ایک بڑے سے ریشمی رومال میں سو کے ایک نوٹ پر سونے کے دو جھمکے رکھے تھے، جن کی بڑے سے بلبلے جتنی کٹوریوں میں جانے نگینے جڑے تھے یا مینا کاری کا کام تھا!

زیب النساء کسی اور چیز کی امید میں رومال کو جھاڑ کر چہکی "شمیم احمد نے بھیجے ہیں ؟"
اور ابھی مولوی ابل جواب نہیں دینے پایا تھا کہ مہر النساء بھاگ کر باہر نکل گئی۔

"ارے!" مولوی ابل نے حیرت سے زیب النساء کی طرف دیکھا اور پھر دونوں ایک ساتھ بے اختیار ہنس پڑے!

"سمجھ گئی!" زیب النساء باہر دیکھتے ہوئے انگشتِ شہادت کو ناک کی کیل پر رکھ کر بولی۔
"تم نے بھی تو منہ بھر کر کہہ دیا ——— شمیم احمد نے بھیجے ہیں ——"

مولوی ابل نے زندگی میں شاید پہلی بار عورت کی آواز اور انداز کی نقل اتاری، اور بچے جو ابھی تک محض حیرت زدہ تھے محظوظ ہو کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ عمدۃ النساء ڈرتے ڈرتے جھمکوں کی کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"چوہدری فتح داد دے گیا ہے مہر ن کے لیے،" مولوی ابل نے بڑی بے پروائی اور روا روی میں راز فاش کیا۔

"اللہ قبول فرمائے،" زیب النساء جیسے اپنی قبر میں سے بولی جس پر نیا نیا غلاف چڑھایا گیا تھا۔

چند ہی روز میں مہر النساء مایوں بٹھا دی گئی۔ اس کے پیروں میں مہندی تھوپ دی گئی۔ ڈھولک تو خیر نہ بجی، کیونکہ شادی کا گھر بھی پر آخر مولوی ابو البرکات کا گھر تھا جس نے حضورِ پُر نور صلعم کی مدینہ میں تشریف آوری پر مدینے کی لڑکیوں کے دفیں بجا بجا کر گانے کے متعلق تو پڑھا تھا مگر ڈھولک کا جواز کہیں موجود نہ تھا، اور یہ پنجاب اتنا بد نصیب تھا کہ یہاں اب تک دف کا رواج ہی نہیں چلنے پایا تھا۔ "دف ہو تو لاؤ اور بجاؤ اور گاؤ۔ تم ڈھولک لائیں تو میں اسے اٹھا کر چھت پر پھینک دوں گا،" مولوی ابل نے میراسنوں کے ہجوم سے ڈانٹ کر کہا تھا۔ آخر گاؤں کی لڑکیاں مہر النساء کو اپنے دائرے میں لے کر بیٹھ گئیں اور ڈھولک کے بغیر ہی اپنی سریلی الاپوں سے رات بھر اس کے گرد محبت اور دوستی

پھوپوں اور پھواروں، ملاقاتوں اور جدائیوں کے طلسمات بُنتی رہیں۔

لیکن بھلا شمیم احمد کو ڈھول شہنائی بجوانے اور گمرے چھوڑنے سے کون روکتا۔ برات ایسی دھوم سے آئی اور مولوی ابل کی ڈیوڑھی میں وہ ہنگامہ مچا کہ معلوم ہوتا تھا ڈھول کی ہر چوٹ مولوی ابل کے کچے گھروندے کی بنیادوں پر پڑ رہی ہے۔

یہ دھوم دھڑکا دیکھ کر رات ہی رات مولوی ابل اور زیب النساء نے مکان کے ایک گوشے میں چند سرگوشیاں کیں۔ لڑکیوں کے گیتوں کے درمیان بکسوں کے کھٹنے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں رینگتی رہیں، اور جب دوسرے دن صبح کو جہیز کا سامان آنگن اور چھت پر بچھایا گیا تو گاؤں کا گاؤں پہلی نظر میں تو تیورا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کپڑے تو خیر بن ہی جاتے ہیں پر یہ سونے کے اتنے بڑے بڑے جھمکے!

"مولوی کے پاس دستِ غیب کا تعویذ ہے" کسی نے رائے دی۔

ایک بڑھیا نے ٹھوڑی کی لٹکتی ہوئی جھلّی میں انگلی ڈبو کر کہا "کپڑوں کے کئی جوڑے تو ان گنہگار آنکھوں نے پہچان لیے ہیں، کچھ تو بے چاری مرنے والیوں کے ہیں، کچھ ایسے ہیں جو بی بی زیب النساء کو اپنی شادی پر ملے تھے۔ سگھڑ ہے اس لیے اولاد کے لیے رکھ چھوڑے، یہ کنگن اور یہ ناک کی کیل، یہ سب کچھ بی بی ہی کا ہے۔ پر یہ جھمکے؟" اور اس نے اپنی انگلی کو ٹھوڑی کی جھلّی میں سے نکال کر آسمان کی طرف بلند کر دیا۔

مہرالنساء کو ڈولی میں بٹھایا گیا تو اکنیوں اور چھوہاروں کی ایک لہر سی اس پر سے نچھاور ہو گئی۔ گاؤں کے بچے ان پر جھپٹے۔ مولوی کے بچے جو ڈیوڑھی میں ماں باپ کی دیکھا دیکھی رو رہے تھے، ایک دم یوں اُچھلے جیسے ان کے قدموں تلے لچکدار کمانیاں بھر آئی ہیں۔ "ٹھہرو" مولوی ابل گرجا۔ کمانیاں دھرتی میں اتر گئیں۔ بچے جہاں تھے وہیں تھم گئے۔ صرف عارف ایک اکنی کو اپنے پنجے تلے چھپائے کھڑا رہا اور برات کے چلے جانے کے بعد ہی اس کا یہ اثاثہ اس کے پاؤں سے ہاتھ تک کی مسافت طے کر سکا۔

مولوی ابل کچھ دور تک ڈولی کے ساتھ گیا۔ اس کی ناک اور آنکھیں سرخ تھیں مگر ان کے ساتھ چہرے کی زردی ضروری تھی اور مولوی ابل کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دکھ اور اطمینان نے چہرے کی سرزمین کو اپنے اپنے مظاہروں کے لیے بانٹ لیا ہے۔ ایک موڑ پر جا کر وہ رک گیا اور دور تک ڈولی پر پڑے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک لمبی گہری سانس لے کر اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر چٹخایا اور پلٹ کر گھر جانے لگا

گلی میں گاؤں کے بچے اب تک اکنیاں اور چھوہارے ڈھونڈ رہے تھے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑے ہوئے عارف اور دوسرے بچوں نے اپنے ابا کو دیکھا تو ایک آن میں بھوتوں کی طرح غائب ہو گئے۔ مولوی ابل کے ہونٹوں میں دیر سے جو سوزش اور کھجلی ہو رہی تھی وہ مسکراہٹ بن کر نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں تک پھیلتی چلی گئی۔ ڈیوڑھی میں داخل ہونے لگا تو اسے دیوار سے لگی ہوئی ایک اکنی چمکتی دکھائی دی لیکن وہ بڑی بے پروائی سے آگے بڑھ گیا۔ زیب النسا شاید کواڑ ہی سے لگی کھڑی تھی۔ مولوی ابل کا ہاتھ پکڑ کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگی اور پھر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جب آنگن میں آئی تو دونوں ہاتھوں سے بڑے سے دائرے بنا کر بولی

"ہمارے لیے تو بس یہ قبرستان کا سا سناٹا چھوڑ گئی ہماری جھرن۔"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔" مولوی ابل نے اپنی مسکراہٹ کو اور پھیلایا "جھرن چلی گئی تو کیا زبدہ کو بھی لے گئی؟ اور کیا شمسن بھی اس کے ساتھ چلی گئی؟" پھر ذرا رک کر بولا "عارف میاں! زبدہ کیا کر رہی ہے؟"

"جی رو رہی ہے۔" عارف دیوار سے لگے ہوئے بچوں کی قطار میں سے نکل کر بولا۔

"کہاں؟" مولوی ابل نے پوچھا۔

"جی جہاں جھرن آپا مایوں بیٹھی رہیں۔" عارف بولا۔

"زبدہ۔" مولوی ابل پکارا۔ زیب النساء مسلسل روئے جا رہی تھی۔

زبدہ دروازے پر نمودار ہوئی۔ نیا گلابی دوپٹہ آنسوؤں کی نمی کے سبب جگہ جگہ سیاہی مائل سرخ پڑ گیا تھا اور زبدہ نے اپنے جن مہندی رچے ہاتھوں کو صبح اٹھ کر گھی سے چمکایا تھا ان پر جگہ جگہ مٹی جم رہی تھی اور بالوں کی مینڈھیاں اجڑ رہی تھیں اور—

مگر مولوی ابل تو زبدہ کو دیکھتے ہی سناٹے میں آ گیا تھا مسکراہٹ ہونٹوں میں سمٹ کر یوں پھڑپھڑانے لگی تھی جیسے دم توڑ رہی ہے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ زبدۃ النساء چند قدم پر آ کر رک گئی اور سسکیوں میں رونے لگی۔

اور پھر مولوی ابل نے زیب النساء کے ہاتھ کو ہاتھ میں جکڑ لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جا کر یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہے" عارف کی ماں اِستو، یہ زبدہ تو جوان ہو گئی ہے!"

اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں مہرن کے عقب میں بیٹھی پلتی بڑھتی رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد مولوی ابل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور دم بخود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔" فکر نہ کرو بیوی، اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر ہے۔"

زیب النساء نے مولوی ابل کا ہاتھ کسی قدر سختی سے اپنے کندھے پر سے گرا دیا۔" شرم کرو۔ پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے آئے، اب کندھا سہلا رہے ہو۔ جوان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے ——" زیب النساء نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا ہی کندھا اچکا دیا۔

مولوی ابل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پکارا،" شمس!"

شمس النساء قطار میں سے نکلی ہی تھی کہ مولوی ابل نے جیسے سہارا لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا نہ پا کر ٹوٹی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے تلوے ایک دم چپٹے چپٹے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح اس کے پاؤں میں بھی لہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو

چھوتی تھی، پھر تلوے کا خم جھلکتا تھا اور اس کے بعد پنجے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری باری جیسے لچک لچک کر دھرتی کو چھوتی تھیں، تب جا کر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔

"کچھ نہیں بیٹی، کچھ نہیں، جاؤ۔" مولوی ابل تیزی سے ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

شمس النسا، حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔

اور زیب النسا، زار و قطار روتی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ زبدہ اور شمسن اس کی طرف لپکیں۔

مولوی ابل نے باہر جا کر چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دیوار کے قریب سے چمکتی ہوئی اکنی اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔

گھر میں کل دو ہی بکس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں قرآن اور عمدہ کی گڑیاں اور دوسرے ننھوں کی بلور کی گولیاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری سکول بھی کھل گیا تھا اس لیے اب کلام پاک کا درس لینے والی لڑکیوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی، اور اسی لیے سوکھے ٹکڑے اب ہفتے کی بجائے پندرہ روز کے بعد آیا لے جانے لگے تھے۔ نمازیوں کو بھی زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ بعض وقت تو مولوی ابل اذان دے کر وہیں بیٹھ جاتا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اُٹھ کر اندر مسجد میں آتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ پر جب چند کسان جمع ہو جاتے تو بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور علمائے دین کی خدمت کی برکات کا تذکرہ کرتا اور کہتا "تمہیں یاد ہو گا کہ کوئٹے میں زلزلہ آیا تھا! کیوں آیا تھا؟ ترکی میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو زمین نگل گئی! کیوں نگل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے ہیں! کیوں ہو رہے ہیں؟ کیوں؟ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا تم کیوں سوچو، تمہیں تو گندم کے خمار نے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ قہر الٰہی ہے۔ یہ آثار قیامت ہیں۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتار دو گے؟ بتاؤ! بتاؤ!——" اس قسم کے

جذباتی خطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا سا اضافہ ہوتا اور ایک دو روز تک گھی لگے وظیفے آنے لگتے۔ پھر وہی سناٹا عود کر آتا جس میں زبدہ کی آنکھیں چمکتیں، شمسن کا جسم لچکتا، ٹین کے خالی بکسوں میں سوکھے ٹکڑے اور بچوں کے بلوری بنٹے بجتے اور تالیاں بجاتے اور قمرن کی گڑیاں ننگی ہو ہو کر ایک دوسرے میں گھسی پڑتیں۔

مولوی ابل کے دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے، اللہ جل شانہٗ اور چوہدری فتح داد۔ اللہ جل شانہٗ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی ابل اور زیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد زندہ تھی، اور مہرالنساء کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہوا تھا کہ زبدہ اور شمسن کے لیے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ لیکن مولوی ابل جس شدت سے مہرالنساء کے بر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اسی شدت سے وہ زبدۃ النساء اور شمس النساء کے لیے آنے والے پیاموں سے متنفر تھا۔ ابھی تو کل کی بچیاں ہیں بھئی۔ ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں شمسن نے تو ابھی تک قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔ میں ذرا ذرا سی پونی ایسی بچیوں کو کس دل سے اٹھا کر پرائے گھر میں پٹخ آؤں؟ زبان وبان نہیں دوں گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔"

"دیکھا جائے گا!" وہ زیب النساء سے زبدہ اور شمسن پر بے تحاشا آئی ہوئی جوانی کی اطلاعیں پا کر کہتا "اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے گا۔ توکّل بڑی چیز ہے عارف کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ جل شانہٗ پر توکّل کرتا ہے۔ توکّل نہ کرے تو بیج وہیں مٹی میں مٹی ہو کر رہ جائے۔ یہی توکّل بیج کو سینچتا ہے اور دھرتی کو چیر کر پودا نکالتا ہے، اور سبز پتیوں کی کوکھ میں بالیوں اور بھٹوں کو پروان چڑھاتا ہے، سمجھیں عارف کی ماں؟"

"پر کسان بیج تو بوتا ہے نا!" زیب النساء بحث کرتی "تم نے کیا کیا ہے؟"

"الحمد للہ" مولوی ابل کہتا "میں نے بہت کچھ کیا ہے۔ میں نے ہر نماز کے بعد دعائیں مانگی ہیں!"

اور زیب النساء لاجواب ہو جاتی۔

دعاؤں کے بعد مولوی ابل کا ذہن چوہدری فتح داد کی طرف منتقل ہو جاتا۔ آج کتنے برسوں

سے اس خدا ترس انسان نے اس کے گھر میں ہر شام کو وظیفہ بھجوایا تھا، اور کتنی پابندی سے ہر فصل پر مولوی ابل کو پوشاک پہنائی تھی، اور لطف کی بات یہ ہے کہ دوسروں کی طرح ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ لیکن اب چند روز سے چوہدری فتح داد بیمار رہنے لگا تھا۔ ایک بوڑھے نائی نے جو عرصے سے جراحی کا کام کر رہا تھا، چوہدری کی ریڑھ کی ہڈی کے پھوڑے کے آس پاس کچھ ایسی نشتر زنی کی کہ یہ پھوڑا شام تک سوج کر پھوٹ پڑا اور بہنے لگا۔ ساتھ ہی چوہدری کو لرزے کے بخار نے آلیا اور علاقے کے حکیموں کا تانتا بندھ گیا۔ ان دنوں مولوی ابل کے گھر پر مردنی چھائی رہتی۔ ایک تو مہرالنساء سے اس کی ساس کا برتاؤ سوہانِ روح تھا، اس پر چوہدری فتح داد کی علالت! بچے کسی وقت شور مچاتے تو مولوی ابل چیخ اٹھتا "چپ رہو نامرادو! اُدھر چوہدری فتح داد بیمار پڑا ہے اور اِدھر ہنس کھیل رہے ہو، ناشکرو! یہ چوہدری نہ ہوتا تو آج تک ہم میں سے آدھے آدمی تو فاقوں سے مر گئے ہوتے۔ اللہ جل شانہٗ کے حضور میں اس کی صحت کی دعا کرو بدبختو!"

مولوی ابل ان دنوں ہر روز صبح و شام چوہدری فتح داد کے ہاں مزاج پرسی کو جاتا، مگر وہاں عیادت کرنے والوں کے ہجوم میں کبھی کوئی گھر کی بات نہ ہو سکی۔ بس اتنا ہوتا کہ مولوی ابل کو دیکھ چوہدری تعظیماً اُٹھنے کی کوشش کرتا اور پھر کراہ کر اسی طرح منہ کے بل گر جاتا۔ "دعا فرمائیے قبلہ" وہ آہستہ سے کہتا اور مولوی ابل آنسو لا کر آسمان کی طرف انگلی اُٹھاتا اور کہتا "وہی شافیِ مطلق آپ کو صحت کلی عطا فرمائے گا" ——— لیکن ایک روز جب مولوی ابل چوہدری کے ہاں گیا تو وہاں سوائے اُس کے ایک بیٹے کے اور کوئی نہ تھا۔ چوہدری کی طبیعت بھی خلاف معمول سنبھلی ہوئی تھی۔ آج وہ حسب عادت تعظیماً کچھ اٹھا لیکن کراہا نہیں لڑکے کو اشارہ کر کے باہر بھیج دیا اور بولا: "بیٹیاں کیسی ہیں قبلہ؟"

"الحمدللہ۔ اچھی ہیں۔ دعا گو ہیں۔" مولوی ابل نے جواب دیا۔

"سنا ہے بہت پیغام آ رہے ہیں؟" چوہدری نے پوچھا۔

مولوی ابل ابھی تک یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ لڑکیوں کے پیغام طرفین کے درمیان سربستہ رازوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جوانی کا ڈنکا پٹتا ہے تو کوئی راز راز نہیں رہتا۔ چونک کر بولا "جی ہاں بہت آرہے ہیں۔"

"پھر؟ کوئی فیصلہ فرمایا آپ نے؟" چوہدری مسلسل مولوی ابل کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

مولوی ابل گھبرا سا گیا۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر محسوس کیا کہ اچانک تالو، زبان اور حلق خشک ہو گئے ہیں۔ کچھ نگل کر بولا "جی فیصلہ میں کیا کروں۔ یہ تو اللہ جل شانہٗ کرے گا۔ جس خالی ڈھنڈار گھر میں خلال کے لیے تنکا تک نہ ملے وہاں بیٹیوں کے رشتے کون طے کرتا پھرے۔"

"تو قبلہ کیا میں مر گیا ہوں؟" چوہدری فتح داد کی آواز میں بھراہٹ تھی۔

"آپ کے دشمن مریں۔" مولوی ابل فوراً بول اٹھا "آپ اللہ جل شانہٗ کے فضل سے تندرست ہو جائیں تو پھر بیٹھ کر طے کریں گے۔"

"جی ہاں" چودھری نے ہمدردانہ انداز میں کہا "فوراً طے ہونا چاہیے۔ گھر میں جوان لڑکی بیٹھی ہو تو ایک ایک دن ایک ایک صدی بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب سامان کر دے گا ——— وظیفہ تو باقاعدہ پہنچ رہا ہے نا؟"

"جی ہاں" مولوی ابل نے جواب دیا "باقاعدہ۔"

"اللہ قبول فرمائے۔" چوہدری فتح داد نے آہستہ سے دعا کی۔

"آمین۔" مولوی ابل نے عادتاً اس دعا کی تائید کر دی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، چوہدری ذرا سا کراہا۔ پھر بولا: "سنا ہے بیٹی مہر النساء اور شمیم احمد کی خوب نبھ رہی ہے، پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی۔"

"جی ہاں" مولوی ابل نے بڑے دکھ سے کہا "لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دی جائے تو پرائی ہو جاتی ہے۔"

"پر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟"

"بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے۔ تو کنگلی ہے، تو سوکھے ٹکڑوں پر پلی ہے، تیرے کپڑوں سے کفن کی بو آتی ہے، تو اپنے ساتھ کیا لائی ہے؟ وہی عورتوں کی باتیں۔"

"ہوں" چوہدری فتح داد کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا، پھر بولا "بیٹی پرائی نہیں ہو جاتی قبلہ! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ اسے ان طعنوں کا موقع ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہرالنسا کو کنگلی کہتی ہے نا؟ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہوگا تو اس کے لیے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی ٹوپیاں اور سونے کے گنگھروؤں والے کنگن بھیج دیجیے اور پھر دیکھیے کس طرح بیٹی کا مان بھی بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟"

ٹھیک ہے، مولوی ابل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے، مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی ابل کا وہاں دیر تک پچھلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زیب النسا سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا، اور زیب النسا نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی، اسے معلوم تھا کہ مولوی ابل بیٹیوں کے پیٹوں کو ٹٹولتے پھرنے کے سخت خلاف ہے

مولوی ابل ڈیوڑھی ہی سے پکارا "عارف کی ماں!"

زیب النسا بھاگی آئی "خدا خیر کرے، کیا ہوا؟ چوہدری کیسا ہے؟"

"اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا" مولوی ابل بولا "عارف کی ماں! سنو مہرن بیٹی کیسی ہے؟"

زیب النسا چونکی "تمہیں کس نے بتایا؟"

"کب تک ہوگا؟" مولوی ابل آج تو آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"بس اللہ چاہے گا تو آج کل میں" زیب النسا جھینپ کر بولی "پر تمہیں کس نے بتایا؟"

مولوی ابل تقریر کے سے انداز میں بولا "بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو ساس

کے طعنوں تشنعوں سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں۔ ہم اپنے نواسے نواسی کے لیے بہت سا——"

"اللہ کرے نواسہ ہو" زیب النساء نے مولوی ابل کی بات کاٹ دی۔

"جو کچھ بھی ہو،" مولوی ابل نے ٹوٹے تار کو جوڑا "ہم بچے کے لیے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کھینچ لیں گے ہمیشہ کے لیے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے؟" زیب النساء نے پوچھا۔

"توکل عارف کی ماں، توکل" مولوی ابل کے ذہن میں چوہدری فتح داد کا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا "اللہ جل شانہ پر تکیہ کرو" خود مولوی ابل کو اس وقت چوہدری پر تکیہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النساء نے برقع اوڑھا، عارف کو ساتھ لیا اور مہر النساء کے ہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی "جاگ رہے ہو عارف کے ابا!"

"ہاں عارف کی ماں۔ کیوں؟" مولوی ابل نے لحاف میں سے سر نکالا۔

"بڑی تکلیف میں ہے مہرن بیٹی شمیم احمد رو رہا تھا بے چارہ۔ شاید کل تک۔ ہو جائے گا۔" زیب النساء نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔

"سچ اماں؟" زبیدہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"ارے؟" مولوی ابل اور زیب النساء حیران رہ گئے اور پھر اس موضوع پر مزید اظہار رائے کے بغیر ہی سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی جب بیٹی مارے درد کے چیختی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولوی ابل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے ہاں بیٹا ہوا تھا۔ سارا گھر جاگ اٹھا اور جب کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی

مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی ابل زیب النساء کے پاس آیا "اب کیا ہوگا؟"

"چوہدری کیسا ہے؟" زیب النساء نے پوچھا

"اللہ جل شانہ ہی رحم فرمائے" مولوی ابل نے کہا۔

زیب النسا اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ "طلائی ٹوپیوں اور سونے کے کنگنوں کو تو جھونکو بھاڑ میں۔ میں تو کہتی ہوں اگر ریشم کا ایک ایک جوڑا جیتی ہی بنوالیں تو ناک رہ جائے۔ کوئی سبیل ہے؟"

"سبیل؟" مولوی ابل سوچ میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا "تمہاری عقل بھی تو ایڑی میں ہے۔ اور جانے وہاں بھی ہے کہ نہیں۔ سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے لتے اور گہنے پاتے یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلے بھی جہیز میں دے ڈالے آخر ایک بھوکے مرجھلے امام مسجد کی بیٹی کا بیاہ تھا، وہ کوئی نواب زادی تو تھی نہیں کہ کوئی انگلی دھرتا۔ اب ہاتھ بھر لونڈا پیدا ہوا ہے تو اس کے لیے دو ہاتھ کپڑا موجود نہیں اور پوچھتی ہے کوئی سبیل ہے؟ ___ نہیں ہے کوئی سبیل، کفن بھی تو نہیں کہ اٹھا کر نواسے کو پہنا دیتا۔"

"بکنے کیوں لگے؟" زیب النسا بھی غصے میں بولی "کفن پہنیں اس کے دشمن۔ اللہ وہ سہرے باندھے۔ اب یہ تو مجھ سے نہیں ہوگا کہ خالی ہاتھ مٹکاتی مہرن کے پاس جاؤں اس کی کمینی ساس کے سامنے، اور زبانی زبانی صدقے قربان ہو کر واپس آجاؤں لعنتوں کی گٹھڑی اٹھا کر۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہوگا، جینا اجیرن ہو جائے گا میری بیٹی کا۔ ساس ناک میں دم کر دے گی۔ آنکھیں نہیں اٹھ سکیں گی کسی کے سامنے، زبیدہ اور حسن کو بھی کوئی نہیں پوچھے گا۔ سب کو پتہ چل جائے گا کہ جو کچھ تھا وہ ایک دم اگل بیٹھے اور اب وہی سوکھے ٹکڑے توڑتے پھرتے ہیں، ساری عمر کنواریاں بیٹھی رہیں گی۔"

"بیٹھی رہیں۔" مولوی ابل طیش میں آ گیا "اب کہو تو سر پھوڑ ڈالوں اپنا۔ کہہ جو دیا کہ میرے پاس کفن تک نہیں اور تو ریشم کا کپڑا مانگتی ہے؟ کچھ نہیں میرے پاس، سمجھیں؟ میرے پاس کچھ بھی

نہیں،" مولوی ابل باہر نکل گیا۔

زیب النساء کچھ دیر تک اس خیال سے چپ چاپ بیٹھی رہی کہ وہ آنگن میں کچھ دیر ٹہل کر اندر آجائے گا، مگر جب ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز آئی تو وہ بلبلا کر رو دی، اور زبیدۃ النساء اور شمس النساء تڑپ کر بستروں میں سے نکلیں اور بلکتی ہوئی اپنی ماں سے لپٹ گئیں۔

مولوی ابل سیدھا مسجد میں گیا۔ وضو کر کے دیر تک تہجد پڑھتا رہا۔ پھر صبح کی اذان دے کر کلام پاک کی تلاوت شروع کر دی۔ چند نمازی آئے تو جماعت کرائی اور سورج طلوع ہونے پر گھر آیا تو زیب النساء اسی جگہ بیٹھی اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے دیوار کو گھورے جا رہی تھی، اور زبیدہ اور شمس اس کے پاس گٹھڑیاں بنی ہوئی پڑی سو رہی تھیں۔ وہ مجرموں کی طرح چپکے سے اپنی چارپائی تک گیا اور یوں بے حس و حرکت بیٹھ گیا جیسے اُسے تصویر اتروانا ہے۔

زیب النساء کی نظریں دیوار سے اتر کر زمین پر جم گئیں۔ مولوی ابل کی نظروں نے ان کا تعاقب کیا مگر مڈبھیڑ نہ ہو سکی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے زور کی ایک آہ بھری۔ اب زیب النساء سے نہ رہا گیا، فوراً اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مولوی ابل کے ہونٹوں پر مری مری مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس کی آنکھوں نے کہا "ادھر آؤ۔"

"زیب النساء اُٹھ کر اس کے پاس گئی۔ اب مولوی ابل موم ہو چکا تھا۔

"کہاں چلے گئے تھے؟" زیب النساء نے بڑی پیار بھری شکایت کی۔

"مسجد میں" مولوی ابل نے بچوں کی طرح جواب دیا۔

"کیوں گئے تھے؟"

"کیوں جاتے ہیں؟"

"کچھ سوچا؟"

"ہاں!"

"کیا سوچا؟"

"یہی کہ صبح ہو گئی ہے۔ تمہیں تو ماں ہونے کے سبب رات ہی کو مہرن کے ہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ رات کو نہ جا سکیں تو اب اس وقت تو تمہارا جانا بہت ضروری ہے۔"

"خالی ہاتھ؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"یہی تو سوچ رہا ہوں۔ تم نے کیا سوچا؟"

"یہی۔"

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

"سنو،" زیب النساء بولی "کہیں سے دس روپے قرضہ مل جائے گا؟"

مولوی ابل نے بھویں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہونٹوں کو سکیڑ کر زمین کو گھورا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ یوں آہستہ آہستہ اٹھا جیسے کمر ٹوٹی ہوئی ہے۔ تھکے ہوئے لہجے میں بولا "ابوالبرکات کو کون عقل کا اندھا قرضہ دے گا عارف کی ماں۔ مجھے سب لوگ بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ سوکھے ٹکڑے پیٹ میں جا کر آنکھوں میں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ مجھے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ سوچتا ہوں آج نواسے کے لیے دو گز کپڑا نہ بھیج سکا تو پھر اس گاؤں میں کاہے کو رہوں گا۔"

زیب النساء بڑی مہارت سے امڈے ہوئے آنسو پی گئی۔ بولی "چوہدری کیسا؟"

"وہیں جاتا ہوں۔" مولوی ابل نے جماہی لے کر کہا "ذرا سا بھی اچھا ہوا تو مہرن کا ضرور پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہٗ کوئی سبیل پیدا کر دے۔"

مولوی ابل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النساء نے برقعے کو جھاڑ کر الگنی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھونے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبیدہ اور شمسن نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے بھانجے کو دیکھنے جائیں گی۔ "ابھی ٹھہرو بیٹی!" زیب النساء یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت

ذرا سی بھی بلند آواز سے بولی تو کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

"انتظار ـــــ"

"انتظار ـــــ"

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے، اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے بج کر کھلے اور مولوی ابل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلایا "عارف کی ماں، اے عارف کی ماں!"

زیب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے پیچھے زبدہ، شمسن، عارف، قمرن، عمدہ اور دوسرے بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں سے کسی بگولے نے انھیں اٹھا کر باہر بکھیر دیا ہے۔

اور مولوی ابل اسی بجھتے ہوئے لہجے میں چلایا "مبارک ہو عارف کی ماں، تم نواسے کے چوے کو رو رہی تھیں، اللہ جل شانہ نے چوے چھنی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے۔ ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا ـــــ چوہدری فتح داد مر گیا ہے نا!"

زیب النسا نے اس زور سے اپنی چھاتی پر مارا کہ بچے دہل کر رو دیئے۔

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابل کو گردن سے دبوچ لیا ہے، اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی ابل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیتا تھا، چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا۔

کنجری

سرور گھر میں داخل ہوا تو ایک بہت بھاری خبر کے بوجھ سے اس کی کمر ٹوٹی جا رہی تھی، گلے کی رگیں پھول رہی تھیں، جیسے باتیں اس کے حلق میں آ کر اٹک گئی ہوں۔ اس کی بہت اندر تک دھنسی ہوئی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے کیونکہ بات شروع کرنے سے پہلے بند ہونٹوں کا وقفہ خبر کے بھاری بھرکم پن میں حارج ہو سکتا تھا۔ ''اماں'' وہ چھپر تلے بیٹھی ہوئی بڑھیا کو دیکھ کر پکارا اور اس کے قریب پہنچنے تک بولتا ہی چلا گیا ''وہ برساتی نالے سے پرے محلے میں جو لڑکی رہتی تھی نا؛ بیگماں؛ جسے پہلی بار دیکھ کر تم نے بے ساختہ کہا تھا کہ چاہے تو بڑے ٹھاٹ کی کنجری بن سکتی ہے؟'' —— ''ہاں ہاں، ہاں ہاں'' بڑھیا پیڑھی سمیت اُچھل کر ایک قدم آگے آ گئی اور سرور نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اپنے بیان کو جاری رکھا۔ ''وہ جو تمہارے خیال میں بیٹی کمال خاتون سے ہو بہو ملتی ہے۔'' اس نے کنکھیوں سے کماں کی طرف دیکھا جو چولہے کے پاس اپلوں کے دھوئیں میں لپٹی بالکل ایک پرچھائیں سی معلوم ہو رہی تھی، اور بڑھیا نے خاموشی کے اس خلا کو پُر کر دیا —— ''ہو بہو کہاں کہا تھا میں نے؟ ہماری کمال خاتون جیسی آنکھیں اس کے نصیبوں میں کہاں! یہ آنکھیں تو سمندر ہیں، شمشاد اور نو بہار کی آنکھیں سارے ملتان میں اپنا جواب نہیں رکھتیں، پر ہماری بیٹی کی آنکھوں کے سامنے وہ آنکھیں بھی پانی بھریں اور پھر ہماری کمالاں کے اوپر کے ہونٹ کی محراب اور نیچے کے ہونٹ کی کمان! میرا تو کئی بار جی چاہا کہ ہندو عورتوں کی طرح

اپنی کمالاں کی ہر صبح آرتی اتارنے لگوں بیگماں اچھی ہے۔ بات چیت، چال ڈھال میں قدرت نے بڑا نفیس اور بہت اونچے درجے کا رنڈی پنا بھر دیا ہے، پر ہماری کمالاں جیسا سبھاؤ کہاں اس میں" ـــــ بڑھیا کی باتوں کے دوران میں سرور اسی طرح کنکھیوں سے کمالاں کو دیکھتا رہا اور کمالاں جلتے ہوئے اپلوں میں دستپنا ٹھونس کر ہر طرف پھوہڑپن سے آگ بکھیرتی رہی۔ اور جب بڑھیا ڈلی پھانکنے کے لیے رکی تو ٹوٹے تار کو سرور نے بڑی پھرتی سے جوڑا۔ "تو اماں، وہی بیگماں رات کو اس مشہور نیزہ باز زمیندار کے ساتھ بھاگ گئی؟ جس کے ـــــ" بڑھیا پیڑھی سمیت اچک کر سرور کے گھٹنے سے آٹکرائی۔ "بھاگ گئی؟ اے سبحان اللہ، میں نہیں کہتی تھی؟ شاباش ہے اس کے دادے پردادے کو، اور لعنت اس کے باپ پر جو سکول کے سوکھے سڑے، ٹوٹے جڑے منشی کی ہڈیوں سے باندھنے چلا تھا۔ واہ! کس کے ساتھ بھاگی؟" ـــــ بڑھیا نے کمالاں کی طرف دیکھا جو بجھے بجھے چولھے میں برابر پھونکیں مارے جا رہی تھی، اور کڑوا اور لا دینے والا دھواں بہت گاڑھا ہو رہا تھا سرور بولا "اس زمیندار کے ساتھ جس کے بارے میں اماں تم نے ہی تو کہا تھا کہ تصویر اتارنے والی مشین کے سامنے بیٹھ کر آنکھ بھر کر دیکھے تو مشین کا شیشہ تڑ سے ہو جائے!" اب کے بڑھیا پیڑھی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ٹہلتی ہوئی بولی "معلوم ہوتا ہے شیرنی کا دودھ پیا ہے بیگماں نے۔ بھئی سرو بیٹے۔ ایسی ہی لڑکیوں کے دم سے دنیا کی بہار قائم ہے، ورنہ ان شریف زادیوں کا بس چلے تو دنوں میں گاتی گنگناتی دنیا کو قبرستان بنا کر رکھ دیں ـــــ ہاہاہا۔ لگتا ہے میں دس برس اور جیوں گی۔ رگوں میں خون ناچنے لگا ہے۔ جیو میرے سرو، کیسی گھی میں تر تراتی خبر لائے ہو تم ـــــ کیوں کمالاں بیٹی؟ تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور کمالاں نے ہنڈیا کو چولہے پر سے کچھ ایسا جھٹکا دے کر اٹھایا کہ چلّو بھر پتلی دال اچھل کر اپلوں پر گری اور سانپ کی طرح پھنکار کر رہ گئی۔ بڑھیا نے مسکرا کر سرور کو دیکھا، اور سرور نے مسکرا کر کہا "کچی ہے ابھی" ـــــ کمالاں کو دروازے پر ٹھٹکتے دیکھ کر بڑھیا فوراً بولی "دال نا؟" ـــــ

اور جب کمالاں ہنڈیا لیے اندر چلی گئی تو دونوں ماں بیٹا منہ پر ہاتھ رکھے گٹکنے لگے اور پھر سرور نے افیم کی ایک بڑی گولی کی دو گولیاں بنا کر ایک کو بڑھیا کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ "ہاں" وہ بولی "آج ہی تو سانولی رانی کو چکھنے کا مزہ آئے گا۔"

یہ تڑ تڑاتی ہوئی خبر کمالاں کے لیے نئی نہیں تھی، اس کا باپ اور دادی تقریباً روزانہ اسی قسم کی خبریں ڈھونڈ ڈھانڈ لاتے تھے اور انھیں کمالاں کے سامنے کچھ یوں مزے لے لے کر بیان کیا جاتا کہ بعض وقت تو کمالاں تک چونک کر پوچھ بیٹھتی تھی "پھر کیا ہوا بابا؟" اور سرور جواب میں کہتا "پھر کمال خاتون بیٹا! لڑکی نے گاؤں بھر کے سامنے اکڑ کر کہہ دیا کہ وہ اپنی یاری نہیں توڑے گی، بھائیوں کا حلقہ توڑ کے بھاگی اور اپنے یار سے چمٹ کر رہ گئی۔ ہیر کو تو وارث شاہ نے خواہ مخواہ اچھال دیا ہے، میں اس نگری کا بادشاہ ہوتا تو اس لڑکی کا وظیفہ لگا دیتا۔ اماں کی قسم" ــــ کمالاں یہ باتیں سن کر جھینپ جاتی، پھر سونے سے پہلے بستر پر کروٹوں کے درمیان سوچتی اور سوچتے سوچتے کبھی اس پر چھاج بھر ستارے برس پڑتے کبھی چولہا بھر انگارے۔

کمالاں کا دادا سہراب خاں گاؤں کا خاصا کھاتا پیتا دکاندار تھا کہتے ہیں پنجاب کا لاٹ سر میلکم ہیلی جب اس گاؤں میں ٹڈیوں کے انڈے دیکھنے آیا تھا تو سہراب خاں نے لاٹ صاحب کے سامنے گاؤں کے کنوئیں میں کھانڈ کی اکٹھی بیس بوریاں انڈیل دیں اور اگلے سال خاں صاحب کا خطاب پایا۔ مگر جانے اس پر کیا افتاد پڑی کہ یہ خاں صاحبی اسے بڑے بڑے شہروں میں لے گئی اور ایک روز گاؤں والے کیا دیکھتے ہیں کہ خاں صاحب سہراب خاں پچاس برس کی عمر میں ایک نئی بیوی لیے گاؤں میں داخل ہو رہا ہے۔ کھسر پھسر ہوئی مگر سارے گاؤں کی ایک ٹھاٹ دار دعوت شکوک و شبہات کو بہا لے گئی۔ البتہ ایک برس کے بعد جب نئی بیوی کے بطن سے سرور پیدا ہوا تو دایہ نے ایک عجیب ہوائی اڑا دی۔ یہ دایہ بھی کسی زمانے میں ملتان ہی سے بیاہ کر آئی تھی۔ اس نے شوشہ چھوڑا کہ سہراب خاں کی نئی بیوی

تو ملتان کی مشہور طوائف زرتاج ہے جو وہاں تاجی کے نام سے مشہور تھی اور بلوچستان کے کئی وڈیروں اور سندھ کے کئی جاگیرداروں کے پہلو گرما چکی تھی۔" میں نے تاجی کو نواب رن مست خاں کی حویلی میں ناچتے دیکھا ہے لوگو!" دایہ جگہ جگہ یوں چلاتی پھری جیسے اس راز کو فاش نہ کیا تو اس کا دم گھٹ جائے گا۔" اپنی اولاد کی قسم کھاتی ہوں کہ یہ خاں صاحبنی وہی تاجی ہے کنجری۔"

اور یہ لفظ سارے گاؤں میں گونج گیا "کنجری۔ کنجری!" سہراب خاں کی دکان اجڑ گئی۔ وہ دکان کا سامان اٹھوا کر گھر میں روپوش ہو گیا، پانی تک کا محتاج ہو گیا تو رات کی رات گاؤں سے بھاگا اور کہتے ہیں کہ لائل پور میں کسی وکیل کا منشی ہو گیا۔ سرور ابھی دس برس ہی کا تھا کہ خاں صاحب سہراب خاں اپنے گاؤں والوں کو گالیاں دیتا چل بسا۔ تاجی سرور کی انگلی پکڑے پھر سے گاؤں میں آئی اور سیدھی بھری چوپال میں داخل ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ اس نے رو رو کر گاؤں کے سامنے تقریر کی اور قسمیں کھا کھا کر کہا کہ وہ کنجری ضرور تھی، مگر اب برسوں سے توبہ کر چکی ہے، اب وہ ایک دکھی بیوہ ہے اور خدا کے بعد یہ دس برس کا لڑکا اس کا سہارا ہے، کیا یہ گاؤں جس پر اس لڑکے کے ابا کے بے شمار احسان ہیں، انھیں اپنے گھر میں سر چھپانے کی اجازت نہیں دے گا؟ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ کیا کہ کوئی خاص ہرج نہیں ہے، گاؤں میں تاجی نے کوئی دس برس بڑے امن سے کاٹے اور وہ بڑے پرامن طریقے سے نوجوانوں اور نوعمر لڑکیوں کے درمیان یاریوں اور دوستیوں کے تانے بانے بنتی رہی اور اپنا پیٹ پالتی اور نشہ پورا کرتی رہی۔ پھر جب سرور جوان ہو گیا تو اس کے لیے کسی اور گاؤں میں ایک غریب سی لڑکی بھی چن لی، بیاہ ہوا اور سال بھر کے بعد کمال خاتون پیدا ہوئی مگر زچگی کی حالت میں سرور کی بیوی مر گئی۔ وہ لٹا لٹا سا رہنے لگا اور پھر نہ جانے اس کے من میں کیا سمائی کہ چند روز بعد ہی گاؤں چھوڑ کر ملتان بھاگ گیا۔ تاجی کمال خاتون کو مختلف ماؤں کے ہاں لیے پھری کہ وہ اسے چند مہینے دودھ پلا دیں اور اس کی دعائیں لیں۔ لیکن اس دوڑ دھوپ میں اسے معلوم ہوا کہ وہ

تو اب تک کنجری ہے، ایک رات کمالاں خاتون کو ایک کپڑے میں لپیٹا، گاؤں کے مولوی صاحب کے دروازے پر رکھا اور گاؤں سے بھاگ گئی۔ پانچ چھ برس تک ماں بیٹا ملتان میں کوکین کی تجارت کرتے رہے۔ چنڈو خانے بھی کھول لیے اور ڈیرہ اسماعیل خاں سے چرس لا لا کر بھی بیچتے رہے۔ مگر سرور ایک بار چرس لاتے ہوئے پکڑا گیا اور ایک برس کے لیے جیل چلا گیا۔ تاجی سے کاروبار سنبھل نہ سکا اور جب سرور جیل سے رہا ہوا تو وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ بہترین تجارت لڑکیوں کی ہے۔ ایک لڑکی بھی چکلے میں بٹھانے کو مل جائے تو اس کی آمدنی سے چاہو تو موٹر تک خرید لو۔ ایک سال تک سارے پنجاب میں کسی آوارہ لڑکی کی تلاش میں بھٹکتے پھرے مگر کوئی بھی اس کے ہتھے نہ چڑھی، آخر ایک روز جلال پور جٹاں کے ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے تاجی کا نوالہ اس کے منہ تک جاتے جاتے رُک گیا اور وہ بولی "سرو بیٹے! وہ ہماری کمالاں خاتون زندہ ہوئی تو اب کئے برس کی ہوگی؟" سرور ہڈی سے گودا نکالنے کی کوشش میں تھا۔ چونک کر بولا "ارے! آخر تم نے پہلے کیوں یاد نہیں دلایا اماں؟ وہ تو اب یوں سمجھو کہ کوئی سات آٹھ برس کی ہوگی۔ پانچ چھ سال کے اندر اللہ نے چاہا تو ــــــ" اور اس نے زور سے چٹکی بجائی، تاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور کمالاں کی یاد میں رونے لگی۔ ماں بیٹا افیم کی کافی مقدار شہر بہ شہر تولہ تولہ کر کے خریدتے ہوئے اپنے گاؤں میں آئے تو مولوی صاحب نے خدا کا شکر ادا کر کے آٹھ برس کی کمالاں ان کے سپرد کر دی اور جب روتی چلاتی کمالاں گھر میں آتے ہی مصلےٰ بچھا کر نماز پڑھنے لگی تو بڑھیا اور سرور مکان کے ایک گوشے میں جا کر منہ پر ہاتھ رکھے دیر تک گنگناتے رہے اور کہتے رہے "بیڑ کا رخ غلط ہے تنے میں رسہ ڈال کر اسے سیدھا کرنا پڑے گا!"

تنے میں بار بار رسہ ڈالا گیا مگر کچھ دیر بعد پیڑ جھک جاتا اور رسہ تڑ سے ٹوٹ جاتا بیڑ کا رخ معیّن ہو چکا تھا۔ کئی بار تو ماں بیٹا مایوس ہو کر کمالاں کو پھر سے مولوی صاحب کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے ملتان جا بسنے کا فیصلہ کر لیتے مگر پھر کمالاں سر پر گھڑا رکھے آنگن

میں داخل ہوتی اور بڑھیا کہتی "دیکھ دیکھ سرو بیٹے! ذرا دیکھ تو اس بڑھتی ہوئی قیامت کو قد کیسا سرو سا ہو رہا ہے اور چال میں کتنی مستی ہے، ہونٹ دیکھو لگتا ہے اللہ نے اپنے ہی ہاتھ مبارک سے تراشے ہیں، اور آنکھیں! یہ تو سمندر ہیں۔ ملتان کا ملتان ڈوب مرے گا اس میں۔ اس روز چکی پیس رہی تھی اور ساتھ ساتھ گا بھی رہی تھی اور تمہارے سر کی قسم میں سمجھی کھلکتے والی گوہر جان پھر زندہ ہوگئی ہے۔ آواز میں وہ قدرتی مرکیاں اور تھرتھریاں ہیں کہ میں کہتی ہوں ہز ماسٹر وائس چالیس چالیس پچاس پچاس ہزار میں ایک ایک ریکارڈ بھروائے گا اس سے اور وہ بھی ناک سے لکیریں کھود کر۔ میں تو نہیں جاؤں گی ملتان، میں تو اس کو لے کے جاؤں گی وہاں۔"

کمالاں کا بلوغ بالکل عید کا چاند ہو کر رہ گیا تھا، اگرچہ مصلے پھٹ جانے کے بعد دوسرا مصلے مہیا نہ ہو سکا مگر کمالاں دن میں ایک دو بار اپنی کسی دھلی ہوئی چادر یا چوے پر نماز پڑھ ہی لیتی تھی۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں وہ دادی اور اماں کی باتیں سن سن کر یوں چلا اٹھتی تھی جیسے نیند میں ڈر گئی ہے۔ کئی بار اس نے مولوی صاحب سے شکایت کر دینے کی بھی دھمکی دی مگر دادی نے اسے سمجھایا "تم نہیں جانتیں بیٹا جب تم خود بھی بڑی ہو جاؤ گی نا تو ایسی ہی باتیں کرو گی۔ خود مولوی صاحب بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہوں گے بچپن میں تم گڑیا سے کھیلی ہو گی۔ پر اب تو نہیں کھیلتی نا؟ آج سے دو سال پہلے تم کنوئیں سے ایک ذرا سی گگریا بھر کر لا سکتی تھیں۔ آج دو گھڑے سر پر رکھے ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہوئی لاتی ہو؟ تو یہ دنوں کا پھیر ہے میری جان۔ پھر اب بس چند مہینوں ہی میں تم دیکھو گی کہ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی، جاگنے میں تمہیں مزا آئے گا اور اندھیرے ہی تم کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرو گی اور کچھ نہ پا کر اداس ہو جاؤ گی۔ سمجھ گئیں میری رانی؟ بس اب چند مہینوں کی بات ہے۔"

"بس اب چند ہی مہینوں کی بات ہے!" بڑھیا سرور کو اطلاع دیتی۔

اور سرور ناک بھوں چڑھا کر کہتا "یہاں ایک ایک دن مہینہ ہو رہا ہے اور تم کہتی ہو کہ بس چند ہی مہینوں کی بات ہے۔ تم بھی کمال کرتی ہو اماں، ذرا سا افیم کا کاروبار چل رہا تھا پر یہ پولیس اور آبکاری والے بہت دور دور کی بو سونگھنے لگے ہیں جس کے ہاتھ میں افیم بیچتا ہوں، وہ پولیس کا مخبر لگتا ہے، مہینے میں کل پندرہ بیس کی بکری ہوتی ہے۔ اب بتاؤ ان پندرہ بیس میں ہم دونوں اپنا نشہ پورا کریں یا کھائیں پئیں اور اوڑھیں پہنیں۔ ویسے بھی دل کچھ ہولایا سا رہتا ہے، سوچتا ہوں کمالو پگلے کے لائق نہیں، اس کی آنکھوں میں جو سادگی کی چمک ہے نا اماں وہ نہ میں نے تمہاری شمشاد میں دیکھی نہ نوبہار میں۔"

بڑھیا بیٹے کی باتیں سن کر ہنس دیتی "ارے پگلے کہیں تو بھی مودی تو نہیں بنا جا رہا؟ یہ سادگی کی چمک کس کی آنکھوں میں نہیں ہوتی، ہوتی تو ہے پر غائب ہو جاتی ہے۔ بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ بھی تو سوچا کہ یہ بھی کبھی جلا اور چمکا ہوگا۔ پگلا، لا آج کی افیم لا۔"

دونوں کمالاں کی جوانی کی یوں راہ تک رہے تھے جیسے چائے کی کیتلی کو چولہے پر رکھ کر پانی کے ابلنے کا انتظار کیا جاتا ہے، اور یہ پانی اُس روز اُبلا جب کنوئیں پر جاتی ہوئی کمالاں کو ایک کسان قادر نے چھیڑ دیا۔ وہ اس کے پیچھے چلتا رہا اور جب کمالاں کا پاؤں کسی گڑھے میں یا کسی کنکر پر پڑتا تو وہ کہتا "حسبی اللہ حسبی اللہ"، کمالاں بہت دیر کے بعد اس دعائیہ کلمے کی تکرار سے چونکی۔ پلٹ کر بولی "اپنی بہنوں کو جا کر چھیڑ"، نوجوان مسکرا کر بولا "میرے تو سب بھائی ہی بھائی ہیں مہربان"۔ کمالاں نے کڑک کر کہا "تو پھر اپنی ماں سے عشق لڑا" نوجوان ہنس کر بولا "وہ تو مر چکی ہے پیارو"۔ کمالاں آپے سے باہر ہو گئی۔ قادرے کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ آن کی آن میں کنوئیں کی جگت خالی ہو گئی۔ لڑکیاں کمک کو بھاگی آئیں۔ قادرا لپک کر دور نکل گیا اور وہاں سے پکارا "آخر کنجری ہونا کنجری!" ــــ وہ لڑکیاں جو مارے ہمدردی کے کمالاں کے پاس جمع ہو گئی تھیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں، گٹکیں، اور پھر زور سے قہقہے مارنے لگیں۔ کمالاں نے گھڑے زمین پر دے مارے اور روتی چلاتی واپس گھر آ گئی۔ پہلے تو دیر

تک بلک بلک کر روتی رہی۔ پھر دادی اور ابا کی تسلیوں کے سہارے آنسو پونچھ کر بڑی رقت اور سوز سے سارے حادثے کی کیفیت بیان کی اور جب آخر میں غصے میں گھڑے توڑ دینے کا ذکر کیا تو دلاسہ پانے کی خاطر دادی کو دیکھا اور دادی کھلکھلا کر ہنس پڑی، حیران ہو کر ابا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ذرا سا غصہ تھا جو آنکھیں ملتے ہی کافور ہو گیا اور جب بڑھیا نے اس سے مخاطب ہو کر کہا، "چراغ بہت بری طرح بھڑک اٹھا ہے سرو بیٹے!" تو دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔

اس روز سے کمالاں ایک دم سے بدل گئی، کنویں پر جا کر گھر میں سُنی ہوئی باتیں ایسے جوش سے سناتی جیسے کسی سے انتقام لے رہی ہو۔ نوعمر لڑکیاں سنتیں لیکن جھینپ جھینپ جاتیں اور بڑی بوڑھیاں ایک دوسرے کے کانوں پر منہ رکھ کر کہتیں "آخر کنجری ہے نا کنجری" یہ سب کچھ سن کر بھی کمالاں کے تیور نہ بدلتے اور وہ اغوا اور آشنائیوں کی کہانیاں بڑے ٹھسّے سے سناتی چلی جاتی۔ گھر آتی تو دادی اور ابا سے نئی خبر سنانے کا تقاضا کرتی اور منہ کھول کر بڑی بے حیا ہنسی ہنسنے کی کوشش کرتی، بڑھیا تاجی اور سرور یہ آثار دیکھ کر خوش ہوتے اور جب کمالاں سو جاتی تو بہت رات گئے تک مستقبل کے بارے میں باتیں کرتے رہتے "ہولے ہولے ایسی سدھائی ہے کہ ملتان پہنچے گی تو دوسری شاندار کنجریوں کے کلیجے دھک سے رہ جائیں گے، دیکھ لینا بیٹا" بڑھیا ہوائی قلعے تعمیر کرتی رہتی، ان قلعوں کے دریچوں میں بیٹھی ہوئی بنی ٹھنی کمالاں اسے ہنستی مسکراتی اشارے کرتی اور آنکھیں مارتی نظر آتی، اور پھر وہ بے قرار ہو کر اٹھتی "ہے ہے کیسا جی چاہ رہا ہے اپنی رانی بٹیا کو ایک نظر دیکھنے کے لیے" وہ سوئی ہوئی کمالاں کے پاس آ کر اسے مسکرا مسکرا کر بڑے غور سے دیکھتی۔ پھر اس کی ایک لٹ کو اس کے چہرے پر ڈال کر بیٹے کو پکارتی "ذرا ادھر تو آنا سرو بیٹے، دیکھنا تو اپنی بیٹی کو، تیری قسم اگر میں مرد ہوتی تو تیرے سامنے دس ہزار روپے رکھ کر اس کی بینڈھی کھلواتی" پھر وہ اس کی بلائیں لیتی اور رات بھر موٹروں، گدگدے بستروں اور کوکین کے نشوں کے خواب دیکھتی رہتی۔

لیکن کمالاں ایک روز پھر سے بدل گئی۔ کسی نے اسے بتایا کہ جس قادرے نے اسے چھیڑا تھا وہ ایک اور نوجوان کے ہاتھوں پٹ گیا ہے۔ کمالاں پر اس خبر نے کوئی خاص اثر نہ چھوڑا مگر جب کہنے والی نے کہا کہ "تیرے نام پر لڑائی ہوگئی۔ قادرا تیرے بارے میں ننگی ننگی باتیں کر رہا تھا کہ ایک دم ابراہیم اس پر ٹوٹ پڑا اور دھنک کر ڈال دیا۔ ابراہیم کو تم جانتی ہو نا؟ اری یہی ابرو فوجی"۔ تو کمالاں کو گھمری سی آگئی اور اس کے بعد وہ احساسِ جمال اور احساسِ محبت کی سنجیدگی میں لپٹی رہنے لگی۔ ماں بیٹا کمالاں کے کردار کی اس دھوپ چھاؤں سے گھبرا سے گئے لیکن اپنی ریاضت میں کمی نہ آنے دی، افیم کی گولی ذرا سی موٹی ہوگئی اور جماہیوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا مگر کمالاں کی جوانی پر تکیہ لگائے رکھا۔ کمالاں اگر اب منہ پھاڑ کر نہیں ہنستی تھی اور ان سے لڑکی کی حرکتوں اور لڑکے کی صورت شکل کے بارے میں کرید کرید کر نہیں پوچھتی تھی تو گھی میں تر تراتی خبریں سُن سُن کر روتی اور جھلاتی بھی نہیں تھی۔ ایک روز ابراہیم فوجی کو گلی میں جاتے دیکھ لیا تو بغیر سوچے سمجھے مسکرانے لگی۔ جواب میں ابراہیم بھی مسکرا دیا تو وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر گھر آگئی۔ رات کو حالات کا جائزہ لینے کے بعد بڑھیا اور سرور سونے لگے تو انھوں نے مدتوں کے بعد کمالاں کو "رگی" میں گاتے سنا۔ دونوں ایک ساتھ بستروں پر اُٹھ بیٹھے اور دم سادھے اس کا گیت سنتے رہے اور جب گیت ختم ہوا تو بڑھیا نے چپکے سے کہا "چوٹ لگی ہے، صاف چوٹ لگی ہے، تمہاری ہی قسم بیٹا، چوٹ نہ لگے تو آواز میں پینگوں کا سا یہ اتار چڑھاؤ مشکل ہی سے آیا تا ہے آہا ہا، لطف آگیا!" امیدوں کے پھول جنھوں نے اب تک سر نہوڑا لیا تھا تر و تازہ ہو کر سر بلند ہوگئے۔ اور کمالاں کی آواز کے ہلکوروں میں جھومنے لگے۔

ہولے ہولے جب تقریباً روزانہ کمالاں اور ابراہیم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرنے لگے تو اسی رفتار سے گھر کے معاملات میں کمالاں محتاط ہوتی گئی۔ یہ وہ دن تھے جب گھر میں پتلی دال پکنے لگی تھی، دادی سارا دن پیڑھی پر بیٹھی افیم کی پینگ میں گم رہتی تھی، یا کبھی کبھار قصبے سے سرور کی لائی ہوئی چھالیا کترتی اور پھانکتی اور چباتی رہتی اور سرور

موچیوں اور جلاہوں کی دکانوں پر بیٹھا افیم بیچتا اور نت نئی خبریں سُن کر اور اکثر گھڑ کر گھر لاتا۔ ماں بیٹا صرف اُس وقت باہر کی خبروں پر تبصرہ کرتے جب کمالاں بھی کہیں آس پاس موجود ہوتی۔ پھر بڑے جہاندیدہ بن کر کمالاں کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھتے اور رات گئے تک اس کی پلکوں کے بار بار جھپکنے کے معانی اور سینے پر بار بار دوپٹے کو پھیلانے کے اسرار و غوامض پر مغز زنی کرتے سو جاتے۔ لیکن اب تک ان میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی تھی کہ کمالاں سے براہ راست اور دو ٹوک انداز میں عصمت فروشی کے لیے کہتے، بس جال بچھاتے رہے۔ دانہ ڈالتے رہے اور انتظار کرتے رہے مگر چڑیا کو دانے کی ہوس ہوتی تو جال میں پھنستی۔ بعض وقت سرور تنگ آ کر کہتا "اماں اس حرامزادی کو اٹھا کر ملتان میں لے جائیں، ایک بار شمشاد اور نو بہار اور امیرو وغیرہ کے حلقے میں بیٹھی تو سارے نشے ہرن ہو جائیں گے۔" مگر بڑھیا تاجی دور اندیشی سے کہتی "نہیں بیٹا! وہاں جا کر خود ہرن ہو گئی تو کیا کریں گے؟ ابھی کچی ہے نا، پک جانے دو، آپ ٹپکنے دو، اور پھر تم پولیس کو نہیں جانتے تھانیدار آنکھوں آنکھوں میں ڈاکٹری کر لیتے ہیں۔ انھیں اگر پتہ چل گیا کہ کمالاں پورے چودہ کی بھی نہیں تو میری تمہاری باقی عمریں جیل میں کٹ جائیں گی۔ جہاں آٹھ دس برس انتظار میں گزارے ہیں وہاں چند مہینے اور سہی، آخر اپنی بیٹی ہے کوئی غیر تو ہے نہیں کہ کان سے پکڑ کر لے جائیں۔ بیٹھے بیٹھے، نہ بیٹھے نہ بیٹھے، یہاں تو عمر بھر کا ساتھ ہے۔ نسلوں کا نصیبہ کھل جائے گا میرے لال۔ ذرا سا اور دیکھ لو۔"

ایک روز سرور گھر میں آیا تو تھکا ماندہ سا بڑھیا کی پیڑھی کے پاس بیٹھ گیا اور بولا "کچھ نہیں اماں، لطف نہیں آیا۔"

بڑھیا بولی "میں پہلے سے سمجھ گئی تھی کہ سرور بیٹا خالی خالی سا آ رہا ہے۔"

سرور نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کنپٹیاں دبائیں اور بولا "گلابی اور نواز میں بڑی مدت سے یارانہ چل رہا تھا، میں تو رفتار سے پہچان لیتا ہوں کہ کلیجے میں کتنا گہرا گھاؤ ہے۔ لوگ یقین

نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے نواز نمازی ہے اور آنکھیں جھکا کے چلتا ہے۔ میں کہتا تھا بھئی جو لوگ نظریں اٹھا کے چلتے ہیں ان پر تم شبہ کرتے ہو اور کہتے ہو کہ آنکھیں جھکا کے چلو، پر جو آنکھیں جھکا کے چلتا ہے اس پر ہم شبہ کیوں نہ کریں اور اس سے کیوں نہ کہیں کہ بھئی یہ نیچی نظر تو بڑی خطرناک ہے، نظریں اُٹھا کر چلا کرو۔ سو آج میں کلے جو لاہے ہاں افیم بیچ کر آ رہا تھا کہ سلطانے کے کھنڈر کے پاس مجھے گلابی نظر آئی۔ چھپنے کی کوشش میں تھی، پر میں نے دیکھ لیا اور جو کھنڈر کی دیوار سے جھانکتا ہوں تو اندر یہ نمازی نواز دبکا بیٹھا ہے۔ اور پھر پلٹ کے دیکھتا ہوں تو گلابی گاؤں میں داخل ہو رہی ہے۔ میں نے نواز سے صرف اتنا کہا "کیوں پیارے نماز پڑھ رہے ہو؟" مجھے من بھر کی گالی دے کر چاقو نکال لیا اور بولا "یہ کوئی تیرے باپ سہرابے کا کھنڈر ہے؟" پر اماں! جھینپ چھپاٹے سے چھپتی تو نہ پھر بدنام ہوتی نہ سوہنی۔ خیر، میں نے واپس آکر موچی کی دکان پر ذکر کیا تو سب نے مجھے جھوٹا قرار دیا میں نے پیر دستگیر کی قسمیں کھا کھا کر کہا کہ میں نے بس ابھی ابھی دونوں کو اکٹھے دیکھا ہے کہ ایک دم جیسے دکان پر الو بول گیا۔ سامنے یہی گلابی ہاتھ میں جوتا لیے کھڑی ہے "اسے کل تک مرمت کر دو بھائی"، اس نے موچی سے کہا اور جوتا پھینک کر چل دی۔ ایسی بھد ہوئی ہے اماں کہ جی چاہتا ہے زمین پھٹے اور اس میں سما جاؤں، بڑے آئے سچی یاری لگانے والے چھپ چھپ کر ملتے ہیں اور —— حرامزادے!"

اور کمالاں نے سوچا کہ آخر ابا کو ان کے چھپ چھپ کر ملنے سے کیا تکلیف ہوئی، وہ ملتے ہیں تو ابا کا کیا جاتا ہے؟ یہ تو نہیں کرتے نا کہ گھر سے چادر کھول کر سر پر رکھ لی اور عشق کا نام بدنام کیا۔ پھر اچانک وہ خیال ہی خیال میں گلابی کے روپ میں سلطانے کے کھنڈر میں جا پہنچی جہاں ابراہیم نواز کے روپ میں بیٹھا اس کی راہ تک رہا تھا۔ اور پھر ——

بڑھیا کی آواز نے اسے چونکا دیا "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا؟ عشق کماتے پھر رہے ہیں ماں کے لاڈلے، دھن ہو بیگماں جس نے بھائیوں کا حلقہ توڑ کر اپنے یار کے

سینے پر سر رکھ دیا دنیا بھر کے سامنے، مزا آیا نا عشق کرنے کا۔"

"دادی" کمالاں بولی اور وہ بہت مدت کے بعد اس نوعیت کی گفتگو میں حصہ لینے لگی تھی اس لیے دادی اور بابا دونوں "جی، جی" کرتے ہوئے اس کی طرف گھوم گئے اور وہ بولی "آخر آپ ان کے چھپ چھپ کر ملنے پر اتنے دکھی کیوں ہیں؟"

بڑھیا اسے راہ راست پر لانے کے لیے واعظانہ لہجے میں بولی "دیکھ بیٹی رانی۔ سن، بات یہ ــــ"

مگر سرور نے بات کاٹ دی "ٹھہرو اماں! بیٹی کمال خاتون سے میں بات کروں گا۔ یہ بتاؤ کمال خاتون بیٹا کہ کیا تم چھپ چھپ کر ملنے کو برا نہیں سمجھتیں؟"

"کس سے؟" کمالاں نے پوچھا

"کسی سے۔ جس سے میں کہوں یا جس سے تم چاہو، ملوگی؟" سرور نے تن کر کہا۔

"خدا تمہارا بھلا کرے!" بڑھیا نے سرور کو داد دی "کیا بات سے بات پیدا کی ہے اور وہ بھی سو بات کی ایک بات۔ ہاں تو بتاؤ بیٹی، جواب دو، ملوگی؟"

کمالاں تو جیسے طوفان میں گھر گئی تھی، چکرا گئی اور پھر ایک ہی جست میں جیسے اسے کنارہ مل گیا۔ بولی "ہاں! پر جس سے میرا اپنا جی چاہے گا!"

"ہاں ہاں جس سے تیرا اپنا جی چاہے گا۔" بڑھیا کی باچھیں کھل گئیں۔

"بالکل ــــ اچھا تو کون ہے وہ؟" سرور نے پوچھا۔

جواب کے انتظار میں بڑھیا اور سرور نے سانسیں روک لیں اور پلکیں جھپکنا بھول گئے۔ کمالاں کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی آئی جو دیکھی نہیں جا سکتی تھی، صرف محسوس کی جا سکتی تھی۔ بولی "ایسا تو کوئی نہیں۔"

بڑھیا کی باچھیں سمٹ گئیں۔

سرور ٹہلتا ہوا آنگن کے پرلے گوشے تک چلا گیا اور جیسے اپنے آپ سے سرگوشی

کی" حرامزادی"۔

اس رات بڑھیا دیر تک روتی رہی، پھر ایکا ایکی اس کی سسکیاں رک گئیں اور ٹوٹتی رات تک دونوں میں کھسر پھسر ہوتی رہی۔ اس رات کمالاں کو بھی بڑی پریشان نیند آئی، آنکھیں کھلتیں تو اندھیری چھت کو گھورتی رہ جاتی اور پھر ایک دم آنکھیں بند کر کے سر کو تکیہ کی صورت میں استعمال ہونے والے میلے چیتھڑوں میں یوں جما دیتی جیسے کسی بہت میٹھے خواب کے چاک کو رفو کرنے چلی ہے۔

دوسرے روز بڑھیا اور سرور کا طرزِ عمل بہت بدلا بدلا سا تھا۔ بڑھاپے چین ہو ہو کر پیڑھی پر سے اٹھ بیٹھتی اور کھانستی کھنکارتی اِدھر اُدھر گھومنے لگتی۔ ٹوٹے ہوئے چھاج کی مرمت کرتے ہوئے کمالاں نے ایک بار پوچھا "کیا بات ہے دادی؟"

"ارے بیٹیا! کوئی خاص بات نہیں" بڑھیا بولی "جوانی کمبخت یاد آرہی ہے۔ ایسی ٹوٹ کر آئی تھی کہ جی چاہتا تھا پہاڑوں کو سینے سے بھینچ کر انہیں سرمہ بنا کے رکھ دوں۔ انگلیوں کی پوروں تک سے کوئی چیز پھٹ کر نکلنے کو دھڑکتی رہتی تھی۔ تمہیں دیکھ کر وہ گھڑیاں یاد آگئیں، اسی لیے ذرا اداس ہو رہی ہوں۔"

سرور بھی اس روز دن میں کتنی بار گھر کے چکر لگا گیا۔ ایک مرتبہ کمالاں نے اس سے بھی پوچھا "کیا بات ہے بابا؟"

"آبکاری کا افسر دورے پر آیا ہے بیٹیا"، وہ بولا "ذرا سی افیم تھی اسے اِدھر اُدھر کیا ہے کہیں چھاپہ نہ پڑ جائے، افیم ہاتھوں سے نکل گئی تو تینوں کے تینوں فاقوں مر جائیں گے بار بار آتا ہوں کہ دیکھوں کہیں سچ مچ چھاپہ پڑ تو نہیں گیا۔ لوگ ہمیں کنجر کہتے ہیں نا بیٹی، نیچ سمجھتے ہیں ہمیں، اس لیے کچھ دور نہیں کہ کوئی افسر کے پاس شکایت جڑ دے خواہ مخواہ۔"

کمالاں کو رونا آ گیا۔ کتنا دکھی ہے بے چارا بابا۔ ابھی چالیس برس کا بھی نہیں ہوا پر کیسا نچڑا ہوا سا ہے۔ دھنسے ہوئے کلّے، کہیں دور رینگتی ہوئی آنکھیں جیسے کنویں میں گر پڑی

ہوں۔ ذرا سی آمدنی میں تین جانوں کو سہارے ہے۔ ننگی گندی باتیں کرتا ہے تو کیا ہوا؟ نماز بھی پڑھے گا تو بیچے گا تو افیم کی گولیاں ہی، عبادت سے نصیبے بدلتے تو کیا گاؤں کے مولوی صاحب جیسا پرہیزگار اور نیک انسان آج اس نگری کا بادشاہ نہ ہوتا۔ بے چارا میرا بابا! ـــــ وہ چپکے چپکے روتی اور آنسو پونچھتی رہی اور ماں بیٹے کو آنگن کے گوشوں میں سرگوشیاں کرتے دیکھتی رہی

اور شام کو کھانا کھاتے کھاتے اچانک بڑھیا کا ایک نوالہ منہ میں اور دوسرا ہاتھ میں رہ گیا اور وہ پیڑھی پر سے یوں چکرا کر گری کہ ایک بار تو سرور اور کمالاں دونوں سناٹے میں آگئے۔ پھر سرور نے لپک کر بڑھیا کو اٹھایا اور چلایا "اماں، اماں"

"دادی، دادی" کمالاں چلائی

"بیٹی۔ بیٹی" بڑھیا کراہی "درد سے پیٹ پھٹا جا رہا ہے۔ کچھ کرو ورنہ میں گئی۔ اے بیٹا میں گئی، قلنج لگتی ہے۔ اے کسی سیانے کو بلواؤ بیٹا کسی سیانے کو بلواؤ"

سرور نے بڑھیا کو اٹھا کر کھاٹ پر ڈال دیا "قلنج ہے تو جیون بوٹی سے یوں چٹکی بجاتے میں آرام آجائے گا۔ کہیں دیکھی تو ہے میں نے ـــــ جانے کہاں دیکھی ہے۔ دیکھی ضرور ہے۔ یہیں اسی گاؤں میں دیکھی ہے پر جانے کہاں دیکھی ہے"

"قبرستان میں؟" بڑھیا نے مارے درد کے سسکتے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں"

"مسجد میں؟" کمالاں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹی۔ وہاں تو گنوار ہے، میں جیون بوٹی کی بات کر رہا ہوں"

"تو پھر کہاں دیکھی ہے؟" بڑھیا نے آنکھیں بند کر کے یہ الفاظ یوں ادا کیے جیسے اپنے سینے میں سے اپنے ہاتھوں سے خنجر نکال رہی ہے "جلدی سے یاد کرو ورنہ میں چلی۔ میں چلی میری بیٹی رانی"

سرور گھبراہٹ میں اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

اچانک بڑھیا بولی "سلطانے کے کھنڈر میں۔"

اور سرور نے تالی بجادی "جیو اماں، کیا وقت پر یاد دلایا ہے۔ وہیں ہے جیون بوٹی۔ میں ابھی لایا" اور باہر جانے کے لیے اس نے پگڑی سر پر لپیٹنا شروع کر دی۔

بڑھیا کراہی "تم میرے پاس رکو بیٹا۔ جانے تمہارے پیچھے کیا ہو جائے۔ کمال خاتون چلی جائے گی"

"میں چلی جاؤں گی بابا،" گھبرائی ہوئی کمالاں نے جوتا پہن لیا۔

اور سرور بولا "دیکھ بیٹا! ایک بڑے کوٹھے کا کھنڈر ہے ایک چھوٹی سی کوٹھری کا۔ چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر کی دکھنی دیوار کی جڑ میں آک اُگ رہے ہیں۔ ان کے نیچے مولی ایسے بڑے بڑے پتوں والی ایک بوٹی اُگ رہی ہے۔ ایک پتہ بھی مل جائے تو اماں کے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔"

"اچھا بابا۔ میں بس پلک جھپکنے میں آئی۔" کمالاں نے باہر لپکتے ہوئے کہا۔

سلطانے کے کھنڈر کے پاس اندھیرے میں ایک کتا رو رہا تھا۔ تیزی سے آتی ہوئی کمالاں کو دیکھ کر اس نے پیٹ سے لگی ہوئی دم کو اٹھا کر بھونکنے کی کوشش کی، مگر صرف "ٹیاؤں" کی آواز نکال پایا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ اب تک کمالاں بہت جوش سے چلی آ رہی تھی، کتے کے رونے اور بھاگنے کی آواز سے وہ ہولا گئی اور ٹھٹھک کر رہ گئی۔ پھر چھوٹی کوٹھری کے کھنڈر میں قدم رکھا تو ٹوٹی پھوٹی دہلیز کے کسی سوراخ پر بیٹھے ہوئے جھینگر نے اچانک دم سادھ لیا اور اس سناٹے میں دور کے جھینگروں کی آواز بڑی ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ خود کمالاں نے بھی جیسے اس لمحے کی ہیبت سے دم سادھ لیا اور گھسٹتے ہوئے تہبند کو دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں سے اٹھائے آگے بڑھی۔ آک کے سوکھے پتوں کو چھوا تو وہ اپنی بھونڈی آواز میں بج اٹھے، خاموشی میں ان کی آواز معمول سے کہیں اونچی اور پھٹی پھٹی معلوم ہوئی۔ پھر وہ آک کے پاس بیٹھ کر اس کی جڑوں میں جیون بوٹی ڈھونڈنے ہی لگی تھی کہ یکایک آک کے بہت سے پتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز آئی اور آک کے پیچھے سے ایک سایہ جیسے کھنڈر کی دیوار سے بھی سر نکالتا ہوا اٹھا اور آواز آئی "آ گئیں میری جان،" چیخ جیسے کمالاں کے حلق میں ہڈی کی طرح

اٹک کر رہ گئی۔ ان گلابی جاڑوں میں بھی اس کا جسم تپ گیا اور جگہ جگہ سے پسینہ پھوٹ پڑا۔"میں جانتا تھا کہ تم کبھی نہ کبھی ضرور آؤ گی۔ اور آخر آج ———،، کمالاں اتنی قوت سے جست سی لگا کر کوٹھری کے باہر آ رہی کہ بولنے والا اس قطعی غیر انسانی قوت سے بوکھلا سا گیا اور پھر کمالاں بھاگ اٹھی۔ اس وقت اس کے تمام حواس بہت تیز ہو رہے تھے، وہ جانتی تھی کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے اور قدموں کی چاپ لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب آ رہی ہے لیکن جب وہ گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوئی تو کچھ سوچ کر رک گئی اور دیوار سے لگ لگ کر چلنے لگی۔ تعاقب کرنے والا بھی آبادی کے قریب آجانے کے باعث کہیں رک گیا تھا۔ ہانپتی ہوئی کمالاں دیوار کو ٹٹول کر چلتی اپنے گھر تک پہنچ گئی اور وہاں اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی دادی مر چکی ہے۔ گھر خاموش تھا۔ دادی کراہ نہیں رہی تھی، اور کیسے کراہے؟ کمالاں نے سوچا۔ بابا اس کی پائنتی سے لگا رو رہا ہو گا اور جیون بوٹی کا انتظار کر رہا ہو گا اور ——— کمالاں مارے دکھ اور شرمندگی کے آنگن میں دیر تک رکی رہی۔ پھر پنجوں کے بل دروازے تک آئی اور کان لگا کر سننے لگی۔ دادی زندہ تھی۔

دادی کہہ رہی تھی "نصیبہ کھل بھی سکتا ہے اور چوپٹ بھی ہو سکتا ہے، قادرے کے بس میں آگئی تو جانو اللہ نے روزی کا سامان کر دیا اور جو وہاں سے بھی پھڈ پھڑا کر بھاگتی ہے تو بیٹا! مجھے زہر کی چٹکی دے دینا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں سفید ہو چلی ہیں۔ اب بھی چاند نہ ابھرا تو یہ جھورات ختم ہونے کی نہیں۔"

کمالاں کو جھرجھری آگئی، جیسے ایک دم بہت سی سرسریاں اس کی رگوں میں دوڑنے لگی ہوں۔

پھر سرور بولا "قادرے سے وعدہ تو دس کا ہے پر کہتا تھا کہ اگر کمالو نے خوش کیا تو پندرہ دے دوں گا۔ روز کے دس پندرہ کمانے لگی تو حرامزادی خود بھی مزے میں رہے گی، پر مجھے اس پر اعتبار نہیں اماں! بچپن میں مولوی کے پاس رہ کر جانے کمبخت

نے رگوں میں برف بھر لی ہے کہ گرمی تو اسے چھو بھی نہیں گئی۔"

"پر بیٹا" دادی نے کہا "تم نے اسے کھنڈر میں بھیجنے کی ترکیب اچھی سوچی ہے۔"

کواڑوں کو جیسے کسی نے پٹخ دیا۔ بڑھیا اور سرور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اور ذرا سی دیر کے بعد انھوں نے دیے کی مدھم روشنی میں کمالاں کو پہچان لیا۔ بڑھیا فوراً کراہنے اور ہل کھانے لگی لیکن سرور تو بت بن چکا تھا۔ بڑھیا نے بڑی مشکلوں سے ہمت باندھ کر کچھ عجیب سی غیر قدرتی آواز میں پوچھا "لوٹ آئیں بیٹا؟"—— کمالاں یوں اندر آئی جیسے بڑھیا کو دبوچنے کے لیے بڑھی ہے۔ سرور تک لرز گیا۔ مگر وہ دادی اور بابا کو غصے سے دیکھتی اپنی کوٹھری میں چلی گئی اور بستر پر گر کر بلبلا بلبلا کر رونے لگی۔ بڑھیا اور سرور بیٹھے ایک دوسرے کو بیوقوفوں کی طرح دیکھتے رہے اور جب اُدھر سے کمالاں کے رونے کی آواز رُکی تو اِدھر بڑھیا نے رونا شروع کر دیا اور جب بڑھیا خاموش ہوئی تو سرور وہاں سے اُٹھ کر اپنی کھاٹ پر آیا اور سر سے پاؤں تک چادر پھیلا کر لیٹ گیا۔

اس رات بڑھیا دیر تک جاگتی رہی۔ کوٹھے میں ٹہلتے ٹہلتے اکتا جاتی تو باہر آنگن میں نکل جاتی، وہاں پالا کاٹتا تو اندر بھاگی آتی۔ سونے کی کوشش کرتی، پھر تڑک کر اُٹھ بیٹھتی اور پھر ٹہلنے لگتی۔ اور جب صبح سرور اُٹھا تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا کراہ رہی ہے۔ وہ اُٹھ کر اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا "اماں سچ مچ کہ جھوٹ موٹ ——؟"

بڑھیا نے بڑے کرب سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولی "تم یوں نہ پوچھو گے تو اور کون پوچھے گا بیٹا؟"

سرور اس کے پاس بیٹھ گیا "نہیں ماں! معاف کر دو۔ تو کیا سچ مچ بیمار ہو؟"

بڑھیا نے کہا "پسلی میں درد اٹھا ہے بیٹا! چھریاں چل رہی ہیں۔"

سرور حواس باختہ سا وہاں سے اٹھا اور بولا "میں ڈاکٹر سے کوئی دوا لے کر ابھی آیا۔"

سرور کے جانے کے بعد بڑھیا دیر تک کراہتی اور روتی رہی، کافی دیر کے بعد وہ

پکاری "بیٹا کمال خاتون۔"

کمالاں دروازے پر نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ بری طرح زرد ہو رہا تھا۔ بال اجڑے اجڑے سے تھے اور ہونٹوں پر سفیدی سی جھلک رہی تھی۔

"بیٹا" بڑھیا نے فریاد کی۔

کمالاں وہیں کھڑی اسے ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

"ایک پیالی چائے مل جائے گی؟" اس نے گداگروں کی سی لجاجت سے کہا۔

کمالاں پلٹ کر باہر چلی گئی۔

سرور کوئی دوا لے کر آیا تو بڑھیا چائے پی رہی تھی اور کمالاں چپ چاپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ سرور کی دھنسی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں "اپنی دادی کو چائے پلا رہی ہو بیٹی؟" وہ بولا اور کمالاں کو خاموش پا کر بڑھیا کے پاس بیٹھ گیا۔ "یہ سفوف دیا ہے ڈاکٹر نے۔ کہتا تھا کہ یہ سفوف بھی اچھا ہے پر ایک انگریزی ٹیکہ نکلا ہے بڑے زور کا۔ پسلی کا درد آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے، کہتا ہے دوا تم منگا لو ٹیکہ میں لگا دوں گا۔ تیس چالیس لگتے ہیں۔"

لیکن اس تیس چالیس کی الجھن میں ٹیکہ لانے کی بجائے۔ بڑھیا کو ہوش میں لانے کی نوبت پہنچی۔ باقی افیم اور کمالاں کے چاندی کے دو بندے بیچ کر روپے ڈاکٹر کی نذر کیے، مگر شام کو جب یہ ڈاکٹر جو کمپاؤنڈری سے استعفیٰ دے کر ڈاکٹر بن کر آیا تھا، مریضہ کو دیکھنے آیا تو بڑھیا کی نظریں چھت کے کسی نقطے پر جم چکی تھیں اور وہ پنڈلیوں میں اینٹھن کے باعث پاؤں کو پٹخ پٹخ دیتی تھی۔ ڈاکٹر خفا ہونے لگا کہ "تم لوگ اسی وقت سیانے بلواتے ہو جب زندگی کی آخری رمق تک بجھنے والی ہو، اب دوا سے کچھ نہیں ہوگا، خدا کا نام یاد ہو تو دعا کرو اور بس۔ اس وقت بات میرے بس سے نکل چکی ہے۔ قرآن مجید کے ختم کے لیے کسی کو بلوا سکتے ہو تو بلواؤ، ورنہ مرنے والی کو تو مرنا ہی ہے۔"

سرور جاتے ہوئے ڈاکٹر کو دیر تک دیکھتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ پھر اچانک اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور وہ اماں کی کھاٹ کی پٹی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کی پگڑی اور لمبے بھوسلے بال اِدھر اُدھر لٹک گئے کمالاں بھی رونے لگی اور باپ بیٹی نے جب روتے روتے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جیسے ایک دوسرے کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر دونوں نے ایک ساتھ بڑھیا کی طرف دیکھا۔ سرور اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ اُس نے پگڑی اٹھا کر آنسو پونچھے اور اُٹھ کر بڑھیا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ پگڑی کا ایک پلو پھاڑ کر بڑھیا کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارا اور سر پر کس کر گرہ لگا دی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم یہیں اپنی دادی کے پاس بیٹھو بیٹی! کچھ یاد ہو تو پڑھتی رہو۔ میں کسی موچی دھوبی سے قبر کے لیے کہہ آؤں جلدی سے جنازہ ٹھکانے لگ جائے تو کہتے ہیں قبر حساب نہیں لیتی"۔ —— اس نے ایک بار پھر آنسو پونچھے، پگڑی بھدے پن سے لپیٹی اور باہر جاتے ہوئے دروازہ یوں کھولا اور بھیڑا جیسے اسے مردے کے جاگ اُٹھنے کا اندیشہ تھا۔

کمالاں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو مرتے دیکھا تھا۔ ابا کے جانے کے بعد اس نے مری ہوئی دادی کی سمت ڈرتے ڈرتے ایک نظر ڈالی۔ نیم وا آنکھوں میں سفیدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ میلی زرد رنگت کو چراغ کی میلی زرد روشنی نے نمایاں کر دیا تھا۔ پھر اسے کچھ ایسا لگا جیسے دادی کے لبوں میں حرکت ہوئی اور بھوٹے ذرا سا اوپر اُٹھے ہیں۔ گھبرا کر وہ زمین کو دیکھنے لگی۔ پھر اُٹھ کر دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے دادی کا چہرہ ڈھانپ دیا۔ لیکن اس کا ہاتھ دادی کے ماتھے کو چھو گیا اور اس کے جسم میں کپکپی سی دوڑ گئی کتنا ٹھنڈا تھا دادی کا ماتھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر سورۂ اخلاص پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا کہ دادی کے ہاتھ چادر کے نیچے ملے ہیں "دادی!" وہ چیخ کی حد تک چلائی۔ "بابا!" وہ دروازہ کھول کر پوری شدت سے پکاری۔ باہر گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے اور کہیں دور سے ڈھول اور شہنائی بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ آنگن میں دروازے کے قریب ہی دادی کی پیڑھی رکھی تھی۔ ایکا ایکی اس پر ایک سایہ سا

آ کر بیٹھ گیا، یہ بوڑھی دادی تھی۔ کمالاں نے اس زور سے کواڑ بند کیے کہ جھریوں میں سے سوکھے گارے کی قلعیں سی نکل کر گر پڑیں۔ وہ پسینے میں یوں شرابور ہو رہی تھی جیسے پگھلی جا رہی ہے لپک کر اس نے دادی کے چہرے پر سے چادر نوچ لی ـــــ نیم وا آنکھوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی اور پھر اسے کچھ ایسا لگا کہ دادی نے آنکھیں جھپکی ہیں۔ "دادی!" وہ ایک بار پھر اسی شدت سے چیخی اور دھڑام سے زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو سرور اس پر جھکا ہوا تھا۔ "اٹھو میری بیٹی! جاگو، آنکھیں کھولو۔ اری بگلی تجھے کیا ہوا تھا؟"

"میں ڈر گئی تھی بابا۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ سامنے دادی کے مردہ جسم کے پاس مولوی صاحب بیٹھے سورۂ یٰسین پڑھ رہے تھے، کمالاں نے جھپٹ کر دوپٹہ اوڑھا اور مؤدبانہ بیٹھ گئی۔ مولوی صاحب نے پڑھتے پڑھتے اس کی طرف دیکھا مسکرائے اور اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ اٹھی اور دادی کی کھاٹ کی پرلی طرف مولوی صاحب کے مقابل بیٹھ گئی۔ انھوں نے اپنے ہونٹوں انگلیوں کی پوروں سے چھو کر اسے کچھ پڑھنے کے لیے کہا اور وہ ایک سعادت مند بچی کی طرح سورۂ اخلاص کا ورد کرنے لگی۔ پھر مولوی صاحب نے سرور کو بے فکر رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور دروازے کو اسی احتیاط سے کھول کر باہر چلا گیا۔

سرور ساری رات قبر اور کفن وغیرہ کے سلسلے میں بھٹکتا پھرا۔ دوسرے دن بڑھیا کو دفن کر کے گھر میں آیا تو آنگن میں موچیوں، جلاہوں کی چند عورتیں کمالاں کے پاس بیٹھی رو رہی تھیں۔ چپکے سے کوٹھے میں چلا گیا، خوب خوب رویا اور پھر سو گیا۔ عورتیں چلی گئیں تو کمالاں کوٹھے میں آئی۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "بابا!" ـــــ اور پھر جواب نہ پا کر اس پر ٹوٹ پڑی لیکن کھاٹ کی پٹی کے پاس جا کر رک گئی اور چہرے پر کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے جیسے اب بس چیخنے ہی والی ہے۔ لرزتے ہوئے ہاتھ سے اس نے سرور

کے ماتھے کو چھوا اور مسکرانے لگی۔ "بابا!" وہ مارے خوشی کے پکار اُٹھی۔ سرور نے آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"میں تو ڈر گئی تھی بابا!" کمالاں اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"تو کیا مجھے بھی مردہ سمجھ لیا تھا تم نے؟" سرور بولا۔

کمالاں چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی اور بہت دیر کے بعد بڑے پیار سے بولی "بابا!"

سرور بے اختیار رونے لگا، اور جب بہت سے آنسو اس کی آنکھوں کے گڑھوں میں بھر گئے تو وہ ایک مسلسل دھار کی طرح بہہ نکلے اور پھر وہ بڑی ملائم مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "بیٹی! دیکھو، مجھے معاف کر دو۔ میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا کمینہ ہوں میں!" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دونوں ہاتھوں سے اپنے بال نوچ لیے اور سر پیٹ لیا۔ "میں بڑا ذلیل، کتا، خبیث، کمینہ ہوں کمالو! میں نے اپنی بیٹی کو ـــــ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو کنجری بنانا چاہا۔ تم مجھے مار دو میری بیٹی! میرا گلا گھونٹ دو۔" پھر اس نے کمالاں کے ہاتھوں کو جکڑا اور انہیں اپنی گردن پر رکھ دیا۔ "میرا گلا گھونٹ دو کمالو بیٹی! مجھ پر احسان کرو۔ میں کتنا کمینہ باپ ہوں، کتنا کمینہ، بیچ بیچ کا کنجر۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

کمالاں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے مگر اسے اپنے بابا کو تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہ سوجھا۔ بابا کے حق میں اسے کوئی بات مل ہی نہ رہی تھی کہ اسے بہلا پھلا کر تھپکتی۔ تو کیا اب وہ یہ کہتی کہ نہیں بابا! تم نے بہت اچھا کیا، تم نے کون سی بری بات کی۔ بس وہ چپ چاپ بیٹھی روتی رہی اور پھر اس کا سر دبانے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ بڑی نرمی اور پیار سے وہ اس کے ماتھے کی ہڈی دباتی رہی۔ پھر جیسے کچھ سوچنے لگی اور ماتھے پر سے ہاتھ اُٹھا کر سرور کے گالوں پر رکھ دیئے۔ تیزی سے جیسے چونک کر اس نے چادر کے اندر سے اس کا ہاتھ ڈھونڈ نکالا اور اس کی نبض دیکھنے لگی۔ پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے گھورتے

لگی اور کچھ دیر کے بعد جیسے کہیں بہت دور سے بولی ”تمہیں تو بخار ہے بابا!“

”ہاں بیٹی!“ وہ بولا ”ادھر دونوں پسلیوں میں چبھن سی بھی ہے۔“

کمالاں سناٹے میں آگئی۔ کھاٹ پر لیٹا ہوا بابا اچانک دادی میں بدل گیا۔ اس کی آنکھیں سفید ہوگئیں۔ چہرے پر میلی میلی زردی کھنڈ گئی اور اسے بابا کی ٹھوڑی تلے سے ایک پٹی بھی گزرتی دکھائی دے گئی! وہ ایک چیخ مار کر سرور سے لپٹ گئی۔ اس کے سر اور ماتھے پر اپنا چہرہ ملنے لگی اور رو رو کر پکارتی گئی ”نہیں بابا، تم نہیں مروگے۔ تم نہیں مروگے بابا۔ میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی نہیں بابا —— نہیں —— نہیں!“ وہ بچوں کی طرح مچل گئی، سرور اس کے سر پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا اور ساتھ ساتھ روتے روتے کہتا رہا ”نہیں نہیں بیٹی! میں مروں گا نہیں۔ تم مجھے بخش دو تو میں جیوں گا۔ پھر جینے پر حق ہوگا میرا۔“

کمالاں کے سوجے سوجے ہونٹوں اور سرخ سرخ گالوں پر آنسوؤں کی وجہ سے بال چمٹ گئے تھے۔ وہ انہیں بالوں میں سے اپنے بابا کو دیکھنے لگی اور دیکھتی رہی۔

”بخش دو بیٹا!“ سرور نے چادر میں سے ہاتھ نکالے اور انہیں جوڑ لیا۔

اور آنسوؤں میں نہائی ہوئی کمالاں مسکرادی۔

سرور کھاٹ پر اٹھ بیٹھا۔ ”اب میں نہیں مرسکتا بیٹی! تم ڈاکٹر کے پاس جاکر ذرا سا وہ سفوف تو لیتی آؤ —— کہنا پسلی کا درد ہے، دونوں طرف، ٹیکے کا کہے تو کہنا ہم غریب آدمی ہیں۔ جاؤ میری بیٹی! —— پر جانے سے پہلے مجھے ایک بار پھر اسی طرح دیکھ لو مسکرا کر۔“

کمالاں پھر مسکرائی۔ ”یوں“، اس نے خوش ہو کر کہا اور پھر اوپر چھت کی طرف دیکھ کر بولا ”الٰہی تیرا شکر ہے۔“

کمالاں نے باہر جاکر منہ دھویا اور ڈاکٹر نے ہاں چلی گئی۔ ڈاکٹر نے سفوف تو

دے دیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ "آج کل نمونیہ کے مریض تابڑ توڑ مر رہے ہیں، پر جو مریض ٹیکا لگواتا ہے وہ بچ جاتا ہے۔ باپ کی زندگی چاہیئے تو کہیں سے ٹیکا پیدا کرو سمجھیں؟"

"کتنے میں آئے گا ٹیکا؟" کمالاں نے پوچھا۔

"بس یہی کوئی چالیس پچاس ہیں" ڈاکٹر بولا "پنسلین نام ہے، قصبے میں مل جائے گا۔"

واپس گھر آ کر اس نے بابا کو پانی کے ساتھ سفوف تو کھلا دیا مگر ٹیکے کا خیال اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھوتا رہا۔ شام تک سرور کو اس زور کا بخار چڑھا کہ دور سے آنچ آنے لگی۔ کمالاں پھر ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی۔ سفوف تو لے آئی مگر ٹیکے کی رٹ جاری تھی۔

رات بھر بابا کے پاس بیٹھی رہی، سوئی بھی تو کھاٹ کی پٹی کے سہارے، سرور منتیں کرتا رہا کہ جا کر چارپائی پر سوئے مگر وہ رو دیتی اور بچوں کی طرح نفی میں سر ہلا ہلا کر انکار کر دیتی۔

صبح ہونے تک سرور بے حال ہو چکا تھا۔ کمالاں ڈاکٹر سے تیسری خوراک لینے نکلی تو لوگ اسے دیکھ کر ٹھٹک ٹھٹک گئے۔ سوجی سوجی، سرخ سرخ آنکھیں، اُجڑے بال، خشک ہونٹ، جیسے کہیں سے پٹ کر آ رہی ہے۔

ڈاکٹر اس کے ساتھ چلا آیا۔ سرور کی نبضیں دیکھیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمالاں کو دیکھنے لگا۔ "تو کیا اپنے باپ کو مارنے کے ارادے ہیں تمہارے؟" وہ بڑے غصے سے بولا "ٹیکا لاؤ ٹیکا۔ سمجھیں؟ اب کے ٹیکا لائے بغیر میرے پاس نہ آنا" اور وہ تھیلا اٹھا کر چلا گیا۔

سرور ہنسنے لگا۔ "ٹیکا!" وہ بولا اور پھر کراہتے ہوئے سمٹ گیا۔

اور کمالاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیے، کھاٹ کے پائے کا سہارا لیے، باہر دھوپ میں کھیلتی ہوئی چڑیوں کو دیکھتی رہی۔

دن ڈھلے وہ اُٹھی اور ایک گلی کا چکر لگا کر یوں واپس آ گئی جیسے محض ٹہلنے نکلی تھی وہ پھر اسی طرح کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"ٹیکا!" سرور پھر سے ہنسا۔ "کہتا ہے ٹیکا لاؤ، ڈاکٹر بنا پھرتا ہے، ٹیکے بغیر ٹھیک کر دے تو مانوں۔ اور بیٹی دیکھو، میری طرف دیکھو، میں مروں وروں گا نہیں۔"

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی بابا" کمالاں نے جیسے سرور سے کوئی راز کی بات کی۔

شام سے پہلے وہ سرور کو چائے پلا رہی تھی کہ اچانک باہر چلی گئی۔ گاؤں بھر کی گلیوں میں وحشت زدہ گھومتی رہی، اور جب گاؤں کی مسجد میں شام کی نماز پڑھی گئی تو اسے گلی میں مسجد کی باہر نکلی ہوئی محراب کے پیچھے ابراہیم مل گیا' اور وہ یوں بولی جیسے غیر ارادی طور پر یہ الفاظ اس کے منہ سے برس پڑے۔ "تم تو ہم سے دور دور رہتے ہو' ملتے ہی نہیں!"

ابراہیم جیسے ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ بڑی دیر کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی میں بولا "تمہارے حکم کا انتظار تھا"

"تو پھر آج ملو" وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولی۔

"کہاں؟"

"میرے گھر ہی میں" پھر ذرا سا رک کر بولی "دادی تو مر گئی ہے نا"

"کب آؤں؟"

"بس' لوگ سوتے' آ جاؤ۔ میں گھڑیاں گنوں گی تمہارے لیے۔ بے دھڑک آنا، بابا بیمار ہے' بے ہوش پڑا ہے۔"

ابراہیم کے تو جیسے پر لگ گئے' اِدھر کمالاں بھی اڑتی ہوئی گھر پہنچی۔ چائے کی پیالی سرور کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ چکی تھی اور وہ "پانی پانی" پکار رہا تھا۔

پانی کے چند گھونٹ پی کر وہ بڑے دکھ سے بولا "اتنی دیر تک مجھے اکیلا

نہ چھوڑ دیا کرو بیٹی، ڈر لگتا ہے۔"

کمالاں کچھ نہ بولی۔ اس کا سر دابنے لگی، اور جب اس پر غنودگی سی چھا گئی تو پنجوں کے بل چلتی ہوئی دوسری کوٹھری میں آئی اور وہاں چیتھڑوں کو میلے گدے کے نیچے چھپا کر تکیے کی شکل پیدا کر لی۔ گدے پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا اور آنگن میں کھلتا ہوا دروازہ کھول کر وہاں چہرے کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر بیٹھ گئی، اور لوگ سو رہے تک بیٹھی رہی

ابراہیم دبے پاؤں آیا تو جب بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ قریب آ کر اس نے آہستہ سے کہا "کمالی!"

"ایں!" وہ چونکی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ارے! تم آ گئے!" وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اندر لے آئی۔

اور پھر سرور "پانی پانی" کراہنے لگا۔ پھر چلانے لگا۔ پھر رونے تک لگا اور ادھر بہت دیر کے بعد جب ابراہیم اٹھ کر جانے لگا تو کمالاں لپک کر آئی اور دروازے سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"پانی"! سرور دوسرے کوٹھے میں رو دیا۔

ابراہیم کچھ دیر کھڑا کمالاں کی وحشت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بولا "اب چلیں پیاری!"

لیکن کمالاں اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"پانی"، سرور ادھر سے چلایا۔

ابراہیم نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولنے کی کوشش کی۔ "کل پھر ملیں گے میری جان!"

اور آخر کمالاں بولی "کل تو خیر ملیں گے، پر آج کی اجرت کہاں ہے؟"

"اجرت؟" ابراہیم غصے میں بولا "اجرت مانگتی ہے؟ عاشقی کی اجرت مانگتی ہے؟

شرم نہیں آتی ؟ آخر کنجری ہے نا، کنجری !"

اس نے کماؤں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
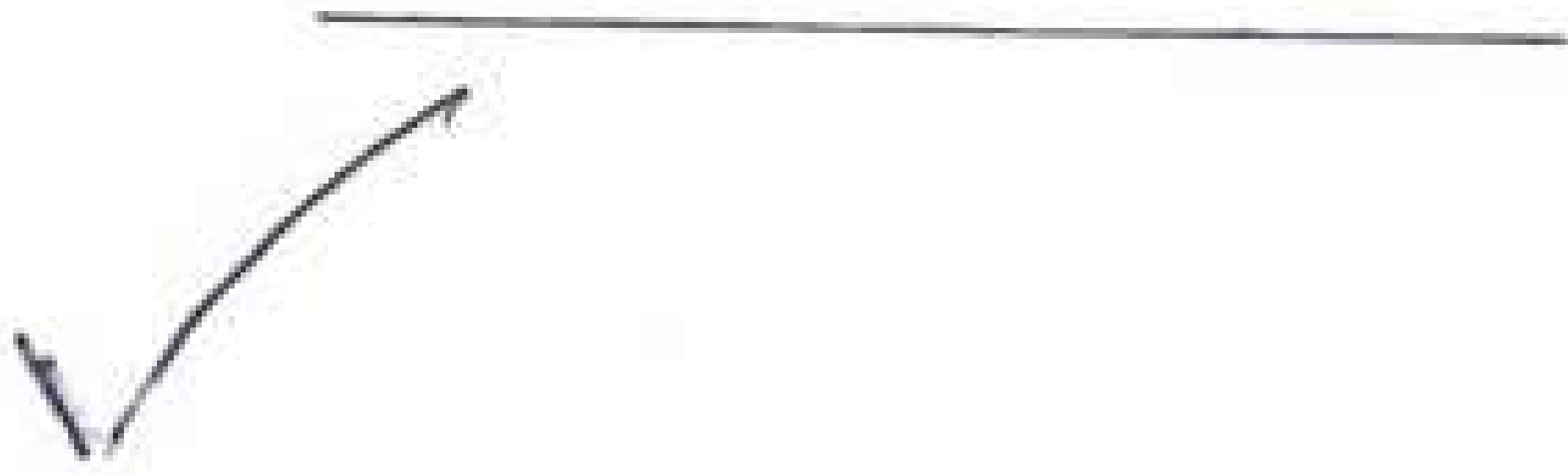
گنڈاسا

اکھاڑہ جم چکا تھا، طرفین نے اپنی اپنی "چوکیاں" چن لی تھیں "پڑکوڈی" کے کھلاڑی جسموں پر تیل مل کر بجتے ہوئے ڈھول کے گرد گھوم رہے تھے۔ انھوں نے رنگین لنگوٹیں کس کر باندھ رکھی تھیں، ذرا ذرا سے سفید پھینٹے ان کے چپڑے ہوئے لانبے لانبے پٹوں کے نیچے سے گزر کر سر کے دونوں طرف کنول کے پھولوں کے سے طرے بنا رہے تھے، وسیع میدان کے چاروں طرف پگوں اور حقوں کے دور چل رہے تھے اور کھلاڑیوں کے ماضی اور مستقبل کو جانچا پرکھا جا رہا تھا مشہور جوڑیاں ابھی میدان میں نہیں اتری تھیں۔ یہ نامور کھلاڑی اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کے گھیرے میں کھڑے اس شدّت سے تیل چپڑوا رہے تھے کہ ان کے جسموں کو ڈھلتی دھوپ کی چمک نے بالکل تانبے کا سا رنگ دے دیا تھا، پھر یہ کھلاڑی بھی میدان میں آئے، انھوں نے بجتے ہوئے ڈھولوں کے گرد چکّر کاٹے اور اپنی اپنی چوکیوں کے سامنے ناچتے کودتے ہوئے بھاگنے لگے اور پھر آناً فاناً سارے میدان میں ایک سرگوشی بھنور کی طرح گھوم گئی۔ "مولا کہاں ہے؟"

مولا ہی کا کھیل دیکھنے کو تو یہ لوگ دور دراز کے دیہات سے کھچے چلے آئے تھے۔" مولا کا جوڑی وال تاجا بھی تو نہیں!" دوسرا بھنور پیدا ہوا اور لوگ پوربی چوکی کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے بڑھنے لگے، جما ہوا پڑ ٹوٹ گیا، منتظمین نے لمبے لمبے بیدوں

اور لاٹھیوں کو زمین پر مار مار کر بڑھتے ہوئے ہجوم کے سامنے گرد کا طوفان اڑانے کی کوشش کی کہ بڑ کا ٹوٹنا اچھا شگون نہ تھا، مگر جب یہ سرگوشی ان کے کانوں میں بھی پہنچی تو وہ بھی ہجوم کے ساتھ ہو لیے —— اور پھر اتنے میں جیسے میدان میں سیروں بارود سے بھرا ہوا گولا ایک چکرا دینے والے دھماکے سے پھٹ پڑا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ پڑ کی چوکور حدوں کی طرف واپس جانے لگے۔ مولا اپنے جوڑی وال تاجے کے ساتھ میدان میں آ گیا۔ اس نے پھندنوں اور ڈوریوں سے سجے اور لدے ہوئے ڈھول کے گرد بڑے وقار سے تین چکر کاٹے اور پھر ڈھول کو پوروں سے چھو کر 'یا علی' کا نعرہ لگانے کے لیے ہاتھ ہوا میں بلند کیا ہی تھا کہ ایک آواز ڈھولوں کی دھما دھم کو چیرتی پھاڑتی اس کے سینے پر گنڈاسا بن کر پڑی "مولے، اے مولے بیٹے! تیرا باپ قتل ہو گیا!"

مولا کا اٹھا ہوا ہاتھ سانپ کے پھن کی طرح لہرا گیا اور پھر ایک دم جیسے اس کے قدموں میں پہیے نکل آئے۔ "رنگے نے تیرے باپ کو ادھیڑ ڈالا ہے گنڈاسے سے!" اس کی ماں کی آواز نے اس کا تعاقب کیا!

پڑ ٹوٹ گیا۔ ڈھول رک گئے۔ کھلاڑی جلدی جلدی سے کپڑے پہننے لگے۔ ہجوم میں افراتفری پیدا ہوئی اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔ مولا کے جسم کا تانبا گاؤں کی گلیوں میں کوندے بکھیرتا اڑا جا رہا تھا۔ بہت پیچھے اس کا جوڑی وال تاجا اپنے اور مولا کے کپڑوں کی گٹھڑی سینے سے لگائے بھاگا آ رہا تھا اور پھر اس کے بہت پیچھے ایک خوفزدہ ہجوم تھا۔ جس گاؤں میں کسی شخص کو ننگے سر پھرنے کا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا وہاں مولا صرف ایک گلابی لنگوٹ باندھے پنہاریوں کی قطاروں اور بھیڑوں بکریوں کے ریوڑوں کو چیرتا ہوا للکارتا جا رہا تھا۔ اور جب وہ رنگے کی چوپال کے بالکل سامنے پہنچا تو سامنے کے ایک اور ہجوم میں سے پیر نور شاہ نکلے اور مولا کو للکار کر بولے "رک جا مولے!"

مولا لپکا چلا گیا مگر پھر ایک دم جیسے اس کے قدم جکڑ لیے گئے اور وہ بت کی طرح جم کر رہ گیا۔ پیر نور شاہ اس کے قریب آئے اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولے "تو آگے نہیں جائے گا مولے!"

ہانپتا ہوا مولا کچھ دیر پیر نور شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا، پھر بولا "آگے نہیں جاؤں گا پیر جی تو زندہ کیوں رہوں گا؟"

"میں کہہ رہا ہوں۔" پیر جی 'میں' پر زور دیتے ہوئے دبدبے سے بولے۔

مولا ہانپنے کے باوجود ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا "تو پھر میرے منہ پر کالک بھی مل ڈالیے اور ناک بھی کاٹ ڈالیے میری۔ مجھے تو اپنے باپ کے خون کا بدلہ چکانا ہے پیر جی، بھیڑ بکری کی بات ہوتی تو میں آپ کے کہنے پر یہیں سے پلٹ جاتا۔"

مولا نے گردن کو بڑے زور سے جھٹکا دے کر رنگے کی چوپال کی طرف دیکھا۔ رنگا اور اس کے بیٹے لٹھوں پر گنڈاسے چڑھائے چوپال پر تنے کھڑے تھے، رنگے کا بڑا لڑکا بولا "آؤ بیٹے آؤ۔ گنڈاسے کے ایک ہی وار سے پھٹے ہوئے پیٹ میں سے انتڑیوں کا ڈھیر نہ اگلوا ڈالوں تو قادر نام نہیں۔ میرا گنڈاسا بڑا جلد باز ہے اور کبڈی کھیلنے والے لاڈلے بیٹے باپ کے قتل کا بدلہ نہیں لیتے، روتے ہیں اور کفن کا لٹھا ڈھونڈتے چلے جاتے ہیں۔"

مولا جیسے بات ختم ہونے کے انتظار میں تھا، ایک ہی زقند میں چوپال کی سیڑھیوں پر پہنچ گیا۔ مگر اب کبڈی کے میدان کا ہجوم بھی پہنچ گیا تھا اور گاؤں کا گاؤں اس کے راستے میں حائل ہو گیا تھا۔ جسم پر تیل چپڑ رکھا تھا اس لیے وہ روکنے والوں کے ہاتھوں میں سے نکل نکل جاتا مگر پھر جکڑ لیا جاتا۔ ہجوم کا ایک حصہ رنگے اور اس کے تینوں بیٹوں کو بھی روک رہا تھا۔ چار گنڈاسے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں جنوں کی طرح بار بار دانت چمکا رہے تھے کہ اچانک جیسے سارے ہجوم کو سانپ سونگھ گیا۔ پیر نور شاہ قرآن مجید

کو دونوں ہاتھوں میں بلند کیے چوپال کی سیڑھیوں پر آئے اور چلّائے "اس کلام اللہ کا واسطہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاؤ ورنہ بد بختو، گاؤں کا گاؤں کٹ مرے گا، جاؤ، تمہیں خدا اور رسول کا واسطہ، قرآن پاک کا واسطہ، جاؤ، چلے جاؤ۔"

لوگ سر جھکا کر اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ مولا نے جلدی سے تاجے سے پٹکا لے کر ادب سے گھٹنے چھپا لیے اور سیڑھیوں پر سے اتر گیا۔ پیر صاحب قرآن مجید کو بغل میں لیے اس کے پاس آئے اور بولے "اللہ تعالیٰ تمہیں صبر دے اور آج کے اس نیک کام کا اجر دے!"

مولا آگے بڑھ گیا۔ تاجا اس کے ساتھ تھا اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچے تو مولا نے پلٹ کر رنگے کی چوپال پر ایک نظر ڈالی۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" تاجے نے بڑے دکھ سے کہا۔

اور مولا نے اپنے ننگے بازو کو آنکھوں پر رگڑ کر کہا "تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟"

"لوگ کیا کہیں گے؟" تاجے نے مشورہ دیا۔

ہاں تاجے!" مولا نے دوسری بار بازو کو آنکھوں پر رگڑا "میں بھی تو یہی سوچ رہا ہوں کہ لوگ کیا کہیں گے، میرے باپ کے خون پر مکھیاں اُڑ رہی ہیں اور میں یہاں گلی میں ڈرے ہوئے کتے کی طرح دم دبائے بھاگا جا رہا ہوں ماں کے گھٹنے سے لگ کر رونے کے لیے!"

لیکن مولا ماں کے گھٹنے سے لگ کر رویا نہیں۔ وہ گھر کے دالان میں داخل ہوا تو رشتہ دار اُس کے باپ کی لاش کو تھانے اٹھالے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ منہ پیٹتی اور بال نوچتی ماں اُس کے پاس آئی اور "شرم تو نہیں آتی" کہہ کر منہ پھیر کر لاش کے پاس چلی گئی۔ مولا کے تیور اسی طرح تنے رہے۔ اس نے بڑھ کر باپ کی لاش کو کندھا دیا اور برادری کے ساتھ تھانے روانہ ہو گیا۔

اور ابھی لاش تھانے نہیں پہنچی ہوگی کہ رنگے کی چوپال پر قیامت مچ گئی۔ رنگا چوپال کی سیڑھیوں پر سے اُتر کر سامنے اپنے گھر میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہیں سے ایک گنڈاسا لپکا اور انتڑیوں کا ایک ڈھیر اس کے پھٹے ہوئے پیٹ سے باہر اُبل کر اس کے گھر کی دہلیز پر بھاپ چھوڑنے لگا۔ کافی دیر کی افراتفری کے بعد رنگے کے بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر رپٹ کے لیے گاؤں سے نکلے، مگر جب وہ تھانے پہنچے تو یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئے کہ جس شخص کے خلاف وہ رپٹ لکھوانے آئے ہیں، وہ وہیں اپنے باپ کی لاش کے پاس بیٹھا تسبیح پر قل ھو اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ تھانیدار سے انھوں نے بہت ہیر پھیر کی کوشش کی اور اپنے باپ کا قاتل مولا ہی کو ٹھہرایا مگر تھانیدار نے انھیں سمجھایا کہ "خواہ مخواہ اپنے باپ کے قتل کو ضائع کر بیٹھو گے، کوئی عقل کی بات کرو۔ اِدھر یہ میرے پاس بیٹھا اپنے باپ کے قتل کی رپٹ لکھوا رہا ہے اُدھر تمھارے باپ کے پیٹ میں گنڈاسا بھونک آیا ہے؟"

آخر دونوں طرف سے چالان ہوئے لیکن دونوں قتلوں کا وافر چشم دید ثبوت نہ ملنے کی بنا پر طرفین بری ہو گئے اور جس روز مولا رہا ہو کر گاؤں میں آیا تو اپنی ماں سے ماتھے پر ایک طویل بوسہ ثبت کرانے کے بعد سب سے پہلے تاجے کے ہاں گیا۔ اسے بھینچ بھینچ کر گلے سے لگایا اور کہا "اس روز تم اور تمھارا گھوڑا میرے کام نہ آتے تو آج میں پھانسی کی رسی میں توری کی طرح لٹک رہا ہوتا۔ تمھاری جان کی قسم جب میں نے رنگے کے پیٹ کو کھول کر رکاب میں پاؤں رکھا ہے تو ایسا لگا کہ گھوڑے کو بھی قتل کا پتہ چل گیا ہے۔ آندھی بن گیا خدا کی قسم۔ اسی لیے تو لاش ابھی تھانے نہیں پہنچی تھی کہ میں ہاتھ جھاڑ کر داپس بھی آ گیا۔"

سارے گاؤں کو معلوم تھا کہ رنگے کا قاتل مولا ہی ہے، مگر مولا کے چند عزیزوں اور تاجے کے سوا کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ پھر ایک دن گاؤں میں یہ خبر گشت لگانے لگی کہ مولا کا باپ تو رنگے کے بڑے بیٹے قادرے کے گنڈاسے سے مرا تھا

رنگا تو صرف ہنکار رہا تھا بیٹوں کو۔ رات کو چوپالوں اور گھروں میں یہ موضوع چلتا رہا اور صبح کو پتہ چلا کہ قادرا اپنے کوٹھے کی چھت پر مردہ پایا گیا ہے، اور وہ بھی یوں کہ جب اُس کے بھائیوں پھلے اور گلّے نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس کا سر لڑھک کر نیچے گرا اور پرنالے تک لڑھکتا چلا گیا۔ رپٹ لکھوائی گئی، پولیس آئی، مولا پھر گرفتار ہو گیا۔ مرچوں کا دھواں پیا، تپتی دوپہروں میں لوہے کی چادر پر کھڑا رہا، کتنی راتیں اسے اونگھنے تک نہ دیا گیا، مگر وہ اقبالی نہ ہوا اور آخر مہینوں کے بعد رہا ہو کر گاؤں میں آنکلا اور جب اپنے آنگن میں قدم رکھا تو اس کی ماں بھاگی ہوئی آئی، اس کے ماتھے پر ایک طویل بوسہ دیا اور بولی "ابھی دو اور باقی ہیں میرے لال۔ رنگے کا کوئی نام لیوا نہ رہے تو جبھی بخشیں دھاریں بختوں کی میرے دودھ میں تیرے باپ کا خون تھا مولے، اور تیرے خون میں میرا دودھ ہے، اور تیرے گنڈاسے پر میں نے زنگ نہیں چڑھنے دیا۔"

مولا اب علاقے بھر کی ہیبت بن گیا تھا۔ اس کی مونچھوں میں دو دو بل آ گئے تھے۔ کانوں میں سونے کی دو بڑی بڑی مرکیاں جھجھانے لگی تھیں۔ آنکھوں میں سرمے کی دھار کو کبھی کسی نے مٹا ہوا نہ دیکھا۔ خوشبودار تیل اس کے لہریے بالوں میں آگ کی قلمیں سی لگائے رکھتا۔ ہاتھی دانت کا ہلالی کنگھا اتر کر اس کی کنپٹی پر چمکنے لگا تھا۔ وہ گلیوں میں چلتا تو لٹھے کے تہبند کا کم سے کم آدھا گز تو اس کے عقب میں لوٹتا ہوا جاتا۔ باریک ململ کا پٹکا اس کے کندھے پر پڑا رہتا، اور اکثر اس کا ایک سرا گر کر زمین پر گھسٹنے لگتا اور گھسٹتا چلا جاتا۔ مولا کے ہاتھ میں ہمیشہ اس کے قد سے بھی کہیں لمبی تیل پلی لٹھ ہوتی اور جب وہ گلی کے کسی موڑ یا کسی چوراہے پر بیٹھتا تو یہ لٹھ جس انداز سے اس کے گھٹنے سے لگتی اسی انداز سے لگی رہتی اور گلی میں سے گزرنے والوں کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ وہ مولا کو لٹھ ایک طرف سرکانے کے لیے کہہ سکیں۔ اگر کبھی

لٹھ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک تن گئی تو لوگ آتے، مولا کی طرف دیکھتے اور پلٹ کر کسی دوسری گلی میں چلے جاتے۔ عورتوں اور بچوں نے تو وہ گلیاں ہی چھوڑ دی تھیں جہاں مولا بیٹھنے کا عادی تھا۔ مشکل یہ تھی کہ مولا کی لٹھ پر سے الانگنے کا بھی کسی میں حوصلہ نہ تھا۔ ایک بار کسی اجنبی نوجوان کا اس گلی میں سے گزر ہوا۔ مولا اس وقت ایک دیوار سے لگا لٹھ سے دوسری دیوار کریدے جا رہا تھا۔ اجنبی آیا اور لٹھ پر سے الانگ گیا۔ ایکا ایکی مولا نے بھر کر ڈبیک میں سے گنڈاسا نکالا اور لٹھ پر چڑھا کر بولا "ٹھہر جا ڈچھوکرے، جانتے ہو تم نے کسی کی لٹھ الانگی ہے؟ یہ مولا کی لٹھ ہے مولے گنڈاسے والے کی۔"

نوجوان مولا کا نام سنتے ہی یک لخت زرد پڑ گیا اور مولے سے بولا "مجھے پتہ نہیں تھا مولے"۔

مولے نے گنڈاسا اتار کر ڈبیک میں اڑس لیا اور لٹھ کے ایک سرے کو نوجوان کے پیٹ پر ہلکے سے دبا کر بولا "تو پھر جا اپنا کام کر"۔ اور پھر وہ لٹھ کو یہاں سے وہاں تک پھیلا کر بیٹھ گیا۔

مولا کا لباس، اس کی چال، اس کی مونچھیں اور مرکیں، اور سب سے زیادہ اس کا لاابالیانہ انداز، یہ سب پہلے گاؤں کے فیشن میں داخل ہوئے اور پھر علاقے بھر کے فیشن پر اثر انداز ہوئے۔ لیکن مولا کی جو چیز فیشن میں داخل نہ ہو سکی وہ اس کی لانبی لٹھ تھی۔ تیل پلی، پیتل کے کوکوں سے اٹی ہوئی، لوہے کی شاموں میں لپٹی ہوئی، گلیوں کے کنکروں پر بجتی اور یہاں سے وہاں تک پھیل کر آنے والوں کو پلٹا دینے والی لٹھ۔ اور پھر وہ گنڈاسا جس کی میان مولا کی ڈبیک تھی اور جس پر اس کی ماں زنگ کا ایک نقطہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ مولا گلیوں کے نکڑوں پر لٹھ پھیلائے اور گنڈاسا چھپائے پھلے اور رنگے کی راہ تکتا رہتا ہے۔ قادرے کے قتل اور مولا کی رہائی کے بعد پھلا فوج میں بھرتی ہو کر چلا گیا تھا، اور رنگے نے علاقے کے مشہور رسہ گیر چودھری مظفر الٰہی کے ہاں پناہ لی تھی، جہاں وہ چودھری کے دوسرے ملازموں کے ساتھ چناب اور راوی پر سے بیل اور گائیں بھینسیں چوری کر کے

لاتا۔ چودھری مظفر اس مال کو منڈیوں میں بیچ کر امیروں، وزیروں اور لیڈروں کی بڑی بڑی دعوتیں کرتا اور اخباروں میں نام چھپواتا اور جب چناب اور راوی کے کھوجی مویشیوں کے کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری مظفر کے قصبے کے قریب تک پہنچتے تو جی میں کہتے "ہمارا ماتھا پہلے ہی ٹھنکا تھا!" انھیں معلوم تھا کہ اگر وہ کھروں کے سراغ کے ساتھ ساتھ چلتے چودھری کے گھر تک جا پہنچے تو پھر کچھ دیر بعد لوگ مویشیوں کی بجائے خود کھوجیوں کا کھوج لگاتے پھریں گے اور لگا نہ پائیں گے۔ وہ چودھری کے خوف سے قصبے کے ایک طرف سے نکل کر اور تھلوں کے ریتے میں پہنچ کر یہ کہتے ہوئے واپس آجاتے "کھروں کے نشاں یہاں سے غائب ہو رہے ہیں!"

مولا نے چودھری مظفر اور اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اسے کچھ ایسا لگتا تھا جیسے علاقہ بھر میں یہ چودھری ہی ہے جو اس کی لٹھ الانگ سکتا ہے لیکن فی الحال اسے رنگے کے دونوں بیٹوں کا انتظار تھا۔

تاجے نے اسے بہت سمجھایا کہ تجھے باپ کے خون کا بدلہ لینا تھا سو لے لیا۔ اب یہ چھٹے ہوئے بدمعاشوں کے سے چلن تجھے زیب نہیں دیتے۔ "کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا!" تاجے نے بڑے بھائیوں کی طرح مولا کو ڈانٹا "اور نہیں تو اپنی زمینوں کی نگرانی کر لیا کر یہ کیا بات ہوئی کہ صبح سے شام تک گلیوں میں لٹھ پھیلائے بیٹھے ہیں اور میراسیوں نائیوں کی سے خدمتیں لی جا رہی ہیں۔ تو شاید نہیں جانتا پر جان لے تو اس میں تیرا ہی بھلا ہے کہ مائیں بچوں کو تیرا نام لے کر ڈرانے لگی ہیں، لڑکیاں تو تیرا نام سنتے ہی تھوک دیتی ہیں، کسی کو بددعا دینی ہو تو کہتی ہیں، اللہ کرے تجھے مولا بیاہ لے جائے۔ سنتے ہو مولے؟"

لیکن مولا تو جس بھٹی میں کودا تھا اُس میں پک کر پختہ ہو چکا تھا۔ بولا "ابے تاجے، اپنا کام کر۔ گاؤں بھر کی گالیاں سمیٹ کر میرے سامنے ان کا ڈھیر لگانے آیا ہے؟ دوستی رکھنا بڑی جی داری کی بات ہے پٹھے، تیرا جی چھوٹ گیا تو میری آنکھوں میں دھول

کیوں جھونکتا ہے، جا اپنا کام کر، میرے گنڈاسے کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی ——— جا!" اس نے لاٹھی کو کنکروں پر بجایا اور گلی کے سامنے والے مکان میں میراسی کو ہانک لگائی "ابے اب تک چلم تازہ نہیں کر چکا الو کے پٹھے! جا کر گھر والی کی گود میں سو گیا کیا چلم لا!"

تاجا پلٹ گیا، مگر گلی کے موڑ پہ جا کر رک گیا اور مڑ کر مولے کو کچھ یوں دیکھا جیسے اس کی جوانمرگی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دے گا۔

مولا کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اٹھا اور لٹھ کو اپنے پیچھے گھسیٹتا ہوا تاجے کے پاس آ کر بولا "دیکھ تاجے مجھے ایسا لگتا ہے تو مجھ پر ترس کھا رہا ہے، اس لیے کہ کسی زمانے میں تیری میری یاری تھی، پر اب یہ یاری ٹوٹ گئی ہے تاجے، تو میرا ساتھ نہیں دے سکتا تو پھر ایسی یاری کو لے کر چاٹنا ہے؟ میرے باپ کا خون اتنا سستا نہیں تھا کہ رنگے اور اس کے ایک ہی بیٹے کے خون سے حساب چک جائے۔ میرا گنڈاسا تو ابھی اس کے پوتے پوتیوں، نواسوں نواسیوں تک پہنچے گا، اس لیے جا اپنا کام کر، تیری میری یاری ختم، اس لیے مجھ پر ترس نہ کھایا کر، کوئی مجھ پہ ترس کھائے تو آنچ میرے گنڈاسے تک جا پہنچتی ہے، جا!"

واپس آ کر مولا نے میراسی سے چلم لے کر کش لگایا تو سلفہ ابھر کر بکھر گیا۔ ایک چنگاری مولا کے ہاتھ پر گری اور ایک لمحہ تک وہیں چمکتی رہی۔ میراسی نے چنگاری کو جھاڑنا چاہا تو مولا نے اس کے ہاتھ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ میراسی بل کھا کر رہ گیا اور ہاتھ کو ران اور پنڈلی میں دبا کر ایک طرف ہٹ گیا اور مولا گرجا "ترس کھاتا ہے حرامزادہ!"

اس نے چلم اٹھا کر سامنے دیوار پہ پٹخ دی اور لٹھ اٹھا کر ایک طرف چل دیا۔

لوگوں نے مولا کو ایک نئی گلی کے چوراہے پر بیٹھے دیکھا تو چونکے اور سرگوشیاں کرتے ہوئے ادھر ادھر بکھر گئے۔ عورتیں سر پر گھڑے رکھے آئیں اور "ہائیں" کرتی واپس چلی

گئیں۔ مولا کی لٹھ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور لوگوں کے خیال میں اس پر خون سوار تھا۔ مولا اس وقت دور مسجد کے مینار پر بیٹھی ہوئی چیل کو تکے جا رہا تھا۔

اچانک اسے کنکروں پر لٹھ کے بجنے کی آواز آئی۔ چونک کر اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے اس کی لٹھ اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دی ہے اور ان لانبی لانبی سرخ سرخ مرچوں کو چن رہی ہے جو جھکتے ہوئے اس کے سر پر رکھی ہوئی گٹھڑی میں سے گر گئی تھیں۔ مولا سناٹے میں آگیا، لٹھ کو الانگنا تو ایک طرف رہا، اس نے یعنی ایک عورت ذات نے لٹھ کو گندے چیتھڑے کی طرح اٹھا کر پرے ڈال دیا ہے اور اب بڑے اطمینان سے مولا کے سامنے بیٹھی مرچیں چن رہی ہے، اور جب مولانے کڑک کر کہا "جانتی ہو تم نے کس کی لاٹھی پر ہاتھ رکھا ہے؟ جانتی ہو میں کون ہوں؟" تو اس نے ہاتھ بلند کر کے چنی ہوئی مرچوں کو گٹھڑی میں ٹھونستے ہوئے کہا "کوئی سڑی لگتے ہو!"

مولا مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا، لڑکی بھی اٹھی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے بولی "اسی لیے تو میں نے تمہاری لٹھ تمہارے سر پر نہیں دے ماری۔ ایسے لٹے لٹے سے لگتے تھے تم، مجھے تو تم پر ترس آگیا تھا۔

"ترس آگیا تھا تمہیں، مجھ پر؟ مولا پر؟" مولا دھاڑا!

"مولا!" لڑکی نے گٹھڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور ذرا سی چونک گئی۔

"ہاں مولا، گنڈاسے والا۔" مولانے بڑے ٹھسے سے کہا۔

اور لڑکی ذرا سی مسکرا کر گلی میں جانے لگی۔

مولا کچھ دیر وہاں چپ چاپ کھڑا رہا، پھر ایک لمبی سانس لے کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ لٹھ کو سامنے کی دیوار تک پھیلایا تو پرلی طرف سے ادھیڑ عمر کی ایک عورت آتی دکھائی دی۔ وہ مولا کو دیکھ کر ٹھٹکی، مولانے لٹھ اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور بولا "آجاؤ ماسی، آجاؤ، میں تمہیں کھا تھوڑی جاؤں گا!"

جو اس باختہ عورت آئی اور مولا کے پاس سے گزرتے ہوئے بولی "کیسا جھوٹ

بکتے ہیں لوگ، کہتے ہیں جہاں مولا بخش بیٹھا ہو وہاں سے باؤلا کتا بھی دبک کر گزرتا ہے، پر تو نے میرے لیے اپنی لٹھ ــــــ''

''کون کہتا ہے؟'' مولا اُٹھ کھڑا ہوا۔

''سب کہتے ہیں، سارا گاؤں کہتا ہے۔ ابھی ابھی کنوئیں پر یہی باتیں ہو رہی تھیں، پر میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ مولا بخش ــــــ''

لیکن مولا اب تک اس گلی میں لپک گیا تھا جس میں ابھی ابھی نوجوان لڑکی گئی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا گیا اور آخر دور لمبی گلی کے سرے پر وہی لڑکی جاتی نظر آئی۔ وہ بھاگنے لگا۔ آنگنوں میں بیٹھی ہوئی عورتیں دروازوں تک آگئیں اور بچے چھتوں پر چڑھ گئے۔ مولا کا گلی میں سے بھاگ کر نکلنا کسی حادثے کا ہی پیش خیمہ سمجھا گیا۔ لڑکی نے بھی مولا کے قدموں کی چاپ سن لی، پلٹی اور پھر وہیں جمی کھڑی رہ گئی۔ اس نے بس اتنا ہی کیا کہ گٹھری کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا، چند مرچیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح اس کے پاؤں میں بکھر گئیں۔

''میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔'' مولا پکارا ''کچھ نہیں کہوں گا تمہیں۔''

لڑکی بولی ''میں ڈر کے نہیں رُکی۔ ڈریں میرے دشمن۔''

مولا رک گیا، پھر ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے پاس آیا اور بولا ''بس اتنا بتا دو تم ہو کون ــــــ کون ہو تم؟''

لڑکی ذرا مسکرا دی۔

عقب سے کسی بڑھیا کی آواز آئی ''یہ رنگے کے چھوٹے بیٹے کی منگیتر راجو ہے مولا بخش!''

مولا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راجو کو دیکھنے لگا۔ اسے راجو کے پاس رنگا اور رنگے کا سارا خاندان کھڑا نظر آیا۔ اس کا ہاتھ ٹیک تک گیا اور پھر رسے کی طرح لٹک گیا۔ راجو پلٹ کر بڑی متوازن رفتار سے چلنے لگی۔

مولانے لاٹھی ایک طرف پھینک دی اور بولا "ٹھہرو راجو، یہ اپنی مرچیں لیتی جاؤ۔" راجو رک گئی۔ مولانے جھک کر ایک ایک مرچ چن لی اور پھر اپنے ہاتھ سے انہیں راجو کی گٹھری میں ٹھونستے ہوئے بولا "تمہیں مجھ پر ترس آیا تھا نا راجو؟"

لیکن راجو ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور اپنے راستے پر ہولی۔ مولا بھی واپس جانے لگا۔ کچھ دور ہی گیا تھا کہ بڑھیا نے اسے پکارا "یہ تمہاری لٹھ تو یہیں رکھی رہ گئی مولا بخش!"

مولا پلٹا اور لٹھ لیتے ہوئے بڑھیا سے پوچھا "ماسی، یہ لڑکی راجو کیا یہیں کی رہنے والی ہے؟ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔"

"یہیں کی ہے بیٹا اور نہیں بھی۔" بڑھیا بولی۔ "اس کے باپ نے لام میں دونوں بیٹوں کے مرنے کے بعد جب دیکھا کہ وہ روز ہل اٹھا کر اتنی دور کھیتوں میں نہیں جا سکتا تو گاؤں والے گھر کی چھت اکھیڑی اور یہاں سے یوں سمجھو کوئی دو ڈھائی کوس دور ایک ڈھوک بنالی وہیں راجو اپنے باپ کے پاس رہتی ہے۔ تیسرے چوتھے گاؤں میں سودا سلف خریدنے آجاتی ہے اور بس۔"

مولا جواب میں صرف 'ہوں' کہہ کر واپس چلا گیا، لیکن گاؤں بھر میں یہ خبر آندھی کی طرح پھیل گئی کہ آج مولا اپنی لٹھ ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ باتوں باتوں میں راجو کا ایک دو بار نام آیا مگر پھر دب گیا۔ رنگے کے گھرانے اور مولا کے درمیان صرف گنڈاسے کا رشتہ تھا تا، اور راجو رنگے ہی کے بیٹے کی منگیتر تھی —— اور اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی!

اس واقعہ کے بعد مولا گلیوں سے غائب ہو گیا۔ سارا دن گھر میں بیٹھا لاٹھی سے دالان کی مٹی کریدتا رہتا اور اگر کبھی باہر جاتا بھی تو کھیتوں، چراگاہوں میں پھر پھرا کے واپس آجاتا۔ ماں اس کے رویے پر چونکی، مگر صرف چونکنے پر اکتفا کی۔ وہ جانتی تھی کہ مولا کے سر پر بہت سے خون سوار ہیں، وہ بھی جو بہا دیے گئے اور وہ بھی جو بہائے

نہ جا سکے۔

یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ نقارے پٹ پٹا کر خاموش ہو گئے تھے۔ گھروں میں سحری کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دہی بلونے اور توے پر روٹیوں کے پڑنے کی آوازیں مندروں کی گھنٹیوں کی طرح پر اسرار معلوم ہو رہی تھیں۔ مولا کی ماں بھی چولہا جلائے بیٹھی تھی اور مولا مکان کی چھت پر ایک چارپائی پر لیٹا آسمان کو گھورے جا رہا تھا۔ یکایک کسی گلی میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ مولا نے فوراً لٹھ پر گنڈاسا چڑھایا اور چھت پر سے اُتر کر گلی میں بھاگا۔ ہر طرف گھروں سے لالٹینیں نکلی آ رہی تھیں اور شور بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر مولا کو معلوم ہوا کہ تین مسافر جو نیزوں، برچھیوں سے لیس تھے، بہت سے بیلوں اور گائے بھینسوں کو گلی میں سے ہنکائے لیے جا رہے تھے کہ چوکیدار نے انھیں ٹوکا اور جواب میں انھوں نے چوکیدار کو گالی دے کر کہا کہ "یہ مال چودھری مظفر الٰہی کا ہے، یہ گلی تو خیر ایک ذلیل سے گاؤں کی گلی ہے، چودھری کا مال تو لاہور کی ٹھنڈی سڑک پر سے بھی گزرے تو کوئی اُف تک نہ کرے!"

مولا کو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے چودھری مظفر خود بنفس نفیس گاؤں کی اس گلی میں کھڑا اس سے گنڈاسا چھیننا چاہتا ہے۔ کڑک کر بولا "چوری کا مال میرے گاؤں میں سے نہیں گزرے گا، چاہے یہ چودھری مظفر کا ہو چاہے لاٹ صاحب کا۔ یہ مال چھوڑ کر چپکے سے اپنی راہ لو ورنہ اپنی جان کے دشمن نہ بنو!" اس نے لٹھ کو جھٹکا کر گنڈاسے کو لالٹینوں کی روشنی میں چمکایا "جاؤ۔"

مولا گھرے ہوئے مویشیوں کو لٹھ سے ایک طرف ہنکانے لگا۔ "جا کر کہہ دو اپنے چودھری سے کہ مولا گنڈاسے والے نے تمھیں سلام بھیجا ہے، اور اب جاؤ اپنا کام کرو۔"

مسافروں نے مولا کے ساتھ سارے ہجوم کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو چپ چاپ کھسک گئے۔ مولا سارے مال کو اپنے گھر لے آیا اور سحری کھاتے ہوئے ماں سے کہا کہ "یہ

سب بے زبان ہمارے مہمان ہیں، ان کے مالک پرسوں تک آنکلیں گے کہیں سے، اور گاؤں کی عزت میری عزت ہے ماں!"

مالک دوسرے ہی دن دوپہر کو پہنچ گئے۔ یہ غریب کسان اور مزارعے کوسوں کی مسافت طے کرکے کھوجیوں کی ناز برداریاں کرتے یہاں تک پہنچے تھے اور یہ سوچتے آرہے تھے کہ اگر ان کا مال چودھری کے حلقۂ اثر میں پہنچ گیا تو پھر کیا ہوگا، اور جب مولا ان کا مال اُن کے حوالے کر رہا تھا تو سارا گاؤں گلی میں جمع ہوگیا تھا اور اس ہجوم میں راجو بھی تھی۔ اس نے اپنے سر پر اینڈوا جماکر مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا اور پھر منتشر ہوتے ہوئے ہجوم میں جب راجو مولا کے پاس سے گزری تو مولا نے کہا "آج بہت دنوں کے بعد گاؤں میں آئی ہو راجو۔"

"کیوں؟" اس نے کچھ یوں کہا جیسے "میں کسی سے ڈرتی تھوڑی ہوں" کا تاثر پیدا کرنا چاہتی ہے۔ "میں تو کل بھی آئی تھی اور پرسوں بھی اور ترسوں بھی۔ ترسوں تھوم پیاز خریدنے آئی۔ پرسوں بابا کو حکیم کے پاس لائی، کل ویسے ہی آگئی اور آج یہ گھی بیچنے آئی ہوں۔"

"کل ویسے ہی کیوں آگئیں؟" مولا نے بڑے شوق سے پوچھا۔

"ویسے ہی بس جی چاہا آگئے، سہیلیوں سے ملے اور چلے گئے، کیوں؟"

"ویسے ہی ـــــ"، مولا نے بجھ کر کہا، پھر ایک دم اسے ایک خیال آیا "یہ گھی بیچوگی؟"

"ہاں، بیچنا تو ہے، پر تیرے ہاتھ نہیں بیچوں گی۔"

"کیوں؟"

"تیرے ہاتھوں پر میرے رشتہ داروں کا خون ہے۔"

مولا کو ایک دم خیال آیا کہ وہ اپنی لٹھ کو دالان میں اور گنڈاسے کو بستر تلے رکھ کر بھول آیا ہے۔ اس کے ہاتھوں میں چیل سی ہونے لگی۔ اس نے گلی میں سے ایک کنکر اٹھایا

اور اُسے انگلیوں میں ملنے مسلنے لگا۔

راجو جانے کے لیے مڑی تو مولا ایک دم بولا "دیکھو راجو میرے ہاتھوں پر تو خون ہے ہی، اور ان پر ابھی جانے کتنا اور خون چڑھے گا، پر تمہیں گھی بیچنا ہے اور ہمیں خریدنا ہے، میرے ہاتھ نہ بیچو، میری ماں کے ہاتھ بیچ دو۔"

راجو کچھ سوچ کر بولی "چلو۔۔۔ آؤ۔"

مولا آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے جانے اسے کیا وہم گزرا کہ راجو اس کی پیٹھ اور پیٹوں کو گھورے جا رہی ہے۔ ایک دم اس نے پلٹ کر دیکھا۔ راجو گلی میں چگتے ہوئے مرغی کے چوزوں کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی آ رہی تھی۔ وہ فوراً بولا "یہ چوزے میرے ہیں۔"

"ہوں گے۔" راجو بولی۔

مولا اب آنگن میں داخل ہو چکا تھا، بولا "ماں یہ سب گھی خرید لو، میرے مہمان آنے والے ہیں تھوڑے دنوں میں۔"

راجو نے برتن اتار کر اس کے دہانے پر سے کپڑا کھولا تا کہ بڑھیا گھی سونگھ لے مگر وہ اندر چلی گئی تھی ترازو لینے، اور مولا نے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کریں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں، اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں، اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب کے پھول سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے، اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے، جو کچھ یوں اُچٹا ہوا سا لگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں، اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بے طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی

نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یونہی چھوڑ دے یا اسے اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گننے لگے۔

ماں ترازو دے کر آئی تو راجو بولی "پہلے دیکھ لے ماسی، رگڑ کر سونگھ لے۔ آج صبح ہی کو تازہ تازہ مکھن گرم کیا تھا۔ پر سونگھ لے پہلے!"

"نہ بیٹی میں تو نہ سونگھوں گی" ماں نے کہا "میرا تو روزہ مکروہ ہوتا ہے!" پھر وہ راجو کو گھور گھور کر دیکھنے لگی اور کچھ دیر کے بعد بولی۔

"تو غلام علی کی بیٹی تو نہیں؟"

"ہاں"

"تو پھر جا" ماں نے ترازو اٹھا کر ایک طرف پٹخ دی۔ "تجھے حوصلہ کیسے ہوا میرے یہاں قدم دھرنے کا۔ رشتہ قتلوں کا اور سودے گھی کے، جا!"

پھر وہ مولا کی طرف مڑی "جن پر گنڈاسے چلاتے ہیں ان سے گھی کا لین دین نہیں ہوتا میری جان۔ یہ گلے کی منگیتر ہے، گلے کی۔ رنگے کے بیٹے کی!"

راجو جس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا تھا جلدی سے برتن پر کپڑا باندھ کر اٹھی اور بولی "تمہارے سینوں میں دل ہیں یا خشخاش کے دانے"

مولا کے منہ پر جیسے ایک طرف اس کی ماں نے اور دوسری طرف راجو نے تھپڑ مار دیا تھا۔ وہ بھنا کر رہ گیا اور جب راجو چلی گئی تو جلتی دوپہر میں اوپر چھت پر چڑھ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک یونہی دھوپ میں لیٹا رہا اور جب اس کی ماں اسے اٹھانے آئی تو وہ رو رہا تھا۔

"تم تو رو رہے ہو مولے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور مولا بولا "تو کیا اب روؤں بھی نہیں؟"

ماں چکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ بیٹے کے سوال میں اپنے سوال کا جواب ڈھونڈ

رہی تھی۔

اب مولا گھر میں بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ سارا سارا دن لاری کے اڈے پر نورے نائی کے ہاں پڑا رہتا۔ نورے نے وہاں چائے کی دکان کھول رکھی تھی۔ شام سے پہلے جب لاری آتی تو گاؤں بھر کے نوجوانوں اور بچوں کا وہاں ہجوم لگ جاتا۔ سب نورے کی چائے پیتے اور ڈرائیوروں سے شہروں کی خبریں پوچھتے، اور مولا ان سب سے الگ ایک کھٹولے پر لیٹا آسمان کو گھورتا رہتا۔ لوگ اب مولا کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ اس کے پاس سے حقہ تک اٹھا لاتے تھے مگر کسی کو اس کی لٹھ کو چھونے یا الانگنے کی جرأت نہ ہوئی جو وہاں کھٹولے کے ساتھ لگی لاری کے انجن تک تنی رہتی تھی۔

پھر ایک روز جب شام سے پہلے لاری آکر رکی اور اس میں سے مسافر اترنے لگے تو ایکا ایکی جیسے سارے اڈے پر الّو بول گیا۔ لاری میں سے رنگے کا بیٹا گلّا اترا، اس کے پیچھے چار بڑے قد آور گبرو اترے اور پھر پانچوں ایک طرف جا کر کچھ باتیں کرنے لگے۔

مولا اس سناٹے سے چونکا اور چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ہجوم سمٹ کر نورے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا ہے اور سامنے گلا کھڑا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے تیزی سے چارپائی پر سے پاؤں لٹکائے اور ٹیبک میں سے گنڈاسا نکال کر لٹھ پر چڑھا لیا۔

"حقہ لانا نورے" وہ پکارا، اور زرد رو نورا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پاس حقہ رکھ کر غڑاپ سے دکان کے اندر چلا گیا۔

اب پانچوں نووارد لاری سے کچھ فاصلے پر قطار میں کھڑے گھور گھور کر مولا کو دیکھنے لگے جس نے بے پروائی سے ایک لمبا کش لگا کر دھواں آسمان کی طرف اڑا دیا۔

"مولے" گلے نے اسے للکارا۔

"کہو" مولا نے ایک اور کش لگا کر اب کے دھواں گلے کی طرف اڑا دیا۔

"ہم تم سے کچھ کہنے آئے ہیں۔"

"کہو کہو"

"گنڈاسا ایک طرف رکھ دو۔ ہم بھی خالی ہاتھ ہیں۔"

"لو۔" مولا نے لٹھ کو ایک طرف گرا دیا۔

پانچوں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہجوم جیسے دیوار سے چمٹ کر رہ گیا۔ بچے بہت پیچھے ہٹ کر کمہاروں کے آوے پر چڑھ گئے تھے۔

"کیا بات ہے؟" مولا نے گلے سے پوچھا۔

گلا جو اب اس کے پاس پہنچ گیا تھا بولا "تم نے چودھری مظفر کا مال روکا تھا!"

"ہاں۔" مولا نے بڑے اطمینان سے کہا "پھر؟"

گلے نے کنکھیوں سے اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور گلا صاف کر کے بولا "چودھری نے تمہیں اس کا انعام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ ہم یہ انعام ان سارے گاؤں والوں کے سامنے تمہارے حوالے کر دیں۔"

"انعام!" مولا چونکا۔ "آخر بات کیا ہے؟"

گلے نے تڑاخ سے ایک چانٹا مولا کے منہ پر مارا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے پیچھے ہٹتے ہوئے بولا "یہ بات ہے۔"

تڑپ کر مولا نے لٹھ اٹھالی، ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں گنڈاسا شعلے کی طرح چمکا۔ پانچوں نووارد غیر انسانی تیزی سے واپس بھاگے مگر گلا لاری کی پرلی طرف کنکروں پر پھسل کر گر گیا۔ لپکتا مولا رک گیا، اٹھا ہوا گنڈاسا جھکا اور جس زاویے پر جھکا تھا وہیں جھکا رہ گیا۔

دم بخود ہجوم دیوار سے اچٹ اچٹ کر آگے آ رہا تھا، بچے آوے کی راکھ اڑاتے بھاگتے ہوئے اتر آئے، تورا دکان میں سے باہر آ گیا۔

گلے نے اپنی انگلیوں اور پنجوں کو زمین میں یوں گاڑ رکھا تھا جیسے دھرتی کے

سینے میں اتر جانا چاہتا ہے۔

اور پھر مولا، جو معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لیے سکتے میں آگیا ہے، ایک قدم آگے بڑھا۔ لٹھ دور دکان کے سامنے اپنے کھٹولے کی طرف پھینک دی اور گلے کو بازو سے پکڑ کر بڑی نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولا "چودھری کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ انعام مل گیا ہے رسید میں خود پہنچانے آؤں گا"

اس نے ہوتے ہوئے گلے کے کپڑے جھاڑے، اس کے ٹوٹے ہوئے طرے کو سیدھا کیا اور بولا "رسید تم ہی کو دے دیتا پر تمہیں تو دولہا بننا ہے ابھی —— اس لیے جاؤ، اپنا کام کرو"

گلا سر جھکائے ہوئے ہولے ہولے چلتا گلی میں مڑ گیا۔

مولا آہستہ آہستہ کھاٹ کی طرف بڑھا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اور جب اس نے کھاٹ پر بیٹھنا چاہا تو اچانک کمہاروں کے آوے کی طرف سے اس کی ماں چیختی چلاتی بھاگتی ہوئی آئی اور مولا کے پاس آکر نہایت وحشت سے بولنے لگی "تجھے گلے نے تھپڑ مارا اور تو پی گیا چپکے سے! ارے تو تو میرا جلالی بیٹا تھا۔ تیرا گنڈاسا کیوں نہ اٹھا، تو نے ——!" وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے اچانک رک گئی اور بہت نرم آواز میں جیسے بہت دور سے بولی "تُو تو رو رہا ہے مولے؟"

مولے گنڈاسے والے نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو آنکھوں پر رگڑا اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بالکل معصوم بچوں کی طرح ہولے سے بولا "تو کیا اب روؤں بھی نہیں!"

چور

رحمان کا باپ جنگ میں مارا گیا، اور اماں اس امن میں ماری گئی جس کا نسخہ مغربی مدبروں نے ایشیائی مزاج کے لیے خاص طور سے تجویز کر رکھا تھا۔ باپ رنگون اور امپھال کے درمیان ایک جاپانی بم کی زد میں آکر بکھر گیا اور اماں گاؤں اور ہسپتال کے درمیان چلتے چلتے دم توڑ بیٹھی۔ ہسپتال والے کہتے تھے کہ اس کے پیٹ میں درد شدید ہو جائے گا تو جبھی وہ ہسپتال میں داخلے کی حقدار ہو سکے گی۔ ایک دن خوش قسمتی سے شدید درد اُٹھا تو وہ رحمان کو ساتھ لے کر ہسپتال کی طرف بھاگی، مگر راستے ہی میں گر کر لوٹنے اور چیخنے لگی، اور مرنے سے پہلے رحمان کا ایک ہاتھ اس زور سے مروڑ ڈالا کہ رحمان مارے غصے کے "اماں، کماں ٹھماں" کہہ کر پیچھے ہٹ گیا، اور رونے لگا۔

وہ ایک برس تک یونہی روتا رہا۔ اس کے قریبی رشتہ داروں میں صرف ایک پھوپھی زندہ تھی جو پردیس بیاہی گئی تھی۔ وہ اپنی بھابی کے پُرسے کے لیے گاؤں آئی اور واپس جاتے ہوئے اپنے بھائی کی نشانی کو ساتھ لیتی گئی۔ رحمان کے پھوپھا نے اپنے گاؤں میں کپڑے اور چمڑے کی دکان کھول رکھی تھی۔ وہ روز بروز امیر ہو رہا تھا، اور شاید اسی لیے خسیس بھی ہو رہا تھا۔ چند روز بیوی سے کہتا رہا کہ رحمان کو ایک روٹی سے زیادہ کھانا دینے کی ضرورت ہی کیا ہے کُل سات آٹھ سال کا تو لونڈا ہے، اور ندیدہ اتنا کہ روٹیوں کا ٹوکرا بھی بھر کر رکھو تو آن کی آن میں جھاڑ و پھیر دے۔ اس سے کہہ دو کہ آپے میں رہے ورنہ

گاؤں کی راہ لے۔ میں دن بھر دکان میں بیٹھا تمہارے بھتیجے کے لیے سر نہیں پھوڑتا رہتا کبھی میری بھی اولاد ہوگی پیر دستگیر محبوب سبحانی کی برکت سے!"——رحمان نے یہ باتیں سن لی تھیں۔ اس روز وہ دن بھر بھوسے کی کوٹھری میں چھپا روتا رہا۔ شام کو بھوک لگی تو پھوپھی کے پاس سمٹتا ہوا آیا جیسے اب تک وہ اس کی روٹیاں چرا چرا کر کھاتا رہا ہے۔ پھوپھی نے اس کے بالوں سے بھوسے کے تنکے چنے، پیار کیا اور اسے نصیحت کی کہ وہ ایک روٹی سے زیادہ کھانا نہ کھایا کرے ورنہ اس کا ہاضمہ بگڑ جائے گا اور وہ مر جائے گا۔ نصیحت کرنے کے بعد جب اس نے ایک بار پھر رحمان کے ماتھے پر پیار کیا تو رحمان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پھوپھی کے ہونٹ قینچی کے پھل ہیں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ پھوپھی نے اسے تسلیاں دیں مگر وہ یوں روئے جا رہا تھا جیسے پھوپھی کی ہر تسلی اس کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے گالی بن جاتی ہے۔ اس وقت اوپر سے پھوپھا آ گیا، اور جب بیوی نے اسے بتایا کہ رحمان دن بھر بھوسے کی کوٹھری میں بڑا اپنی ماں کی یاد میں روتا رہا ہے تو پھوپھا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ "ساٹھ ستر روپے کے بھوسے کا ناس مار دیا ہوگا لونڈے نے۔ میں حیران ہوں یہ تم شیشے کے گھر میں بندر کیوں پال رہی ہو۔ دیکھو رحمو! اگر تم نے پھر کبھی بھوسے کی کوٹھری میں قدم رکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ میرا ہاتھ بہت بھاری ہے، سمجھے؟"—— رحمان نے ڈر کر ایک ہی روٹی پر اکتفا کر لی اور بھوسے کی کوٹھری کی طرف بھولے سے بھی نہ دیکھا۔ لیکن ایک دن جب وہ شام کو ایک روٹی لینے کے لیے پھوپھی کے پاس آیا تو پھوپھا نے کڑک کر کہا "پوچھ لو اس حرامزادے سے!"

رحمان کو اس کی ماں نے بتایا تھا کہ گالی کے جواب میں گالی دینے والے کی زبان پر پھوڑا نکل آتا ہے، اور جو گالی سُن کر بدلہ نہ لے اُس کے لمبی سی دم نکل آتی ہے اور بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ گالی دینے والے کا منہ نوچ لو، ڈھیلا کھینچ مارو، لاٹھی چلاؤ، بے شک جان سے مار دو پر گالی کا جواب گالی میں نہ دو۔ ایک بار اس کے جی میں آئی کہ

چولہے میں سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر پھوپھا کے جبڑے پر دے مارے، مگر اس وقت اس کی پھوپھی اُٹھی اور اس کے پاس آکر بڑے پیار سے بولی "سچ سچ بتا دو بیٹے، کہاں رکھے ہیں؟"

"کیا؟"___ رحمان نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور پھوپھا گرجا "تیری ماں کے خصم!"

"روپے میرے بچے، روپے" اس کی پھوپھی فوراً بولی "سچ سچ بتا دو تو میں تمہیں اس میں سے ایک روپیہ دے دوں گی۔ کہاں رکھے ہیں؟ بھوسے کی کوٹھری میں تو نہیں کہیں؟"

رحمان کچھ کہنے کے لیے اپنے چمٹے ہوئے خشک ہونٹ ابھی کھول ہی رہا تھا کہ اس کا پھوپھا چارپائی پر سے اٹھا اور بیوی کو ہاتھ کے جھٹکے سے دھکیل دیا۔ "یوں گھی مکھن لگانے سے کام نہیں چلے گا۔ سُن بے لونڈے، تو نے میری واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے زیادہ نہ کم پورے پندرہ روپے نکالے ہیں، وہ سیدھی طرح یہاں میرے ہاتھ پر رکھ دے ورنہ یہیں بیٹھ کر تیرا قیمہ بنا ڈالوں گا، بتا۔" اس نے رحمان کو تھپڑ مارنے لیے ایک ہاتھ تان لیا۔

رحمان بگولے میں پھنسا ہوا کاغذ کا پرزہ ہو رہا تھا۔ پلکیں یوں جھپک رہا تھا جیسے آنکھوں میں مٹی گھس گئی ہے۔ ہونٹ کھلے تھے، میلے میلے گلابی رنگ میں سے گلاب غائب ہو گیا تھا، صرف میل باقی رہ گیا تھا۔ بس اتنا کہہ سکا "کون سی واسکٹ؟" اور پھر ایک دم اس کی اجڑی ہوئی آنکھوں میں آنسو کھیل گئے، اس کا نیچے والا ہونٹ ذرا سا لٹک گیا، ٹھوڑی میں چند شکنیں پیدا ہوئیں، نتھنے پھڑکے اور وہ زار زار رونے لگا۔

"کون سی واسکٹ!" پھوپھا یوں آگے بڑھا جیسے اسے روند کر نکل جائے گا۔

"ابے وہی سیپ کے بٹنوں والی اور کون سی!"

رحمان نے پھوپھی کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بہت اونچی آواز میں فریاد کی "مجھے خدا کی قسم، نبی جی کی قسم، مجھے پیر دستگیر کی قسم پھوپھی، میں نے واسکٹ کو چھوا بھی ہو تو میرے ہاتھ___"

مگر پھوپھی لپک کر آئی اور اپنے شوہر سے بولی "سیپ کے بٹنوں والی واسکٹ کہاں رکھی ہے؟ میں نے تو وہ کالی صوف والی واسکٹ دیکھی تھی!"

پھر رحمان کو تنہا چھوڑ کر دونوں اندر بھاگے، ذرا سی دیر کے بعد پلٹے تو پھوپھی کہہ رہی تھی "خواہ مخواہ میرے بچے پر تہمت لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟ اپنے روپے ایک بار پھر گن لو، ہمارے خاندان نے قتل کیے ہیں پر چوری کبھی نہیں کی، ہاں، ایک روپیہ ادھر لاؤ، یہ میرے بچے کا انعام ہے۔ خواہ مخواہ رلا دیا بے چارے کو، لے کے کھانا حرام کر ڈالا، ادھر لاؤ روپیہ!"

رحمان ایک دم خاموش ہو گیا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہتے جا رہے تھے، لیکن اس کی سسکیاں اور ہچکیاں تھم گئی تھیں۔

پھوپھی نے شوہر سے ایک روپیہ چھین لیا اور رحمان کی طرف بڑھی۔ پھوپھا بولا "آج نہیں تو کل چرائے گا۔ ندیدہ تو ہے ہی، یتیم لڑکا تو ندیدہ ہوتا ہی ہے، چاہے کسی ملک کے لاٹ صاحب کا لڑکا ہو!"

پھوپھی نے رحمان کے پاس آکر اسے اکٹھے بہت سے پیار کر ڈالے، پھر اس کی مٹھی کھول کر اس میں روپیہ رکھا اور اس کی انگلیوں کو بند کر کے اس کی بلائیں لیں۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی پکڑ کر اسے کھٹے میں لے آئی، مجبور کر کے کھانا کھلایا اور جب وہ دوسری روٹی میں سے ایک نوالہ توڑنے لگی تو رحمان پہلی بار بولا "نہیں پھوپھی بس!"

"کیوں؟" پھوپھی نے پیار بھرے غصے میں پوچھا۔

"ہاضمہ بگڑ جائے گا۔" رحمان بولا۔

پھوپھی یکایک رو دی اور چہرے کو گھٹنوں میں چھپا لیا۔

رحمان باہر نکلا تو پھوپھا چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا وہ اس کے پاس آیا اور روپیہ اس کی ران پر رکھ کر بولا "میں نہیں لیتا۔"

"نہ لے۔" پھوپھا نے روپیہ اٹھا لیا۔

"ہاں بس نہیں لیتا۔" رحمان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور پلٹ کر صحن سے باہر چلا گیا۔

وہ اس صحن میں پھر کبھی داخل نہ ہوا، کیونکہ وہ رات کی رات گاؤں سے نکلا اور کہیں ٹوٹتی رات کو ایک کھیت کی مینڈھ پر جا کر ذرا سا سستایا اور پھر وہیں سو گیا۔ صبح کو وہ اٹھا تو کھیتوں پر دھوپ چمک رہی تھی اور قریب ہی ایک درخت کے ٹھنٹھ پر ایک کوا بیٹھا بیخ رہا تھا۔ رحمان پہلے تو حواس باختہ بیٹھا ادھر اُدھر دیکھتا رہا پھر رونے لگا اور روتے روتے "اماں، اماں" پکارنے لگا۔ کافی دیر تک رونے کے بعد اس نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا "اماں۔ کماں، ٹھماں!" وہ اُٹھا، آنسو پونچھے، اور کسانوں سے اپنے گاؤں کا پتہ پوچھتا ہوا شام سے پہلے گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوا تو یوں بے اختیار رونے لگا جیسے اسے کسی نے گالی دے دی ہے۔ لوگوں نے اسے پہچان لیا تھا، وہ اسے دلاسا دیتے، تھپکتے اور تنگ آکر آگے نکل جاتے۔ اس کے گرد بہت سے لڑکے جمع ہو گئے جو اسے بڑی ہمدردی سے دیکھتے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ "بے چارے کی ماں مر گئی تھی نا پچھلے سال!" ——— "ماں تو میری بھی مر گئی ہے پر میں تو یوں نہیں روتا ———" "تمہارا باپ تو ہے نا یار۔ اس کا تو باپ بھی نہیں۔" ——— "ہاں ہاں، اس بے چارے کا تو باپ بھی نہیں نا" ——— اور وہ پھر ہمدردی سے رحمان کو دیکھنے لگتے۔ جواب زور زور سے ہچکیاں لینے لگا تھا اور آنسو پونچھتے پونچھتے اس کے گالوں کی جلد چھل گئی تھی۔ شام کو اس کے پاس راجہ اللہ نواز کا سائیس آیا اور اسے بڑے پیار سے بتایا کہ راجہ اللہ نواز نے اسے اپنے پاس بلایا ہے۔

راجہ اللہ نواز گاؤں کا کھاتا پیتا بزرگ تھا۔ زمینیں بھی خاصی تھیں، طب میں بھی کچھ درک حاصل تھا اور مفت علاج کرنے کی وجہ سے وہ مرجعِ عوام ہو گیا تھا۔ دردِ شقیقہ، دردِ طحال اور دردِ دنداں کو دور کرنے کے لیے اس کے پاس تیر بہدف تعویذ اور دم تھے، پھر وہ بلا کا

تہجد گزار تھا اور روزانہ سینکڑوں نوافل پڑھنے میں تو وہ یکتائے روزگار سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اصطبل میں دو گھوڑے برسوں سے موجود تھے، گھر کے لیے سودا سلف خود خرید لاتا تھا، لیکن ان گھوڑوں سے اسے اتنی محبت تھی کہ ان کے لیے کم از کم دو خدمت گار تو ہمیشہ موجود رہے۔ رحمان جب راجہ اللہ نواز کے پاس آیا تو اس وقت نمازی شام کی نماز پڑھ کر اس کی بیٹھک میں جمع ہو گئے تھے۔ سب کے سامنے اس نے رحمان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا "دیکھو بیٹا تم یتیم ہو، یوں پھوٹ پھوٹ کر روؤ گے تو مجھے ڈر ہے کہ خداوند تعالیٰ اس گاؤں کو غرق ہی نہ کر دے۔ تمہارا باپ مرا تو اس گاؤں والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تمہاری ماں چل بسی تو یہ بھی اس کی قسمت کا لکھا تھا۔ یہ سب کام خداوند تعالیٰ کے ہیں جو بڑا بے نیاز اور بے پروا ہے۔ اس لیے خدا کے لیے اتنا نہ روؤ کہ تمہارا صبر اس بے قصور گاؤں پر ٹوٹے۔ میں سارے گاؤں کی طرف سے تمہارے آنسو پونچھنے کو تیار ہوں۔ یوں کرو کہ یہیں میرے اصطبل میں رہو۔ تمہاری نوکری یہ ہے کہ گھوڑوں کے تھان صاف رہیں۔ اِدھر گھوڑے لید کریں تو اُدھر تم پھاوڑے سے اصطبل کو آئینہ بنا دو۔ اس نوکری کے بدلے میں ہر روز شام کا کھانا تم میرے گھر سے کھانا، سمجھے؟ اوپر سے سال میں ایک دو مرتبہ تمہیں میرے بچوں کی اترن بھی ملتی رہے گی، سو میں تمہیں انشاءاللہ تعالیٰ ننگا بھی نہیں رہنے دوں گا۔ باقی رہا صبح کا کھانا، تو اس کا انتظام یوں ہو جائے گا کہ میرے خاندان کے جتنے بھی گھر ہیں ان کے ہاں کا کوڑا اٹھا کر باہر گھورے پر پھینک آیا کرو، اور بس۔ سب پردہ نشیں بیبیاں ہیں، نائن، میراثن آئے تو کوڑا اُٹھے، تمہاری وجہ سے یہ فائدہ ہو گا کہ گھر صاف رہیں گے، بس۔ اتنا سا کام ہے، تم اس گاؤں کے بیٹے ہو، اور تمہارے سر پر ہاتھ رکھنا میرا فرض ہے، کیوں بھئی، کیا غلط کہا ہے میں نے؟"

نمازی تو اس دوران میں راجہ اللہ نواز کی سخاوت سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ بعض رقیق القلب لوگوں پر رقت تک چھا گئی، ایک نے راجہ اللہ نواز کو داتا اللہ نواز کہہ ڈالا۔

رحمان کو ایک شخص ایک طرف لے گیا۔ راجہ اللہ نواز کے گھر سے کھانا آیا تھا جس میں دو

روٹیاں تھیں اور ان پر خود رحمان کی مٹھی سے بھی بڑی پیاز کی دو گانٹھیں رکھی تھیں۔ اس نے آناً فاناً روٹیوں کا صفایا کر دیا۔ اور پھر بیٹھک میں جا کر راجہ اللہ نواز سے کہا "جی میں نے روٹی کھائی ہے"۔

راجہ اللہ نواز بولا "بہت اچھا کیا"۔

رحمان نے بڑی معصومیت سے کہا "جی میری نوکری ابھی لگ گئی کہ صبح سے لگے گی"؟

نواز اور دوسرے نمازی ہنسنے لگے، راجہ نواز بولا "ابھی سے لگ گئی بیٹا"۔

اور رحمان نے اسی انداز میں کہا "تو جی پھر یہ بتا دیجیے کہ پھاوڑا کہاں رکھا ہے"؟

نمازی اور زور سے ہنسنے لگے، مگر راجہ اللہ نواز سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے کندھے پر سے بڑا نیلا رومال اتارا، اپنی آنکھیں پونچھ کر رحمان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "نہیں بیٹا، میں نے غلط کہا تھا، تمہاری نوکری صبح لگے گی"۔

مگر رحمان کی منطق کا سلسلہ جاری تھا، فوراً بولا "پر کھانا تو مجھے ابھی سے ملنے لگا ہے جی"۔

راجہ اللہ نواز کے ہونٹ اس کی داڑھی اور مونچھوں میں سے لٹک آئے اور وہ زار زار رونے لگا۔ "اسے لے جاؤ" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "اس بچے کو لے جا کر سلا دو ورنہ مجھے ڈر ہے کہ ابھی بھونچال آئے گا اور ہم سب دھرتی کے پیٹ میں اتر جائیں گے، اور یہ حرام موت ہو گی، لے جاؤ اسے ——— جاؤ بیٹا، جاؤ، کلمہ پڑھ کر آرام سے سو جاؤ، بڑوں سے بہت دلیل بازی نہیں کرتے، خداوند تعالیٰ خفا ہوتا ہے"۔

اور رحمان نے سوچا کہ خداوند تعالیٰ اس سے خوش ہی کب تھا جو اب خفا ہو گا! —

آخر رحمان نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ اس نے تو کبھی کسی کو گالی تک نہیں دی، اس نے تو زندگی میں صرف ایک بار چوری کی تھی، اور وہ بھی ایک آنے کی پنسل کی۔ پھر جب استاد نے اس کی پانچ انگلیوں کے درمیان چار پنسلیں رکھ کر ان انگلیوں کو دبا دیا تھا تو اس نے چیخ کر سچ بول دیا تھا "میری نہیں غلام یٰسین کی ہے"! پھر اس نے تو ماں تک کو ساری بات سچ سچ بتا دی تھی اور

ماں نے کہا تھا کہ اگر رحمان نے پھر کبھی چوری کی تو وہ اسے بتیس دھاریں نہیں بخشے گی، اور جس بچے کو اس کی ماں بتیس دھاریں نہ بخشے وہ ساری عمر لوگوں کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے اس کے بعد آج تک اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی، لیکن وہ لوگوں کی ٹھوکریں تو اب تک کھا رہا ہے تو کیا ماں نے مرنے سے پہلے اسے بتیس دھاریں نہیں بخشی تھیں "اماں، کہاں ہو ماں" وہ غصے میں پکار اٹھا اور پھر رونے لگا، اور یونہی روتے روتے سو گیا۔

صبح کو اصطبل میں پھاوڑے سے لید جمع کرتے ہوئے اُسے ماں یاد آگئی۔ ایک بار کوٹھے کو لیپنے کے لیے جب وہ گارا بنانا چاہتی تھی تو اسے گارے کو گاڑھا کرنے کے لیے اس میں گھوڑے کی لید ملانے کا خیال سوجھا۔ ٹوکرا سر پر رکھ کر وہ سارے گاؤں میں گھوم آئی تھی مگر اسے کہیں سے لید نہیں ملی تھی۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملتا کہ آج وہ بھی گارا بنا رہے ہیں۔ بعض سکھ، گھرانے تو لید کو خشک کر کے اس سے ایندھن کا کام لیتے تھے —— اور آج رحمان کے پاس ٹوکروں لید جمع رکھی ہے مگر ماں نہیں جو گارا بنا سکے۔ فوراً اس کے ذہن پر اپنا کوٹھا ابھرا اور وہ پھاوڑا پھینک کر گلی میں بھاگنے لگا جب وہ اپنے اس کوٹھے کے سامنے پہنچا جس میں اس نے زندگی کے سات برس گزارے تھے تو یہ دیکھ کر اس کی باہر سانس باہر اور اندر کی اندر رہ گئی کہ کوٹھے کی چھت گر چکی ہے اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ دو بلیاں آمنے سامنے بیٹھی دمیں پھلائے غرا رہی ہیں۔ ایک پتھر اٹھا کر اس نے بلیوں کی طرف پھینکا اور چلایا "ہٹ جاؤ حرامزادیو، سؤر کی بچیو، الو کی پٹھیو!" —— بلیاں بھاگ گئیں مگر اسے کچھ ایسا لگا جیسے اس کی زبان میں جلن ہو رہی ہے اور زبان کی نوک پر ایک پھوڑا نکل رہا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر کسی طرح بلیوں کو پکڑ لائے اور انہیں دیوار پر بٹھا کر ان سے بڑے پیار سے کہے کہ "غراؤ، شوق سے غراؤ اور مجھے معاف کر دو!" اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ماں سامنے دیوار سے لگی کھڑی ہے اور اسے بڑے غصے سے گھور رہی ہے، وہ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا اور دیر تک روتا رہا،

اور جب راجہ اللہ نواز کا سائیس اسے بیٹھک میں لے آیا تو راجہ اللہ نواز وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنا گریبان اٹھا کر اس میں چھوکی اور بولا "روکیوں رہے ہو بیٹا؟" تو رحمان نے پھر سے روتے ہوئے کہا "جی آج میں نے گالی بکی ہے اور ماں کہتی تھی جو گالی بکے گا اس کی زبان میں پھوڑا نکل آئے گا۔" راجہ بولا "ٹھیک ہی تو ہے" اور پھر رحمان کو پاس بلایا۔ اس کا منہ کھول کر اس میں چھوکی اور کہا "اب پھوڑا ووڑا نہیں نکلے گا لیکن تم نے گالی دی کسے؟" رحمان معصومیت سے بولا "جی دو بلیوں کو!" —— اور راجہ اللہ نواز یوں بے اختیار ہو کر ہنسا کہ رحمان تک کو ہنسی آ گئی اور وہ اصطبل میں جا کر پھاوڑے سے کھیلنے لگا۔

آہستہ آہستہ وہ اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ وہ صبح کو راجہ اللہ نواز کے ہاں جا کر چھاچھ کا ایک پیالہ پیتا اور پھر اس کے گھر کا کوڑا ایک ٹوکرے میں بھر کر گلی کے نکڑ پر ایک گھورے پر پھینک آتا۔ راجہ کے خاندان میں سات گھر تھے۔ کوڑے کے یہ سات ٹوکرے ڈھونے کے بعد وہ اصطبل میں آتا اور پھاوڑا سنبھال لیتا۔ گھوڑے کے تھانوں پر ریت پھیلاتا تاکہ کیچڑ نہ ہونے پائے اور پھر ایک خالی ناند کا سہارا لے کر اوپر چھت کو گھورتا رہتا جس میں عموماً بھڑیں اڑتی رہتی تھیں۔ جب کوئی بھڑ مکڑی کے جالے میں پھنس جاتی تو بھڑ اور مکڑی کی آپس میں خوب لڑائی ہوتی۔ مکڑی بھڑ کو دبوچنے کے لیے آگے بڑھتی تو بھڑ کالا سا ڈنک نکال کر مدافعت کرتی اور مکڑی جالے کے پرلے سرے تک بھاگ جاتی۔ پھر جب کبھی دو بھڑیں آپس میں گتھ کر نیچے گرتیں تو وہ ایک بھڑ کو سر کی طرف سے پکڑ کر اس کا ڈنک نوچ لیتا اور اس کی ٹانگ میں دھاگا باندھ کر اسے اڑنے کے لیے چھوڑ دیتا اور خوب خوب ہنستا۔ پھر ایک دم اسے پھاوڑا استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ اپنے کام میں جٹ جاتا۔ اب ماں بھی اسے بہت کم یاد آتی تھی اور یاد بھی آتی تھی تو رحمان کی آنکھیں نہیں ڈبڈباتی تھیں، وہ بس ذرا سا اداس ہو جاتا۔ تب اوپر چھت میں بھڑ اور مکڑی کی جنگ شروع ہو جاتی اور وہ خالی الذہن ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگتا۔

گرمیوں میں کوڑے کے ٹوکروں کا بوجھ اچانک بڑھ گیا۔ راجہ اللہ نواز کے خاندان میں منوں تربوز کھائے جانے لگے، اور ان کے موٹے موٹے چھلکوں سے ٹوکرے اٹ اٹ گئے کئی بار اسے ایک ایک گھر کا کوڑا دو دو بار لے جانا پڑتا اور جب وہ چھلکوں کو گھورے پر پھینکتا تو اسے ان پر دانتوں کے نشان نظر آتے اور اس کے دانتوں میں چل سی ہونے لگتی، کئی چھلکوں پر تربوز کا گلابی گودا باقی رہ جاتا تھا اور ان چھلکوں کو گندگی کے ڈھیر پر پھینکتے ہوئے وہ سوچتا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جنہیں تربوز کھانے کا سلیقہ تک نہیں آتا اور ایک میری ماں تھی کہ گودے کو چھری سے یوں کاٹتی تھی کہ چھلکے پر گلابی رنگ کا ایک ذرہ تک کہیں باقی نہ رہے اور ایک یہ راجے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ان کے گھروں میں سے ساری چھریاں چوری ہوگئیں۔ پھر اس کے منہ میں آج سے ڈیڑھ دو برس پہلے کے تربوزوں کا ذائقہ پانی بن کر امڈ آتا اور اس کا کیسا کیسا جی چاہتا کہ چھلکوں پر سے بچے کھچے گلابی رنگ کو چاٹ لے لیکن وہ ہمیشہ اس گندے ارادے پر قابو پا لیتا۔ ویسے ٹوکرے کو گھورے پر الٹ کر چھلکوں کو کرید کرید کر دیکھنے کی اسے عادت ہوگئی تھی۔ اب تربوزوں کے ساتھ خربوزوں کے چھلکے بھی شامل ہونے لگے تھے، اور راجہ اللہ نواز کے ہاں کی گندگی میں تو اسے ایک دن آموں کی گٹھلیاں بھی نظر آگئی تھیں، اس وقت رحمان کے پیٹ میں چھاچھ چھل چھل چھلکتی معلوم ہوئی اور زبان کی جڑ میں آم کا ذائقہ جیسے چمٹ کر رہ گیا۔

ایک روز وہ ٹوکرا الٹ کر گندگی کو کرید رہا تھا جب اسے سلولائڈ کا ایک بھلا چنگا گڈا انگریزی ٹوپی پہنے، ہاتھ میں کالے رنگ کی چھڑی لیے کوڑے میں لپٹا ہوا ملا۔ گڈے کو اپنے چولے سے جھاڑ پونچھ کر غور سے دیکھا تو اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ گڈے کی ایک آنکھ سے پتلی غائب تھی۔ ایک ہاتھ میں خالی ٹوکرا لٹکائے اور دوسرے ہاتھ میں گڈا لیے وہ اصطبل کے پاس سے گزرا تو جی میں آئی کہ گڈے کو یہیں کہیں چھپا کر رکھ دے اور پھر دن بھر اس سے کھیلا کرے، کبھی اسے سر کے بل کھڑا کر دے اور کبھی ٹہلائے، مگر پھر ایک دم اس کے کان گرم ہوگئے اور گلا

خشک ہوتا محسوس ہوا۔ راجہ اللہ نواز کے ہاں جاکر گدّے کو اس کی بیوی کے سامنے رکھ دیا اور بولا "جی بی بی جی یہ گدّا کوڑے میں چلا گیا تھا۔" راجہ اللہ نواز بھی قریب ہی بیٹھا باداموں پر کلمہ شہادت پڑھ رہا تھا۔ فوراً اٹھا اور بولا "شاباش بیٹا۔ تم نے چوری نہیں کی۔ تمہیں آج انعام ملے گا۔" اندر جاکر وہ تربوز کی ایک پھانک اٹھا لایا اور رحمان کے ہاتھوں پر رکھ دی۔

اصطبل میں آکر وہ اس پھانک پر پل پڑا اور چھلکے کی سفیدی تک کو نوچ ڈالا۔ سخت سخت چھلکے نے اس کا ذائقہ بگاڑ دیا اور اس نے سوچا "ہُنہہ، بڑا راجہ بنا پھرتا ہے۔ انعام ہی دینا تھا تو وہ گدّا ہی دے دیتا۔ تربوز کی ایک پھانک بھی انعاموں میں کوئی انعام ہے۔ بھئی ایک چھوٹا سا تربوز ہی اٹھا کے دے دیتا۔ ذرا سا تربوز کا پانی تو پی لیتے۔ واہ!"

ایک روز بڑے زور کی بارش ہوئی اور دوسرے روز جب رحمان چھاچھ پینے کے لیے راجہ اللہ نواز کے ہاں جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ گلیوں میں ہر طرف تربوز اور خربوزوں کے ڈھیر لگے ہیں اور لوگ ٹوکرے بھر بھر کے خریدے لیے جا رہے ہیں۔ ایک لڑکے کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ بارش کے بعد تربوزوں اور خربوزوں میں پانی بھر جاتا ہے اور وہ گل جاتے ہیں اس لیے کسانوں نے کھیت صاف کر دیے ہیں اور اب انھیں اونے پونے بیچ رہے ہیں۔ رحمان کو اچانک راجہ اللہ نواز پر غصہ آگیا۔ نوکری لگتی ہے تو تنخواہیں ملتی ہیں، یہ بھی کیا کہ بھئی دن دن بھر اصطبل صاف کرو، سیروں کوڑے کے ٹوکرے اٹھاؤ اور بدلے میں دو روٹیاں اور پیاز کی دو گانٹھیں لے کر اللہ کا شکر ادا کرو۔ کنجوس، مکھی چوس، مہینے میں ایک آنہ ہی دے دیتا تو ہم یہ جاتی بہار کا پھل تو ذرا سا چکھ لیتے۔

بچے تنگ پیٹ اور سینے سے چار چار پانچ پانچ خربوزے لگائے بھاگے جا رہے تھے اور وہ راجہ اللہ نواز کے ہاں سے چھاچھ پینے چلا تھا۔ ایک بچے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ایک خربوزہ گر کر دور لڑھک گیا۔ رحمان نے لپک کر خربوزہ اٹھایا اور پھر یونہی ذرا سا سونگھ کر اسے بچے کے حوالے کر دیا۔ خربوزے کی خوشبو اس کی ناک سے چمٹ چلی آئی اور اس

نے جی میں کہا سو سو روپے شرط، یہ خربوزہ کھانڈ کی طرح میٹھا ہوگا، پھیکا نکلے تو ناک کٹوا ڈالوں؟

صحن میں جاکر اس نے گھڑوں کے پیچھے سے اپنا پیالہ اٹھایا اور اسے دھوکر راجہ کی بیوی کے پاس آیا۔ چھاچھ پی کر وہ خوف زدہ سا ہوگیا۔ اسے کچھ ایسا لگا جیسے اس نے خوب پیٹ بھر کر تربوز اور خربوزے کھانے کے بعد اوپر سے چھاچھ پی لی ہے، اور اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح ہیضہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس نے اپنی ناک کو مل ڈالا جس میں سے خربوزے کی بو کمبخت نکلتی ہی نہ تھی۔ اسے اپنے شبہ پر ہنسی آگئی اور وہ کوڑے کا ٹوکرا اٹھا کر باہر چلا گیا۔

گھورے پر جاکر اس نے کوڑے کو کریدا، چھلکوں کے نیچے کوٹھوں کے فرش کی مٹی تھی، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے، راجہ اللہ نواز کے حقے کی جلی ہوئی تمباکو تھی، اور ——— رحمان سناٹے میں آگیا، اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوگئی جیسے کوڑے کے نیچے اس نے بچھو دیکھ لیا ہے، پھر اس کے خشک ہونٹ ذرا سے پھڑکے اور وہ مسکرانے لگا، ہاتھ بڑھا کر کاغذ کا ایک پرزہ اٹھا لیا ——— یہ ایک روپے کا نوٹ تھا!

نوٹ کو مٹھی میں بند کرکے اور ٹوکرے کو وہیں چھوڑ کر وہ بھاگا اور اصطبل کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنی مٹھی کچھ یوں کھولی جیسے نوٹ کے پر ہیں اور موقع پاتے ہی وہ پھر سے اڑ جائے گا۔ مٹھی کو ایک بار پھر سختی سے بند کرکے وہ لپکا اور گلی میں تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر کے پاس جاکر رکا، گدھوں پر سے خربوزوں کے بھرے ہوئے بورے اتارے جا رہے تھے اور ڈھیر اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ آنے جانے والے پرلی دیوار سے لگ کر گزر رہے تھے۔

ایک دم سے ایک ہی بار اکٹھے ایک روپے کے تربوز اور خربوزے خریدنے کے لیے اس نے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ اس کا چہرہ فق ہوگیا اور کان گرم ہوگئے اور

ادھر سے کسان بولا "اب یہاں کوئی مداری کا کھیل ہو رہا ہے؟ لینا ہے تو لے، نہیں تو گھر کی راہ لے۔ لینا ہے کچھ؟"

رحمان پلٹ آیا۔ وہ سیدھا راجہ اللہ نواز کے پاس گیا اور نوٹ کو اس کے سامنے رکھ کر بولا "جی یہ روپیہ کوڑے میں چلا گیا تھا!"

راجہ اللہ نواز چونکا اور اپنی بیوی کو ڈانٹا "کچھ سنا؟ اب روپے بھی کوڑے میں اُٹھے جا رہے ہیں۔ تم نے گھر کی ایسی ہی خبر گیری کی تو کبھی میں بھی کوڑے میں اُٹھ جاؤں گا۔ رحمان نیک بچہ ہے بے چارہ، کوئی اور ہوتا تو یہ ایک روپیہ تو گیا تھا۔ ادھر آ، اسے کہیں سنبھال کے رکھ دے۔" پھر وہ رحمان سے مخاطب ہوا "جیو بیٹا جیو۔ خداوند تعالیٰ تمہیں اس کا اجر دے گا۔ یہ تمہارے خاندان کی شرافت ہے، تمہاری جگہ کوئی کمین ہوتا تو سر پر قرآن رکھ کر بھی انکار کر دیتا، جیو۔" اس نے رحمان کے سر پر دھیرے سے ہاتھ پھیر دیا۔

"ٹوکرا کہاں چھوڑ آئے؟" راجہ اللہ نواز کی بیوی نے پوچھا۔ وہ نوٹ کو اندر بڑے کوٹھے میں صندوقوں کی قطار کے اوپر ایک کٹورے کے نیچے رکھ رہی تھی۔

"جی ٹوکرا؟" رحمان نے کہا "جی ہاں، ٹوکرا۔" اس نے خود ہی جواب دیا اور بھاگا۔ ٹوکرے کو گھورے پر پڑا دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور اسے صحن میں اُٹھا لایا۔

آج اس نے باقی چھ گھروں کے ٹوکرے گھورے پر الٹ دیے مگر انہیں کریدا نہیں وہ بہت نڈھال ہو رہا تھا، قدموں میں سیسہ بھر گیا تھا، گھٹنوں میں ذرا سا بھی دم نہ تھا، خالی ٹوکرے کے بوجھ نے اس کا ایک کندھا جھکا رکھا تھا۔

کوڑا ڈھونے کے بعد وہ اصطبل میں آیا اور ناند کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ لید کی ڈھیریاں لگی تھیں لیکن اس نے پھاوڑے کو پاؤں سے پرے دھکیل دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ کافی دیر کے بعد وہ اُٹھا اور پاؤں گھسٹتا راجہ اللہ نواز کے صحن میں داخل ہوا۔ گھر کے سب لوگ پرلی طرف سایے میں کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ راجہ کی بیوی نے اسے دو روٹیوں

پر پیاز کی دو گانٹھیں رکھ کر دیں اور بولی "ٹھہرو، پیازیں مجھے دے دو، آج میں تمہیں مرچوں کا اچار دوں گی۔" اس نے پیازیں اُٹھا کر روٹیوں پر دو مرچیں رکھ دیں اور رحمان بڑے کوٹھے کے سایے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔

اچانک اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ وہ روٹی کو چبانے کے بجائے نگلنے لگا اور آن کی آن میں صفایا کر کے اٹھا۔ ذرا سا جھک کر پرلی طرف دیکھا۔ سارا گھرانا کھانے میں مصروف تھا وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دبے پاؤں بڑے کوٹھے میں گیا، بلی کی طرح پلنگ پر چڑھا اور سب سے اوپر والے صندوق پر سے کٹورا اٹھا کر روپے کے نوٹ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پلنگ پر سے اترا تو اس کے چہرے پر ہلدی کھنڈ چکی تھی۔ دروازے تک آیا تو یکایک بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور پلنگ کی چادر سے اپنے پاؤں کے نشانات کو جھاڑ دیا۔ باہر آ کر اس نے کنکھیوں سے پرلی طرف دیکھا۔ سب کھانے میں مگن تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب صحن کے وسط میں آیا تو راجہ کی بیوی بولی "رحمان!"

"ارے!" رحمان اچھل پڑا۔ سب ہنسنے لگے "کیا ہوا؟" بیوی نے پوچھا "ڈر گیا ہے بے چارہ، تمہاری آواز بھی تو ماشاءاللہ ہے۔" راجہ بولا۔

"جی" رحمان نے کافی دیر کے بعد جواب دیا۔ اس کی آواز خود اس سے بھی پہچانی نہ گئی۔

"کھا چکے کھانا؟" بیوی نے پوچھا۔

"جی" رحمان کی ڈھارس بندھی۔

"اچھا تھا؟" بیوی نے پھر پوچھا۔

"جی" رحمان نے کہا۔ پھر ہمت کر کے چند الفاظ بڑھائے "جی بڑا مزیدار تھا۔"

"اچھا" بیوی بولی۔

رحمان باہر گلی میں آ گیا۔

اسے ایسا لگا جیسے نوٹ کی بہت سی چونچیں نکل آئی ہیں اور وہ ان سب چونچوں سے

اس کی ہتھیلی اور انگلیوں پر ٹھونگیں مارے جا رہا ہے۔ رحمان نے نوٹ کو دوسری مٹھی میں لے لیا اور پہلی مٹھی کے پسینے کو چوغے پر رگڑ دیا۔ تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر کے پاس پہنچتے ہی وہ مڑ آیا اور اصطبل میں چلا آیا۔ ٹھیک ہے، اس نے سوچا، چوری کی جائے تو مائیں بتیس دھاریں نہیں بخشتیں، مگر جب ماں مر چکی ہو تو بتیس دھاروں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ رہا عمر بھر ٹھوکریں کھانے کا سوال، تو اس سے زیادہ اور کیا ٹھوکریں کھاؤں گا، اور پھر ایک روپے کی چوری بھی کوئی چوری ہے۔ بڑے ہو کر راجہ کو پورا روپیہ ادا کر دوں گا۔ بھئی یہ تو ادھار ہے، کما کر اتار دوں گا، ایسی بھی کیا بات ہے۔

مطمئن ہو کر وہ باہر آیا اور فیصلہ کیا کہ تربوزا اور خربوزے اس گلی سے خریدنا حماقت ہے۔ کسی دور کی گلی میں چلتے ہیں، وہیں خریدیں گے، وہیں کھائیں گے اور پھر مسجد میں جا کر ہاتھ منہ دھو لیں گے، الحمد اللہ خیر سلا۔

وہ گلیاں طے کرتا ہوا تیز تیز جا رہا تھا، ایک گلی میں اسے گھڑے گھڑے کے برابر تربوز پڑے نظر آئے، وہ ان کی طرف بڑھا مگر ایک جگہ جا کر یوں ایک دم تھم گیا جیسے دلدل میں پھنس گیا ہے۔

اس کی نظریں اپنے گھروندے پر جم گئیں جس کی چھت گر چکی تھی اور جس کی ٹوٹی ہوئی دیواروں پر بلیاں لڑتی تھیں۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کوٹھے کے کھنڈر میں سے اس کی ماں پیٹ کے درد سے کراہتی اور روتی ہوئی نکلی ہے اور اس کے قریب آ کر اس نے رحمان کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ مار دیا ہے!

یکایک وہ پوری شدت سے واپس بھاگا۔ اسے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی ماں لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ وہ گلیوں میں اڑا جا رہا تھا۔ وہ اصطبل کے پاس بھی نہیں رکا۔ راجہ اللہ نواز کی حویلی میں بھی وہ اسی طرح بھاگتا ہوا داخل ہوا اور کوزے سے ہاتھ دھوتے ہوئے راجہ اللہ نواز کے پاس جا کر وہ دھم سے گرا اور دو تین لڑھکنیاں کھا کر

گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"کیا ہے؟ ارے کیا ہوا؟" سارا گھرانا اس کے ارد گرد جمع ہو گیا۔

رحمان نے بھینچی ہوئی مٹھی میں سے نوٹ نکالا اللہ نواز کے قدموں میں رکھ کر جیسے کہیں پاتال سے بولا "جی میں نے آپ کا یہ روپیہ چرا لیا تھا۔"

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، تڑپ کر اٹھا، بھاگ کر صحن سے نکلا، اصطبل میں جا کر لید کی ڈھیریوں میں لوٹنے لگا اور بلبلا کر رونے لگا "میں پھر چوری نہیں کروں گا میں کبھی چوری نہیں کروں گا اماں!"

پھر اچانک اٹھ کر اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور پوری قوت سے پکارا "اماں، کہاں، کہاں!" اور بلکتا ہوا ناند میں گر پڑا۔
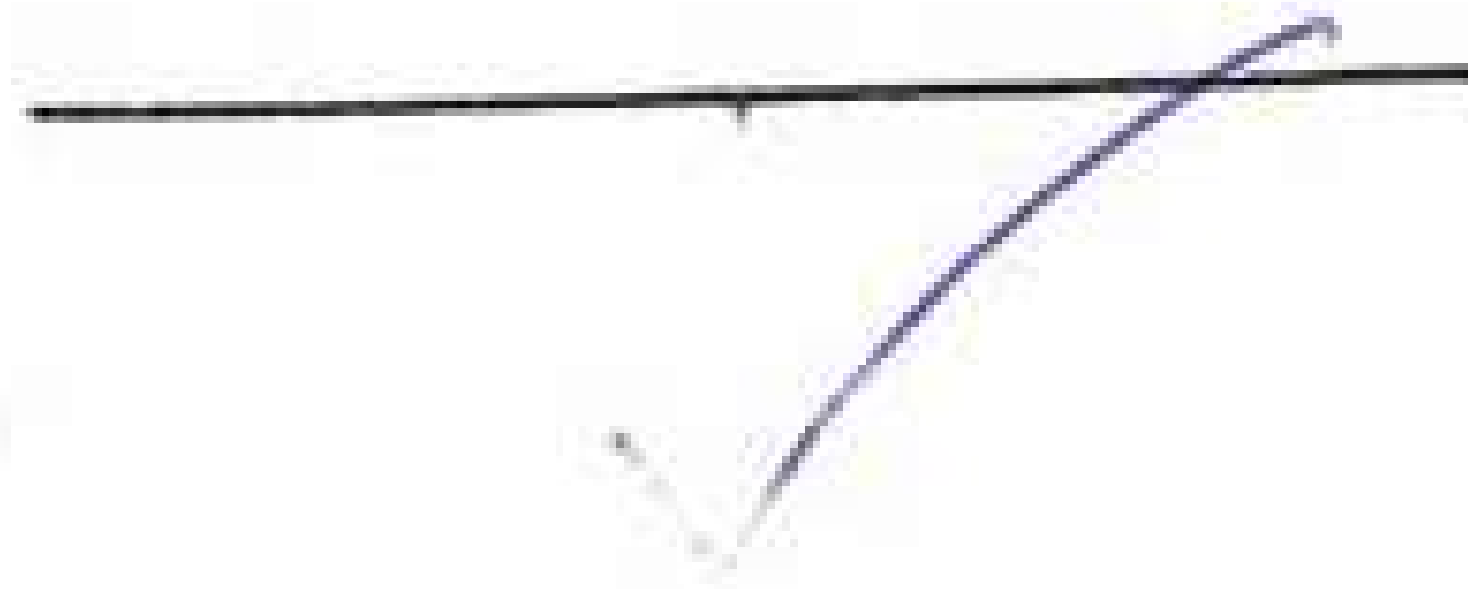
نمونہ

نہیں نہیں، میں بیمار نہیں ہوں، یہ جو میرا رنگ ذرا اڑا اڑا سا لگ رہا ہے نا تو اس کی وجہ ایک واقعہ ہے جو ابھی ابھی ہوا ہے اور ایک بات ہے جو میں ابھی تک سوچ رہا ہوں۔

آج مس ڈوروتھی سکوڈا کی سال گرہ ہے۔

ہاں، یہی کوئی بیسویں یا بائیسویں سال گرہ ہوگی لیکن مجھے اس سے کیا، میں تو اب کچھ اور سوچ رہا ہوں۔

یہ جو ابھی ابھی چاندی کے بہت سے گھنگھروؤں اور گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آئی تھی تو یہ گھنگھرو یا گھنٹیاں نہیں بجی تھیں مس ڈوروتھی سکوڈا ہنسی تھی مس ڈوروتھی سکوڈا۔ چلو تمہاری آسانی کے لیے میں اسے صرف ڈورا ہی کہے لیتا ہوں۔ تو ڈورا ہمیشہ اسی طرح ہنستی ہے، اور ڈورا کی باتیں ! ——— تم نے کوئل کی آواز تو ضرور سنی ہوگی، تو اگر کوئل انگریزی بولنے لگے تو بالکل ڈورا کی طرح بولے گی۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے سینے میں کوئی ساز چھپا ہوا ہے اور اس کے ہونٹ اس ساز کے پردے ہیں، اور وہ باتیں نہیں کر رہی، نغمے برسا رہی ہے۔ پھر ایک دم ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ آوازیں تو کہیں دور سے آ رہی ہیں کسی دور دراز جزیرے کے ایک گھپ اندھیرے کنج میں کوئی وائلن بجا رہا ہے اور وائلن کے سُر ہوا کے بازوؤں پہ لد کر آتے ہیں اور میو روڈ کے اس فلیٹ پر چھن چھن

برس پڑتے ہیں۔

تم سمجھتے ہو میں مبالغہ کر رہا ہوں، اس لیے کہ میں شاعر بھی ہوں، مگر یقین کرو کہ اگر مجھے شاعری ہی کرنا ہوتی تو میں ڈورا پر نظم لکھتا، اور اس وقت میں شاعری نہیں کر رہا، تمہیں ایک کہانی سنا رہا ہوں۔

اور کہانی ڈورا کی ہنسی ہی سے شروع ہوتی ہے۔

میں جب کوئی ایک مہینہ پہلے اس فلیٹ میں داخل ہوا تو چار بجے تھے۔ کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ مجھے گھنگھروؤں اور گھنٹیوں کا ایک چھنا کا سنائی دیا اور میں ٹھٹک گیا۔ مسز سکوڈا عقب میں میرے ساتھ ساتھ آرہی تھیں ورنہ ممکن ہے میں دیر تک یونہی ٹھٹکا کھڑا رہتا۔ تمہیں معلوم ہے چھنا کا ٹھٹکا ہی دیتا ہے۔

مسز سکوڈا ہی نے اپنے فلیٹ کا یہ کمرہ مجھے 'سب لٹ' کیا تھا۔ انھوں نے فوراً ہی اس کمرے کی خوبیوں کے متعلق اور اس کی ان خامیوں کے متعلق جو بقول ان کے اب خوبیوں میں بدل چکی تھیں، مجھے اطلاعات بہم پہنچانا شروع کیں۔ انھوں نے کچھ یوں مسلسل باتیں کیں کہ گھنگھروؤں کا چھنا کا میرے ذہن سے نکل گیا اور پانچ بج گئے۔ اور اگرچہ اب مجھے ایمان کی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ لاہور کی کوئی عمارت مسز سکوڈا کے اس فلیٹ کے مقابل نہیں آسکتی، اور باغ جناح کے آس پاس بنگلوں میں رہنے والے زندگی نہیں گزار رہے ہیں جھک مار رہے ہیں لیکن مسز سکوڈا کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اگر میں نے انھیں بر وقت نہ روکا تو وہ مزید ایک گھنٹہ بولے چلی جائیں گی اور میرا سارا پروگرام تلپٹ ہو جائے گا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب ان کے دریائے فصاحت و بلاغت کے سامنے بند باندھے بغیر نہ رہوں گا۔

وہ بولیں "اب اسی روشن دان کو لیجیے"!

میں نے فوراً کہا "جی میں نے روشن دان کو داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا بہت اچھا ہے"!

بولیں" آپ میرا مطلب نہیں سمجھے، میں حیران ہوں روشن دان میں شیشے جڑ دینے کے بعد بھی اسے روشن دان ہی کیوں کہا جاتا ہے، تازہ ہوا کا ایک شمہ بھر بھی اندر نہ آنے تو آپ ہی کہیے روشن دان روشن دان کیسے ہوا۔ ڈیم اٹ!"

"ڈیم اٹ"، میں نے بند باندھنا چاہا۔

مگر مسز سکوڈا کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور بولیں "کتنی حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ آپ ہر بات میں میرے ہم خیال ہیں، تو ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ اس روشن دان پر دو کبوتر آ بیٹھے، پرلی طرف گلی میں سے کسی لڑکے نے غلیل سے ان پر نشانہ باندھا اور دونوں شیشے کرچی کرچی ہو کر بکھر گئے۔ رابرٹ نے تو مارے غصے کے پنجابی میں ایک گالی تک بک دی، ڈورا بھی طیش میں آ گئی، مگر مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے خزانے کا دروازہ کھل گیا ہے۔ بعض اوقات ایک حادثہ زندگی کے کسی معمے کا حل بن جاتا ہے، سو اس کمرے میں تازہ ہوا کا ریلا آ گیا۔ اگر پرلی طرف گوجروں کے مکان نہ ہوتے اور گائیوں بھینسوں کی گندگی کی بو تازہ ہوا میں شامل نہ ہو جاتی تو پھر یہ کمرہ مری کے کشمیر پوائنٹ کا مقابلہ کرتا۔ تازہ ہوا کے بغیر مجھے تو انسان اُلّو معلوم ہونے لگتا ہے۔"

میں نے کہا" اُلّو بھی تو ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا!"

مسز سکوڈا قہقہہ مار کر ہنسیں" ونڈرفل، ونڈرفل، نائیس جوک!"

خاموشی کے ذرا سے وقفے سے میں نے فائدہ اُٹھانے کی ٹھانی، مگر اپنے اگلے اقدام کے لیے سوچ ہی رہا تھا کہ مسز سکوڈا نے بند توڑ دیا" ہمارے ہاں فن تعمیر کا تصور وہی پرانا اور کرم خوردہ ہے، فلیٹ مال روڈ پر ہے مگر اندر جاؤ تو ایسا لگتا ہے جیسے قدیم بغداد میں داخل ہو گئے ہیں۔ قدیم بغداد پر میرے پاس ایک کتاب ہے، آپ بھی پڑھیے گا۔ ان دنوں ڈورا پڑھ رہی ہے۔" مسز سکوڈا نے موضوع کی تلاش کے سلسلے میں رکیں۔

میں نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنا چاہا لیکن آنکھوں سے آنکھیں

مل ہی نہ سکیں اس لیے بولنا بھی مشکل ہو گیا۔ دراصل مسز سکوڈا کی ایک آنکھ کو امتدادِ زمانہ نے ذرا سا کبڑا کر دیا تھا، اور میری جو آنکھ ان کی اس آنکھ سے ملی وہ مجھے اپنے محور سے ہٹتی معلوم ہوئی میں نے آنکھیں ملنے کے لیے جیب سے ہاتھ نکالا تو اس دوران میں انھیں ایک اور موضوع ہاتھ لگ گیا۔

"بے شک یہ لکڑی کی پارٹیشن شروع شروع میں آپ کو کھلے گی، مگر آپ بہت جلد اس کے عادی ہو جائیں گے۔ انسان عجیب جانور ہے (یعنی تم عجیب جانور ہو) بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈال دو، پہلے تو تڑپے گا، پھڑکے گا، بلبلائے گا اور پھر بانسری بجانے لگے گا (یعنی مر جائے گا، میں نے کہنا چاہا مگر ہم خیالی کا جذبہ بیچ میں آ گیا۔) میری ڈورا ساتھ والے کمرے میں ڈانس کی مشق کرتی ہے اور ساتھ ساتھ ڈانس کی ٹیون بھی گنگناتی ہے۔ ممکن ہے اس کی آواز آپ کو شروع شروع میں کھلے، کیونکہ میں نے سنا ہے آپ جرنلسٹ ہیں، لیکن آپ بہت جلد اس کے اس قدر عادی ہو جائیں گے کہ آپ کو ڈورا کی آواز کا انتظار رہے گا۔ رہا رابرٹ، تو وہ چند ہی دنوں میں کراچی جا رہا ہے، وہاں اسے امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک فرم میں کام مل گیا ہے، یہاں رہتا تو آپ اس کے بھی عادی ہو جاتے، آپ اسے بڑا اچھا دوست پاتے۔ آپ سے پہلے جو صاحب یہاں رہتے تھے وہ شاید افیون کے ٹھیکیدار تھے، مگر تھے بہت پیارے آدمی، رابرٹ ان کا تو بالکل چھوٹا بھائی بن گیا تھا۔ بریک فاسٹ وہیں کر رہا ہے، شیو وہیں بنا رہا ہے، کبھی کبھی لنچ تک وہیں کھا لیتا تھا، اکٹھے سینما جا رہے ہیں، اکٹھے ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں، میں حیران ہوں وہ صاحب ایکا ایکی یہ فلیٹ چھوڑ کر کیوں چلے گئے اور کہاں چلے گئے۔ حد یہ ہے کہ آج پندرہ دن ہونے کو آئے ہیں انھوں نے اپنے رابرٹ کی بھی کوئی خبر نہیں کی۔ (کہیں رابرٹ کا شیو تو نہیں بڑھ آیا، میں نے پوچھنا چاہا، مگر ——) سو میں کیا کہہ رہی تھی؟ میں یہ کہہ رہی تھی کہ رابرٹ کراچی جا رہا ہے، باقی رہ گئی میں، تو میرا ہونا نہ ہونا برابر ہے، رات کو ایک دو بار کھانس لیتی ہوں، بہت ہوا تو کبھی ڈورا کو اس کی شوخیوں پر جھڑک دیا۔ اس عمر

میں انسان کا وجود صفر کیسے برابر ہو جاتا ہے، آپ میری طرف دیکھئے ـــــ ذرا دیکھئے نا۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں چار کرنے کی کوشش کی مگر چار نہ ہوئیں، صرف دو ہوئیں، اور پھر یہ دو بھی نہ رہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھ بھی کبڑی ہو رہی ہے۔ جلدی سے میں نے اپنی آنکھیں مل دیں۔ بس ایک ثانیے میں جب ہماری آنکھیں دو ہوتی تھیں تو میں اتنا دیکھ پایا تھا کہ مسز سکوڈا نے اپنی ٹھوڑی کے نیچے لٹکتی ہوئی جھلّی کو چٹکی میں لے رکھا ہے اور اب وہ بولنے لگیں "ایک زمانہ تھا جب میں چمڑے کی اس تھیلی میں اکٹھی تین ٹھوڑیاں لیے پھرتی تھی۔ میں اتنی تندرست اور موٹی تھی کہ حیران رہتی تھی آخر میں جسم کی اتنی ڈھیروں چربی اور گوشت کب تک سنبھال سکوں گی۔ اچانک جونسن کو خدا نے اپنے پاس بلا لیا اور تب سے میرے سارے جسم پر تھیلے اور تھیلیاں لٹک آئیں۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکیں رومال نکال کر اس زور سے ناک صاف کی کہ روشن دان میں بیٹھے ہوئے کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ میں نے بھی دہل کر ان کی طرف دیکھا، وہ رو رہی تھیں اور میں حیران تھا کہ اس نازک موقع پر ان سے کیا کہوں۔ بڑی کوشش کے بعد میں نے "مسز سکوڈا" کے الفاظ کچھ اس طرح ادا کیے کہ ان میں بیک وقت تھپکی بھی تھی، ہمدردی بھی اور حیرت بھی!

"آئم سوری،" انھوں نے کہا اور جانے کے لیے پلٹیں کہ ادھر سے ڈورا کی غصے میں بھری ہوئی آواز آئی "ڈونٹ گو انگ اِن ممی!" ـــــ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس فلیٹ میں کوئل کی آواز سنی تھی۔

مسز سکوڈا کے جانے کے بعد میں نے پہلی بار کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک مستطیل شکل کا کمرہ تھا، اور اگر لکڑی کی پارٹیشن نے اس کے دوسرے حصے کو الگ نہ کر دیا ہوتا تو ممکن ہے یہ مربع شکل ہوتا۔ بہر حال اب ایک مربع دو مستطیلوں میں بٹ چکا تھا، اور ایک مستطیل میرے حصے میں آئی تھی۔ روشن دان میں کبوتروں کا بسیرا تھا۔ ان کی بیٹوں نے دیوار پر بہت سی دھاریاں سی کاڑھ دی تھیں۔ ان دھاریوں کے عین

نیچے ایک الماری تھی جس کے تختوں پر جون آف آرک کے لباس میں انگرڈ برگمین کی تصویر، ملکہ الزبتھ کے لباس میں بٹی ڈیوس کی تصویر، نپولین کے لباس میں چارلس بائر کی تصویر، اور بغیر کسی لباس کے ایک جوان عورت کی تصویر چسپاں تھی۔ اس ننگی عورت کی تصویر کے نیچے مجھے انگریزی میں یہ الفاظ لکھے نظر آئے ''وومن۔ دائی نیم از نیکڈنس'' (عورت تیرا نام عریانی ہے) نیچے رابرٹ سکوڈا کے دستخط تھے۔ معاً مجھے یہ خیال آیا کہ زمانۂ حال کا بے مثال فلسفی تو عنقریب کراچی جا رہا ہے، اس کے فیضِ صحبت سے محروم رہ جانا کتنی شدید کوفت کا باعث ہے۔ جی چاہا اسے ابھی پکار لوں اور اس سے پوچھوں کہ میرے نوجوان دانائے راز! دانش کا یہ موتی تم نے کس سمندر کے ساحل پر کس قسم کی سیپی سے نکالا ہے، مگر اس وقت تو میں جسمانی اور ذہنی طور پر تھک چکا تھا۔ میں جب سے اس کمرے میں آیا تھا ایک ہی جگہ پر کھڑا تھا۔ مسٹر سکوڈا نے تو مجھے نہ بیٹھنے کی مہلت دی تھی نہ بولنے کی، اور نہ سر پھوڑ کر مر جانے کی۔ الماری کے ایک پٹ سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک ٹیک لگا کر کھڑے رہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پوری الماری تمہارا حصۂ جسم بن چکی ہے اور کچھ ایسا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ دیر تک تم اس سوچ میں غرق رہتے ہو کہ الماری اور تم میں سے تم کون ہو اور الماری کون ہے! —— اور ہاں کمرے کا باقی حصہ؟ —— تو وہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو، الماری کے بالکل مقابل یہ دروازہ ہے اور بس۔

ایک روز مجھے اپنے اخبار کی طرف سے حکم ملا تھا کہ میں شام کے بعد مقبرۂ جہانگیر میں جاؤں اور چاندنی میں اس کے منظر کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اخبار کے لیے ایک مضمون لکھوں، جس میں یہ ثابت کروں کہ اگر چاندنی رات میں تاج محل دھرتی کا تاج معلوم ہوتا ہے تو مقبرۂ جہانگیر انگوٹھی کے نگینے کی طرح دمکتا ہے۔ میں نے اپنے ایڈیٹر صاحب کو یہ یقین دلانے کی بے حد کوشش کی تھی کہ مقبرۂ جہانگیر تو صرف دن کو دیکھنے کی چیز ہے، میں نے اسے چاندنی رات میں کئی بار دیکھا تھا اور اس وقت یوں معلوم ہوتا ہے جیسے چار طرف پھیلے

ہوئے حجروں کے دروازوں میں سے ابھی کوئی غیر انسانی چیزیں برآمد ہو کر دبوچ لیں گی۔
تاج محل کا سناٹا ایک گیت ہے تو مقبرۂ جہانگیر کا سکوت ایک کراہ۔ اور نہ جانے یہ فنِ تعمیر کا
کوئی نقص ہے یا دیکھنے والوں کی ذہنیت کا، مگر یہ ہے ایک حقیقت۔ ایڈیٹر صاحب نہیں مانتے
تھے اور انھوں نے کہا تھا کہ یہ دیکھنے والوں کی نیت کا نقص ہے۔ چاندنی میں مقبرے کے بلند
میناروں اور خوبصورت محرابوں سے لطف اٹھانے کی نیت سے جاؤ گے تو لطف ہی آئے گا
سو مجھے نیت بخیر ہو کر آج شام شاہدرے جانا تھا، مگر اب ذہن پر کچھ ایسا بوجھ آ گیا تھا کہ نیت
اس کے نیچے ٹوٹتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی، میں نے سونے کی ٹھانی۔

انسان کے مشاہدے پر نیت کا سچ مچ بہت اثر پڑتا ہے، اور تم یقین کرو کہ اپنے ان
پڑوسیوں کے معاملے میں میری نیت بالکل صاف تھی، مگر چند واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ
مجھے اپنی نیت پر اتنا شبہ نہیں جتنا ان لوگوں پر۔ بات یوں ہوئی کہ جب میں کمرے میں سامان
جما کر پلنگ پر بیٹھا تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاؤں گا، مگر جب تکیے
پر سر رکھا یوں معلوم ہوا جیسے جب تک میرا سر تکیے پر رہے گا مجھے نیند نہیں آئے گی۔ میں نے ایک کتاب
"آرٹ کے شہ پارے" اٹھالی اور دنیا کے بڑے بڑے مصوروں کی تخلیقات دیکھنے لگا۔ نیت
گڈ مڈ تھی مگر ان تصویروں نے نیت وغیرہ کو اپنے حسن کی گرفت سے درست کر لیا تھا اور میں بڑے
مزے سے ورق الٹ رہا تھا جب اچانک میرے فلیٹ کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

آج رات میں صرف سونا چاہتا تھا۔ شام کے کھانے تک کو میں نے کل صبح پر ملتوی کر دیا
تھا اور چٹکنی لگا کر اطمینان سے پلنگ پر لیٹ گیا تھا۔ دستک ہوئی تو ذرا سی کوفت ضرور ہوئی
مگر کوفت سے زیادہ حیرت ہوئی۔ کسی دوست کو میرے نئے فلیٹ کا علم نہ تھا اس لیے یہ
دستک اور بھی پر اسرار معلوم ہوئی۔ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا تو کبوتروں نے روشندان
میں کچھ اس انداز میں غٹرغوں کی جیسے وہ شعوری طور پر مجھ پر ہنس رہے ہیں ــــ نہیں نہیں
میری نیت بالکل ٹھیک تھی، کبوتر کمبخت۔ بولتے ہی اسی ڈھب سے تھے سو میں نے دروازہ کھولا

"ہلو نبیر!" آواز آئی "میں رابرٹ ہوں، رابرٹ سگوڑا" ——— اور پھر مصافحے کے لیے میرے ہاتھ کے اٹھنے کا انتظار کیے بغیر وہ والہانہ اندر چلا آیا۔ پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا اور ہنس کر بولا "عجیب بات ہے کہ اس کمرے سے میرا اُنس کم ہی نہیں ہوتا۔ یہاں کوئی بھی کرایہ دار آ نکلے میں اس روشن دان، اس الماری، اس پارٹیشن اور پارٹیشن کی اس جھری کو سراسر اپنی ملکیت سمجھتا ہوں۔ غلط بات ہے لیکن ہے سچی بات، اور یہ سچی بات کتنی عجیب ہے!" وہ پلنگ کی طرف بڑھا اور میری نظریں پارٹیشن میں جھری تلاش کرنے لگیں لیکن میں نے فوراً اپنے آپ پر قابو پا لیا اور رابرٹ کے پاس آ کر اپنا ہاتھ بڑھایا "میرا نام طارق ہے۔" وہ ذرا سا شرمندہ ہو گیا، ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور بولا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" پھر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "آرٹ کے شہ پارے" اٹھا کر ورق الٹنے لگا "اوہ ونڈرفل، آفلی ونڈرفل" اس نے پکاسو کی ایک تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ اس تصویر میں پکاسو صرف ایک لنگوٹ باندھے اپنی چند تصویروں کے پاس پہلوانوں کی طرح اکڑ کر کھڑا تھا اور رابرٹ پکاسو کے فوٹو ہی کو پکاسو کا فن پارہ سمجھ رہا تھا، کیونکہ اس نے پکاسو پر انگلی پھیری اور کہا "بالکل جیتا جاگتا انسان معلوم ہوتا ہے!" میں نے اس کی تصحیح کی ضرورت نہ سمجھی اور پلنگ کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

رابرٹ کھلتے ہوئے رنگ کا نوجوان تھا۔ بڑا طرار اور بے چین قسم کا نوجوان۔ شباب کا گرم خون اس کی رگوں میں رینگنے کے بجائے لپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں بہت بجھی بجھی سی معلوم ہوتی تھیں، اور وہ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر کر ان کی خشکی کو چاٹ لیتا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "آپ کراچی کب جا رہے ہیں؟"

حیران ہو کر بولا "کراچی؟ میں کراچی وراچی نہیں جا رہا۔ آپ کو کس نے بتایا؟"

میں نے کہا "آپ کی ممی نے۔"

کچھ سوچتے ہوئے مسکرایا اور بولا "اوہ آئی سی، تو میں اب نہیں جا رہا۔"

"کیا مشاغل ہیں آپ کے؟" میں نے پھر ایک سوال کیا۔

"مشاغل؟" اس نے پوچھا اور پھر زور زور سے ہنسنے لگا۔ "پتنگوں کے پر اور ٹوتھ پیسٹ ٹیوبوں کی ٹوپیاں اور ـــــ اور تاریخی شخصیتوں کی تصویریں جمع کرنا۔"

میں نے الماری کے ایک پٹ پر چپکی ہوئی ننگی عورت کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا "یہ کون تاریخی شخصیت ہے؟"

رابرٹ سکوڈا بے اختیار ہنسنے لگا، پھر اس نے میرے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور ہنسی پر ضبط کرتے ہوئے۔ بولا "یہ ازلی اور ابدی عورت ہے۔ یہ وہ عورت ہے جسے ہم حوا کہتے ہیں، اور یہی وہ عورت ہے جو ادھر اُدھر آپ کے اڑوس پڑوس میں رہتی ہے، یہ مجسم عورت ہے۔"

رابرٹ سکوڈا مجھے ایک دم پچاس برس کا بڈھا معلوم ہونے لگا۔ میں دانش کے ان موتیوں کو ابھی چن ہی رہا تھا کہ اس نے تپائی پر سے میرا قلم اٹھا لیا اور بولا "بڑا نفیس ڈیزائن ہے!"

میں نے کہا "نہیں خاصا پرانا ڈیزائن ہے، ایورشارپ ہے، ہر جگہ ملتا ہے۔"

وہ بولا "لیکن میں نے ایورشارپ کا یہ ڈیزائن پہلے کہیں نہیں دیکھا۔"

"ممکن ہے۔" میں نے کہا۔

اور اس نے اپنی آواز میں بڑی نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا "آپ اجازت دیں تو میں یہ قلم ایک آدھ دن کے لیے لے جاؤں، میں دکان دار کو یہ نمونہ دکھا کر اسی ڈیزائن کا خود بھی خریدنا چاہتا ہوں، لے جاؤں؟"

انکار کے راستے مسدود تھے، سو میں نے کہا "ضرور لے جائیے، عام ملتے ہیں۔"

"شکریہ"، اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر دروازے کے پاس جا کر مڑا "شب بخیر۔"

"شب بخیر" میں نے کہا اور دروازہ بند کردیا۔ پارٹیشن کی جھری میں سے میں نے دیکھا کہ رابرٹ روشنی میں کھڑا میرے قلم کو گھما گھما کر دیکھ رہا ہے، پھر کچھ دیر کے بعد کوئل کی آواز آئی "لٹ می سی رابی" اور ڈورا جھری کے فوکس میں آگئی۔ وہ سر سے پاؤں تک مشرقی عورت تھی۔ ہمارے ہاں عورت کی خوبصورتی کا ایک اپنا تصور ہے، سو ڈورا مجھے اس تصور کی ایک مثال نظر آئی۔ اس نے رابرٹ سے قلم لیا نہیں بلکہ چھین لیا، اسے اپنے بلاؤز میں چھپا کر رقص کے دو تین دائرے بنائے اور ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

اور میں رات بھر اس کی ہنسی کے گھنگھرو اور گھنٹیاں چنتا رہا۔ نیت بخیر مجھے خوب نیند آئی، صبح کو کبوتر روشن دان میں شور نہ مچاتے تو ممکن ہے میں دوپہر تک سویا رہتا۔

دوسرے دن میں شام تک دفتر میں رہا اور پھر وہیں سے شاہدرے چلا گیا لیکن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے چاند بھی غائب رہا اور میں دس بجے تک گاہے گاہے چمکتے ہوئے بادلوں پر نظریں گاڑے بیٹھا رہا۔ اس دھندلکے میں مقبرہ زمین سے یوں اٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے ہوا میں معلق ہے۔ حجروں کے دروازوں میں اندھیرا عجیب عجیب صورتیں بدل رہا تھا۔ گھاس کے قطعے کالے پانی کی جھیلیں معلوم ہوتے تھے، مایوس ہو کر میں واپس لاہور آگیا اور جب گیارہ بجے رات فلیٹ میں داخل ہوا تو ڈورا اور رابرٹ رقص کے ساتھ ساتھ رقص کی کوئی ٹیون گا رہے تھے۔ روشنی کیے بغیر میں نے جھری میں سے دیکھا ڈورا رابرٹ نے وہی کل رات والا لباس پہن رکھا تھا، البتہ آج ڈورا کے سر پر بالوں میں گھونگھر ڈالنے والے بہت سے کلپ چمک رہے تھے۔ وہ ناچنے اور گانے کے ساتھ ساتھ مسکرائے جا رہی تھی، اور مسکراتے ہوئے اس کے ایک رخسار میں ایک قوس سی اور دوسرے پر ڈمپل پیدا ہو جاتا تھا، اور یہ چیزیں کچھ ایسی نمایاں نظر آنے لگتی تھیں جیسے مصنوعی ہیں اور کلپ لگا کر پیدا کی گئی ہیں۔ جھری میں دیکھتے ہوئے میں نے ہاتھ بڑھا کر بجلی جلائی تو وہ دونوں رک گئے اور خاموش ہو گئے۔ "سویٹ!" ڈورا نے آہستہ سے کہا، اور رابرٹ دانشوروں

کے سے دبدبے سے بولا ''ہی از اے جرنلسٹ، اے نائٹ برڈ!''—— اچانک ڈورا میری طرف بڑھی اور میں اچھل کر ایک طرف ہو گیا پھر ٹہلنے لگا، اور مجھے یوں معلوم ہوا کہ جھری میں سے اس کی نظر ایک محسوس اور مرئی صورت اختیار کر کے میرا پیچھا کر رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر بجلی بجھا دی اور پلنگ پر گر پڑا، اور جب کچھ دیر کے بعد اُدھر کی بجلی بجھا دی گئی تو اپنے کمرے میں روشنی کر کے میں نے ''مقبرۂ جہانگیر دھند لکے میں'' کے عنوان سے اخبار کے لیے فیچر لکھنے کی ٹھانی۔ اس وقت مجھے اپنا قلم یاد آیا، جی چاہا آہستہ سے دستک دے کر رابرٹ سے قلم مانگ لوں مگر پھر سوچا کہ ممکن ہے وہ سو گئے ہوں اور میری یہ حرکت خلافِ تہذیب سمجھی جائے، پنسل ہی سے چند صفحے لکھے اور سو گیا۔

یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے، میں تیار ہو کر دفتر جا رہا تھا، بلڈنگ کی سیڑھیوں پر سے اتر کر چوکیدار سے سائیکل لے رہا تھا جب ایک ہرکارہ آیا اور مجھ سے میرے ہی نام کا پتہ پوچھنے لگا۔ یہ میرے بڑے بھائی کا تار تھا جس میں لکھا تھا کہ ایک مہینے کے بعد بھانجی کی شادی ہونے والی ہے اس لیے ابھی سے سامان خریدنے کی فکر کرو۔ تار لے کر میں نے فارم پر دستخط کرنا چاہے مگر ہرکارے کی پنسل کا سکہ گھس چکا تھا اور میں اپنی پنسل فلیٹ میں بھول آیا تھا۔ اتفاقاً سیڑھیوں پر سے رابرٹ اترا، میں نے کہا ''آپ کے پاس پنسل ہوگی؟'' اس نے جیب سے فوراً میرا قلم نکالا، اس کی ٹوپی اپنے پاس رکھ لی اور قلم مجھے دیتے ہوئے بولا ''خیریت تو ہے؟'' میں نے دستخط کرتے ہوئے کہا، ''خیریت ہی ہے، ایک عزیزہ کی شادی کی تاریخ کی اطلاع ہے۔'' میں دستخط کر چکا تو اس نے قلم میرے ہاتھ سے لے لیا اور اس پر ٹوپی چڑھا کر جیب میں رکھنے لگا تھا کہ ایک دم اس کا رنگ زرد پڑ گیا، اور ذرا سی کانپتی ہوئی آواز میں بولا ''معاف کیجیے گا آپ ہی کا قلم ہے!''—— اور قلم کو میرے ہاتھ میں ٹھونس کر اور پلٹ کر وہ بڑی تیزی سے سیڑھیوں میں غائب ہو گیا۔

میرے دل کو شدید دھکا لگا۔ یہ قلم ایک گالی بن کر میرے جسم سے چپک گیا تھا۔ آسے

جیب میں رکھے بغیر میں پلٹا اور تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے کے بعد میں نے مسز سکوڈا کے فلیٹ پر دستک دے دی۔ ایک لمحے کے بعد دروازہ کھلا، دروازہ ڈورا نے کھولا تھا۔ اس نے رات ہی کا لباس پہن رکھا تھا۔ بے شمار گھونگھروؤں کے سبب بال اس کے سر پر ایک بڑی سی ٹوپی بن کر جمع ہو گئے تھے اور اس کی لمبی آنکھوں میں مقبرۂ جہانگیر کی سی دھند تھی۔ "ہلو" اس نے کہا اور پھر فوراً ایک طرف ہٹ کر بولی "آئیے"۔ میں اندر چلا گیا۔ "بیٹھیے" اس نے کہا۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ صوفہ ان بھاری بھرکم صوفوں میں سے تھا جن پر بیٹھنے سے انسان ان میں غرق ہو جاتا ہے، گھٹنے اوپر اٹھ جاتے ہیں اور فرش اور سیٹ کے درمیان صرف چند انچ کا فرق رہ جاتا ہے۔ میں صوفے میں غوطہ لگانے کے بعد ایک بار ابھرا اور اس کے پرے گوشے میں ذرا آرام سے بیٹھنے کی کوشش کی مگر میں پھر غرق ہو گیا اور آخر اسی حالت پر قانع ہو کر بولا "آپ بھی تو بیٹھیے"۔۔۔ وہ "شکریہ" کہہ کر سامنے ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور میں قلم کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے بولنے کی ہمت کی: "یہ قلم شاید مسٹر رابرٹ کا ہے۔ میں نے دستخط کرنے کے لیے ان سے مانگا اور وہ اسے واپس لیے بغیر چلے آئے"۔

"یہ قلم آپ ہی کا ہے"۔ ڈورا بولی اور ساتھ ہی مسکرائی بھی، مگر اس کے گالوں پر قوس اور ڈمپل پیدا نہ ہوئے: "رابرٹ نے اسی ڈیزائن کا قلم خرید لیا ہے، صرف رنگ میں فرق ہے یہ چاکلیٹ ہے اور وہ ۔۔۔ وہ نیلا ہے"۔

میں نے اطمینان کی سانس لی، میں نے کہا "خوب، اس ڈیزائن کے لیے نیلا رنگ تو واقعی بہت اچھا رہے گا، میں وہ قلم دیکھ سکتا ہوں؟"

ڈورا کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا۔ ہاتھوں کو گھٹنوں کے درمیان دبا کر بولی "رابرٹ آجائے تو دیکھ لیجیے گا ۔۔۔ ضرور دیکھیے گا"۔

اخبار نویسوں کی بے رحم حقیقت پسندی میری عادت بن چکی ہے، میں نے کہا "مگر رابرٹ تو ابھی بس چند منٹ ہوئے ادھر آئے ہیں"۔

"جی نہیں" اس کی آواز میں گونج پیدا ہوگئی "وہ یہاں نہیں ہے، شاید اسی بلڈنگ میں کسی دوست کے پاس چلا گیا۔ اس کے بے شمار دوست ہیں۔ اس کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ وہ جس سے بھی متعارف ہوتا ہے وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔" وہ بولتی چلی گئی۔

موضوع کو ختم کرنے کے لیے میں نے کہا "آپ کے پاس ایک کتاب، ہوگی ——— قدیم بغداد ———"

"قدیم بغداد ——— !" اس نے حیرت سے کہا "جی نہیں، میرے پاس ایسی کوئی کتاب نہیں۔"

"مسز سکوڈا کہہ رہی تھیں۔" میں نے سچا بننا چاہا۔

اس کا رنگ پھر اڑ گیا، فق چہرے پر اس کے ہونٹوں کی سرخی میں نیلاہٹ دوڑ گئی اور اس نے گھٹنوں کی گرفت سے اپنے ہاتھوں کو چھڑا کر انگلیاں چٹخانا شروع کر دیں، پھر ایک دم وہ اپنی انگلیوں کی آواز سے چونکی اور بولی "آئم سوری۔" پھر کسی وقفے کے بغیر ایک ہی سانس میں بولنے لگی۔ "ممی کے پاس ہو تو ہو، میرے پاس تو نہیں ہے، میں ممی سے پوچھوں گی، اور انھوں نے کسی اور کو نہ دے دی تو کل پرسوں تک آپ کو بھجوا دوں گی۔ بڑی اچھی کتاب ہوگی، نام ہی میں کتنا رومانس ہے، قدیم بغداد، الف لیلہ اور ہارون الرشید اور بوڑھے جادوگر ——— ضرور پڑھیے گا۔"

ایک لمبی سانس لے کر وہ مسکرائی اور بولی "میرا نام ڈوروتھی ہے ——— ڈوروتھی سکوڈا۔"

"اور میرا نام طارق ہے۔" میں نے کہا "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔" وہ کھل کر مسکرائی اور اس کے ایک رخسار میں قوس اور دوسرے میں ڈمپل پیدا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ سرخ ہو گئے، آنکھوں کی دھند چھٹ گئی، کان کے نیچے گردن پر تڑپتی ہوئی ایک نس کی حرکت میں سکون آ گیا اور وہ کچھ ایسے اطمینان سے مجھے دیکھنے لگی جیسے کوئی فاتح میدان جنگ میں ہر طرف دشمنوں کی بکھری ہوئی

لاشیں دیکھ رہا ہو۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے فلیٹ میں آیا اور فوراً جھری پر اپنی آنکھ رکھ دی۔ رابرٹ عقبی کمرے میں سے نکلا اور بہن بھائی ایک دوسرے سے اس تپاک سے ملے جیسے برسوں سے جدا تھے۔ مسز سکوڈا بھی جھری کے فوکس میں آگئیں۔ وہ مسکرا رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر ڈورا کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے اور رابرٹ اداس ہو کر صوفے میں ڈوب گیا۔

میں جھری پر سے ہٹ آیا۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اکٹھے تین قتل کر کے آرہا ہوں۔ میرا دل بھینچ بھینچ کر دھڑکنے لگا اور میں نے قلم کو میز پر اس زور سے پٹخا کہ اگر معمولی قلم ہوتا تو اس کے کئی ٹکڑے ہو گئے ہوتے۔

آئندہ چار پانچ روز ایک خلا میں گزرے۔ میں اپنے پڑوسیوں سے کتراتا تھا تو میرے پڑوسی مجھ سے کتراتے تھے۔ میرے آتے ہی فلیٹ پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا۔ مسز سکوڈا کی کھانسی کی آواز تک سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ضبط کی کوشش کر رہی ہیں تاکہ میں نہ سن پاؤں ڈورا اور رابرٹ تو بالکل غائب ہی ہو گئے تھے جن میں نے بھی کھوج لگانے کی کوشش نہ کی۔ میرے دل میں چور سا تھا، اور بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے وقت خواہ مخواہ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگتی تھی۔

یہ میرے فلیٹ میں آنے کے کوئی دس دن بعد کا ذکر ہے۔ میں رات کے نو بجے دفتر سے آیا۔ روشنی ابھی نہیں کی تھی کہ پارٹیشن کے ایک طرف مجھے ڈورا اور رابرٹ سرگوشیوں میں بولتے سنائی دیے "تم جانا" ڈورا کہتی۔ "نہیں تم" رابرٹ کہتا۔ یہ گردان کچھ دیر تک جاری رہی جب مسز سکوڈا کی آواز آئی "تم ہی چلی جانا ڈورا۔ قلم کے حادثے کے بعد رابرٹ اس کے سامنے جانے سے گھبراتا ہے، ویسے بھی مرد لوگ دکھاوے ہی کے لیے سہی عورت کا احترام کر ہی لیتے ہیں!" گفتگو کا موضوع میں تھا اس لیے میں نے فوراً بجلی جلا دی اور سرگوشیاں کٹ گئیں۔ ابھی جوتوں کے تسمے ہی کھول رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے لپک کر

دروازہ کھولا تو ڈورا اندر آ گئی۔ اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا۔ بالوں کے گھونگھر ہموار ہو گئے تھے اور ناخنوں کا پالش کھنڈروں کے پلستر کی طرح اکھڑا ہوا تھا۔ وہ بولی "معاف کیجیے گا میں بے وقت آئی۔ اصل میں بات وہی ہوئی جو میں نے کہی تھی۔ ممی نے "قدیم بغداد" اپنی ایک دوست کو دے دی تھی، آج ہی رابرٹ واپس لایا ہے، میں نے کہا آپ نے اتنے شوق کا اظہار کیا تھا اس لیے آج ہی پہنچا دوں، یہ لیجیے ـــــ" اس نے ایک ضخیم کتاب میرے ہاتھوں میں دے دی اور جانے کے لیے پلٹی۔

بہت بہت شکریہ" میں نے کہا "مگر آپ چلیں کہاں؟ ایک منٹ بیٹھیے تو۔"

ڈورا جہاں رکی تھی وہیں قریب کی کرسی پر بیٹھ گئی "شکریہ" اس نے کہا اور میں کتاب کھول کر دیکھنے لگا۔

پہلے صفحے پر جانسن سکوڈا کے دستخط تھے اور نومبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ۔ کتاب میں بے شمار تصویریں تھیں اور بہت خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہوئی تھی، مگر یہ دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کہ کتاب بہت نئی ہے۔ آٹھ نو برس پرانی کتاب اگر پڑھی نہ جائے جب بھی ذرا سا رنگ ضرور بدل لیتی ہے مگر اس کتاب میں سے تو اس کے نئے پن کی خوشبو آ رہی تھی۔

ہم چند لمحے چپ چاپ بیٹھے رہے، خاموشی کو بھدے پن کی حد کو چھوتے دیکھ کر میں نے کہا "بہت دنوں سے رابرٹ کو نہیں دیکھا۔"

ڈورا بولی "وہ بیمار ہے، انفلوئنزا نے اسے چار دن تک پریشان رکھا۔"

"اور مسز سکوڈا؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا بھی جسم ٹوٹتا رہا۔ باہر بہت کم نکلیں۔" وہ بولی "موسم ہی کچھ ایسا ہے۔"

میں نے ایک پل کی خاموشی کے بعد کہا "اور آپ؟"

"میں!" وہ حیران رہ گئی، جیسے اسے اس سوال کی توقع ہی نہ تھی۔ پھر وہ آنکھیں جھکا کر مسکرا دی اور اس کے رخساروں پر قوس اور ڈمپل ابھر آئے "میں تو ٹھیک تھی، ویسے ہی بس ـــ

ویسے ہی پڑی رہی، کوئی خاص بات نہیں۔"

موضوع ختم ہوگیا تھا۔ ڈوراکو بھی شاید اسی کا انتظار تھا، اجازت مانگی اور اٹھ کر جانے لگی۔ دروازے کے پاس جاکر اس نے پلٹ کر کہا "شب بخیر۔"

"شب بخیر۔" میں نے مردانہ وار ذرا سا جھک کر کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کتاب کو پڑھنے کے شوق کے بجائے اس خیال سے اٹھایا کہ ابھی ابھی یہ ڈوراکی لمبی لمبی انگلیوں کی گرفت میں تھی۔ بے وقوفی کی بات ہے لیکن مجھے ڈوراکا نرم اور نارمل رویہ دیکھ کر اس سے اُنس سا ہو رہا تھا۔ میں نے "اُنس" کا لفظ بہت محتاط ہو کر استعمال کیا ہے تاکہ تمہیں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ میں نے ایک دوبار محبت کی ہے اس لیے تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں کہ مجھے ڈورا سے اُنس سا ہو رہا تھا، اور اُنس تو بھیک مانگنے والی ذرا سی بچی سے بھی ہو سکتا ہے اور پنجرے میں چہکتی ہوئی مینا سے بھی۔

تو میں نے ڈورا سے اُنس کے مارے کتاب اُٹھائی اور میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ——— کتاب کا سنِ اشاعت ۱۹۵۱ء تھا تو کیا جانسن سکوڈا نے کتاب کی اشاعت سے آٹھ سال پہلے ہی اس پر دستخط کر دیئے تھے؟ میں چکرا کر بیٹھ گیا۔ سارے حالات میری سمجھ میں آگئے۔ مسز سکوڈا، ڈورا اور رابرٹ نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے کہیں سے تیرہ روپے جمع کر کے آج ہی یہ کتاب خریدی تھی اور سنِ اشاعت کو دیکھے بغیر اس پر آٹھ سال پہلے کے دستخط ثبت کر دیے تھے۔

قلم کے بعد آج یہ کتاب میرے ہاتھوں سے گالی بن کر چمٹ گئی تھی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اس کتاب کی موجودگی سے میرے ذہن پہ کیا کیا کیفیتیں طاری ہوئیں۔ میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ پڑھا، ایک تصویر تک نہ دیکھی، بس بیٹھا اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس کتاب میں ایک پورے گھرانے کا ناموس دفن ہے، اور اسے پڑھنے کا مطلب یہ ہوگا

کہ اس ناموس کی قبر کھود رہا ہوں۔

ایک ہفتے کے بعد میں نے مسز سکوڈا کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ رابرٹ نے کھولا" اوہ ہلو!" اس نے بڑے تپاک سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "بڑا افسوس ہے کہ ان دنوں میں آپ سے مل نہیں سکا۔ چند روز بیمار رہا اور پھر چند روز ایک نجی کام میں مصروف رہا، آپ کیسے رہے؟"

میں نے اندر صوفے پر غرق ہوتے ہوئے کہا "شکریہ، میں تو بالکل تندرست ہوں البتہ دفتر کی مصروفیت نے چکرائے رکھا —— میں یہ کتاب واپس دینے آیا تھا۔"

"اوہ!" وہ بولا "قدیم بغداد" پھر وہ پکارا "ممی!"

مسز سکوڈا اندر آئیں۔ میں ادب سے اُٹھا اور پھر بیٹھنے لگا تو ڈورا اندر آگئی۔ بیٹھتے بیٹھتے میں پھر اٹھا اور صوفے میں ڈوب کر کہا "اتنی دلچسپ کتاب میں نے اپنی ساری زندگی میں نہیں پڑھی، اور پھر اتنی معلومات افزا کہ میں تو اب تک اپنے آپ کو بغدادی کہنے پر مصر ہوں، یہ کتاب تو میرے ذہن پر چھا گئی ہے۔"

مسز سکوڈا نے مسکرا کر تعریف یوں قبول کی جیسے وہی اس کی مصنف ہیں۔ پھر بڑے وقار سے آہستہ آہستہ بولنے لگیں "جانسن کو یہ کتاب جان سے زیادہ عزیز تھی۔ کہتے تھے۔ یہ کتاب مجھے اس سرزمین کی یاد دلاتی ہے جس میں سے خدا کے پیغمبر اُٹھے میں نے تو جانسن کی یادگار کے لیے غلاف چڑھا دیا تھا، ڈورا ڈیر تمہیں یہ کتاب ضرور پڑھ لینی چاہیئے۔ تم نے پڑھ لی ہے رابرٹ؟"

"جی ہاں" رابرٹ نے کہا اور مجھے کیپسٹن کا ایک سگریٹ پیش کیا

میں نے مسز سکوڈا اور ڈورا سے سگریٹ پینے کی اجازت لے کر جب ایک دو کش لگائے تو ذائقہ کیپسٹن سے مختلف معلوم ہوا لیکن میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں سگریٹ کے برینڈ کا سراغ لگا رہا ہوں۔ میں نے باتوں باتوں میں دیکھ لیا کہ سگریٹ بگلے کا ہے

جیسے کیپسٹن کی ڈبیا میں رکھ لیا گیا تھا۔ دل میں کوئی چیز ٹوٹتی سی معلوم ہوئی۔

میں بڑی آسانی سے ان کا پڑوسی ہونے کے باوجود ان سے الگ تھلگ رہ سکتا تھا، لیکن ان کی انہی کمزوریوں کے جادو نے مجھے مجبور کر دیا کہ اگر میرے پاس ان کی نگری میں داخل ہونے کا وقت نہیں ہے تو کم از کم اس نگری کی سرحد پر تو ضرور منڈلاتا رہوں، اور میں چودہ پندرہ روز اور یونہی منڈلاتا رہا۔ پارٹیشن کی پرلی طرف سے گھنگھروؤں اور گھنٹیوں کے چھناکے سنتا رہا، انگریزی میں بولتی ہوئی کوئل کی باتیں سنتا رہا۔ مسز سکوڈا کی اتنی باتیں سنیں کہ اگر چاہوں تو ان کے سوانح لکھ سکتا ہوں۔ رابرٹ تو میرے بہت قریب آ گیا، شیو وہیں بنا رہا ہے، بریک فاسٹ وہیں کر رہا ہے۔ بعض اوقات لنچ تک میرے ساتھ کھا لیتا تھا، ہم اکٹھے سینما دیکھنے جاتے، اکٹھے ریسٹورنٹ میں بیٹھتے تھے اور ان پندرہ دنوں میں پندرہ برس کی مدت طے کر گئے تھے، ڈوراسے مجھے جو اُنس تھا وہ دوستی کی صورت اختیار کرنے لگا۔ ایک روز وہ میرے لیے کہیں سے ایک گلدستہ لے آئی اور اسے میری تپائی پر سجا کر خوش ہو کر اتنی ہنسی کہ قوسوں اور ڈمپلوں کا مینہ برس پڑا۔ پھر اس نے ایک روز میری پتلون کا ایک بکل ٹوٹا ہوا دیکھا تو فوراً سینے پر سے ایک سیفٹی پن نکالا اور بکل کی کمی پوری کر دی۔

اور یہ کل شام کا واقعہ ہے کہ میں اپنی بھانجی کی شادی تیاریوں کے سلسلے میں بازار گیا۔ میں نے اس کے لیے پانچ گز جارجٹ، کے خریدے اور جب اپنے فلیٹ میں آیا تو رابرٹ کو آواز دی۔ وہ بھاگا بھاگا آیا اور جارجٹ کو دیکھ کر دم بخود سا رہ گیا۔ پھر اس نے کپڑے کو چھوا اور بولا "کہیں آپ کا دماغ تو نہیں چل گیا؟ یہ مردانہ کپڑا نہیں۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں، یہ زنانہ کپڑا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہو گیا، پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ بولا "کس کے لیے ہے؟"

میں نے کہا "میری بھانجی کی شادی ہونے والی ہے اس کے لیے خریدا ہے۔"

"میں ابھی آیا" وہ بولا، اور باہر چلا گیا۔

کچھ دیر کے بعد مسز سکوڈا نے دروازے پر سے کہا "مے آئی ؟"

"آئیے آئیے" میں نے تعظیماً اٹھ کر کہا "تشریف رکھیے۔"

وہ بولیں "سنا ہے آپ جارجٹ لائے ہیں بازار سے ؟"

میں نے کہا "جی ہاں، یہ رکھی ہے۔"

بولیں "کتنا پیارا رنگ ہے اس کا، آپ کا انتخاب لاجواب ہے۔ واہ۔ واہ، انھوں نے کپڑا کھول کر اپنے سامنے تان لیا "کے گز ہے ؟"

"پانچ گز" میں نے کہا۔

"خوب" انھوں نے کپڑے کو تہہ کیا اور بولیں "مجھے بھی ڈورا کے لیے خریدنی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کپڑا نمونے کے طور پر لے جاؤں، کل ہی واپس کر دوں گی۔"

میں نے کہا "ضرور لے جائیے، پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

وہ کپڑا لے کر چلی گئیں اور میں سو گیا۔

آج صبح میں اٹھا تو مسز سکوڈا کے ہاں بڑا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ فرنیچر ادھر سے اُدھر گھسیٹا جا رہا ہے، برتن بج رہے ہیں، ڈورا چہک رہی ہے اور رابرٹ اسے سامان کی سجاوٹ کے سلسلے میں ڈانٹ رہا ہے۔ میں نے بہت دنوں کے بعد آج اس جھری میں سے دیکھا۔ ڈورا اسی قدیم لباس میں کھڑی تصویروں پر سے گرد جھاڑ رہی تھی، اس کے سر پر بہت سے کلپ چمک رہے تھے اور رابرٹ صرف ایک نیکر پہنے صوفے کو ایک نئے زاویے پر رکھ رہا تھا۔ مسز سکوڈا غائب تھیں یا جھری کے فوکس میں نہ آسکیں۔

اس ہنگامے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کپڑے بدل کر ہوٹل اور دفتر جانے کی ٹھانی فلیٹ کو مقفل کر کے میں باہر آیا تو ادھر سے رابرٹ نکلا اور بولا "آج ڈورا کی بائیسویں

سال گرہ ہے، ممی معافی مانگ رہی ہیں کہ ہم آپ کو مدعو نہیں کر رہے، ہمارے ہاں چند ایسے بزرگ آ رہے ہیں جو کسی غیر مذہب کے آدمی کو برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ خاص طور سے گھریلو قسم کی دعوت کے موقع پر۔ نہایت بے وقوفی کی بات ہے لیکن بڑی مجبوری ہے امید ہے آپ محسوس نہیں کریں گے۔"

مجھے رابرٹ کی یہ صاف گوئی بہت بھلی معلوم ہوئی، خوش ہو کر میں نے کہا" ایسے بزرگ ہر مذہب میں ہوتے ہیں، جو اپنے مذہب سے باہر کے سب انسانوں کو گدھا سمجھتے ہیں، لیکن میں ڈورا کی سال گرہ میں جسمانی طور پر نہیں تو روحانی طور پر شریک ہوں گا، اور مسز سکوڈا سے کہہ دیجیے کہ میرے تحفے کو ان کا کوئی بزرگ نہیں روک سکے گا، ہاں!"

ہم دونوں خوب ہنسے۔ ڈورا شاید مارے جھینپ کے باہر نہ آئی اور مسز سکوڈا تو خیر غائب تھیں ہی۔

میں شام کے بعد تک بازار میں ڈورا کے لیے تحفہ تلاش کرتا رہا، مگر جس تحفے پر میری نگاہِ انتخاب پڑتی اس کے پہلو میں ایک اور چیز ایسی رکھی ہوتی تھی جو میرے منتخب تحفے کی اہمیت کو کم کر دیتی۔ آخر میں اس خیال سے واپس چلا آیا کہ کل ڈورا نہیں تو رابرٹ یا مسز سکوڈا کو بازار ساتھ لے آؤں گا اور وہ اپنی پسند کی چیز خرید لیں گے۔

میں کافی دیر کے بعد اپنی بلڈنگ میں آیا، مسز سکوڈا کے فلیٹ کا دروازہ بھڑا ہوا تھا مگر اندر سے قہقہوں، مسرت بھری چیخوں اور کانٹوں چمچوں اور پلیٹوں کے بجنے کی آوازوں کا ایک سیلاب باہر امڈا پڑتا تھا۔ میں نے چپکے سے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو یہ آوازیں ایک دم بہت بلند ہو گئیں، روشنی جلائے بغیر میں سیدھا جھری کے پاس گیا، میں ڈورا کو اس کی سال گرہ کے ٹھاٹ میں دیکھنا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ اسی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہنے والے ایک فرم کے ہیڈ کلرک پر پڑی جو ایک ڈھیلا ڈھالا ڈنر سوٹ پہنے مسلسل مسکرائے جا رہا تھا —— اور وہ مسلمان تھا!

میں چھری پر سے ہٹ آیا۔ رابرٹ اور مسز سکوڈا اور ڈورا تک سے مجھے انتہا درجے کی نفرت ہو گئی۔ جی میں آئی کہ یہیں سے چلّا کر انھیں اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کردوں مگر نفرت کے اس اعلان سے پہلے میں ایک بار ڈورا کو دیکھنا چاہتا تھا۔

میں پھر چھری پر آگیا۔ ڈورا میز کے سرے پر کھڑی مسکرا رہی تھی اور مجھے ایک زور کی گھری آگئی، جانتے ہو کیوں؟ سنو۔

ڈورا نے جارجٹ کے اسی کپڑے کی ساڑھی پہن رکھی تھی جسے مسز سکوڈا نمونے کے طور پر مجھ سے مانگ کر لے گئی تھیں اور اس ساڑھی میں اتنی خوبصورت لگ رہی تھی کہ ——— خیر چھوڑو اس بات کو۔

سو یہ جو میرا رنگ ذرا اُڑا سا لگ رہا ہے نا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں بیمار ہوں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے مسز سکوڈا کو اس مضمون کی ایک چٹ لکھ بھیجی ہے کہ جارجٹ کے اسی ٹکڑے کو میرا تحفہ سمجھ لیا جائے۔

اور جو بات میں ابھی تک سوچ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ میں ڈورا سے محبت کروں یا اس پر ترس کھاؤں۔

سنّاٹا

انبالے میں وہ عشق کرنے کی بجائے عشقیہ ناول پڑھتی تھی مگر آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی وہاں سے کچھ اس طرح دامن جھاڑ کر بھاگنا پڑا کہ ان ناولوں کے ساتھ غزلوں کے وہ منتخب اشعار بھی وہیں رہ گئے جنھیں وہ سونے سے پہلے گنگنانے کی عادی تھی۔

گنگناتی تو وہ اب بھی تھی مگر یہ گنگناہٹ لفظوں سے بے نیاز تھی، اور پھر چلتے ہوئے کنوئیں کی رُوں رُوں میں صرف رہٹ ہی کا نغمہ تو نہیں ہوتا، اس میں جتے ہوئے بیل کی درماندگی اور گادی پر بیٹھے ہوئے کسان کے خوابوں کی الاپ بھی تو شامل ہوتی ہے۔ سو کلثوم کی یہ گنگناہٹ محض گنگناہٹ نہ تھی اس میں اس کے شباب کی تھکن اور اس کے جذبات کی اچٹتی نیندوں کی پکار بھی تو شامل تھی۔

اب اس میں نئے ناول اور غزلوں کے نئے انتخاب خریدنے کی سکت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ دن انبالے ہی رہ گئے تھے جب بھائی جان ہر مہینے کی پہلی کو کریون کا ڈبہ ہاتھ میں لیے مسکراتے ہوئے آتے اور کہتے "کہاں گئی وہ ہماری قد آور بہن جسے چند برس بعد اردو کی جین آسٹن بننا ہے ــــــ"، کلثوم ناول کو میز پہ پٹخ کر تیزی سے اٹھتی اور بھائی جان سے لپٹ جاتی، پھر ناولوں کی پہلے سے تیار کی ہوئی فہرست ان کے سپرد کر دیتی اور دیر تک بیٹھی ان کی راہ تکتی رہتی، اور جب ناولوں کا ایک ڈھیر اس کی میز پر لگ جاتا تو وہ چند روز کے لیے تو کھانا پینا اور سونا تک بھول جاتی۔ ناولوں کی ہیروئنوں کے ساتھ چاندنی راتوں

کے طلسمات میں بھٹکتی رہتی۔ گرم گرم مضبوط باہوں میں بھینچ کر اسے اپنا جسم چٹختا سا محسوس ہوتا۔ ہونٹوں پر آبلے پڑ جاتے۔ انگلیوں کی پوروں میں چنگاریاں بھر جاتیں اور جب وہ اندھیری رات کے سناٹے میں پنجوں کے بل چل کر دالان طے کرتی اور اپنے محبوب کی کار میں بیٹھ کر دور انجانی نگریوں اور ان دیکھی وادیوں میں نکل جاتی تو کتاب میں انگلی رکھ کر اتنی لمبی انگڑائی لیتی کہ اس کے جسم کا سارا لہو اس کے چہرے میں جمع ہو جاتا اور پھر اس کی باہیں ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح پلنگ کی پٹی پر سے لٹکنے لگتیں اور وہ آنکھیں بند کر کے بڑے کرب اور بڑی سرشاری سے کہتی "ہائے ری میں مر گئی۔"

لیکن انبالے سے لاہور آتے ہوئے پناہ گزینوں کے قافلے ہی میں بھائی جان کو عشق ہو گیا۔ ایک عورت نے ان سے ایک وقت کے کھانے کی بھیک دینے کا بیڑا اٹھا لیا اور یہ سب کچھ آناً فاناً میں ہو گیا۔ شام کو انھوں نے عورت کو روٹی کھلائی اور صبح کو قافلے ہی میں سے ایک مولوی صاحب کو ڈھونڈ نکالا۔ مولوی صاحب نکاح پڑھ کر اور بڑھتے ہوئے نرخ کے مطابق دو روپے لے کر رخصت ہو گئے۔ تو جب جا کر کلثوم کی امی کو پتہ چلا کہ سہرے بندھے بندھا کر کھل بھی چکے اور مسماۃ ناجواب بیگم نجمہ ارشاد احمد کا روپ اختیار کر کے ان کے پاؤں چھونے آئی ہے۔ اماں نے تو آنکھیں پھاڑ کر "اللہ الصمد!" کہا اور بے ہوشی پر قابو پانے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگیں لیکن چاروں بہنوں نے حیرت کے لمحاتی سکوت کے بعد ایک دوسرے کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا: کاش یہاں ذرا سی مہندی مل جاتی تو بھابی کے ہاتھوں میں رچاتے اور گیت گاتے اور ذرا سا ناچ بھی لیتے۔ یہ کلثوم نے سوچا تھا اور سوچ کر کہہ بھی دیا تھا مگر باقی تینوں بہنیں ڈھول کی دنیا میں حنا کی تلاش کے خیال تک سے چکرا گئیں اور بس اتنا کر پائیں کہ نجمہ ارشاد احمد کی خاطر اپنا ایک ایک پل کا آرام حرام کر ڈالا۔

لاہور میں چند ہفتے بھٹکنے کے بعد انھیں اپنے گھر کی دیواروں کا سایہ میسر آیا تھا۔

صحن میں قدم رکھتے ہی برقعے اتار کر ایک طرف پھینک دیے اور دیواروں سے لگ کر پاؤں پسار دیے۔ کچھ دیر انبالے والے گھر کی یاد میں روئیں، پھر جب اٹھیں تو معلوم ہوا کہ نجمہ ارشاد احمد نے ایک کمرے کو چھوڑ کر باقی سارے مکان پر قبضہ کرلیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ رانڈوں اور کنواریوں کے پاس ایک سے زیادہ کمرہ ہو تو سمجھ لو دوسرا کمرہ گلچھرے اڑانے کا اڈہ ہے۔ کھلے مکان تو بیاہتا عورتوں ہی کو زیب دیتے ہیں! منہ کھلے کے کھلے رہ گئے مگر اس سے زیادہ کچھ نہ ہو سکا۔

چند روز کے بعد نجمہ ارشاد احمد نے سب کا راشن مقرر کردیا تو ماں بیٹیوں میں کھسر پھسر ہوئی اور پھر دیر تک آنسو بہائے جاتے رہے۔ نجمہ نے ادھر سے گزرتے ہوئے رقت کا یہ طوفان دیکھا تو اپنے کمرے میں جا کر "اک بنگلہ بنے نیارا" کا ریکارڈ لگا دیا۔ تلووں میں بھڑک کر چوٹی میں جا بجھی مگر زبانیں نہ ہل سکیں۔

اور پھر بیگم نجمہ ارشاد احمد نے ایک اور روپ بدلا، لگائی بجھائی کا دھندا شروع کردیا ایک روز منہ پھاڑ کر کہہ ڈالا کہ "کلثوم کل دروازے سے لگی سامنے دودھ ملائی والے کو پٹر پٹر آنکھیں مار رہی تھی —— اور جب میں نے ٹوکا تو بولی "یہ بات تمہیں بھابی میری آنکھ میں پلک گر گئی ہے"۔ اب یہ تو قیامت کے دن جا کر معلوم ہو گا کہ پلک گری تھی کہ بے حیائی کو دی تھی۔

کلثوم اس وقت دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، یہ سنا تو دیوار کو یوں پکڑا جیسے اینٹوں میں انگلیاں گاڑ دے گی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے نجمہ کو دیکھتی رہی پھر ایک دم رو دی اور زمین پر یوں ڈھیر ہو گئی جیسے اب تک صرف ایک دھاگے کے سہارے لٹک رہی تھی۔ اور ابھی کلثوم کی ہچکیاں اور قسمیں نہیں تھمی تھیں جب چند روز بعد نجمہ نے ایک اور شوشہ چھوڑا۔ اب کے اس نے کلثوم سے چھوٹی زہرہ کو تاکا۔ ہوائی اڑائی کہ "زہرہ اوپر چھت پر بیت الخلا میں جانے کا بہانہ کر کے سب کپڑے اتار ڈالتی ہے اور

ایک چبیہ بھر لنگوٹ باندھ کر پہلوانوں کی طرح ڈنٹر پیلتی ہے اور بیٹھکیں لگاتی ہے ——
اور میں نے جو اسے ٹوکا تو بولی "ننگے ہیں تو ہم ننگے ہیں نا، تمہیں حیا آرہی ہے تو چھت پر برقع
اوڑھ کر آیا کرو" —— لفنگی کہیں کی —— واہیات!"

کلثوم کی اماں نے یہ سنا تو سر پر ہاتھ رکھ کر یوں چلائی جیسے اس کی اولاد میں سے
کسی نے اچانک بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا ہے۔ ارشاد احمد تو ابھی کلثوم ہی کے معاملے میں سوچ
بچار کی منزلیں طے کر رہا تھا، زہرہ کی پہلوانی کا قصہ سنا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کر آیا اور
تڑ سے ایک چانٹا زہرہ کے رسید کر دیا۔ اماں کو طیش آگیا، تن کر بیٹے کے سامنے آگئیں
اور ڈپٹ کر بولیں "شرم نہیں آتی؟"

اور ابھی ارشاد احمد کچھ کہنے ہی نہیں پایا تھا کہ نجمہ ارشاد احمد دور سے بولی "نہیں
نہیں، یہ تو بے شرم ہے، بے حیا ہے، اوباش ہے، غنڈہ ہے،" قریب آکر چلائی
"تم لوگوں کو کھلائے ٹھنسائے بھی یہی بدمعاش، اوڑھائے پہنائے بھی یہی آوارہ، اور اوپر
سے بے شرمی کی ڈانٹ بھی کھاتا رہے"۔ اب وہ اماں کے بالکل سامنے آگئی اور یوں
ہاتھ اٹھا اٹھا کر باتیں کرنے لگی جیسے بس نہیں چل رہا ورنہ پوروں کو بڑھیا کی آنکھوں
میں ٹھونس دیتی۔ "شرم اسے کیوں آئے؟ شرم آئے تجھے اور تیری ان صاحبزادیوں کو
جنھوں نے کمر کا کپڑا کھول کر سر پر باندھ لیا ہے۔ شرم آئے تم سب نکموں، نکھٹوؤں کو، اس کے
دشمن شرمائیں!" پھر وہ ارشاد احمد کے قدموں میں بیٹھ کر زار زار رونے لگی "پر مجھ جنم جنم کی
بدنصیب کو کس حاذق نے بتایا تھا کہ ماں بیٹے کے پھٹے میں ٹانگ اڑاؤ۔ بھئی مجھے بخش دو
تم سب لوگ۔ اب میں تم لوگوں کے بیچ میں بولوں تو کمینی ہو کر مروں، کتے میرے مردے
کا منہ چاٹیں۔"

ارشاد احمد نے ایک جھٹکے سے نجمہ کو اٹھایا اور اسے ایک کمرے میں پہنچا کر واپس
آیا۔ کلثوم سے بڑی دضیہ جو ایک عرصے سے نیم پاگل تھی اور جسے چاند کی ابتدائی اور

آخری تاریخوں میں مرگی کے دورے پڑتے تھے، آئی اور اماں کے سامنے یوں باہیں پھیلا کر کھڑی ہوگئی جیسے ڈھال بن کر بیٹے کے حملے سے بچا رہی ہے۔ رضیہ سے بڑی فرخ اپنی بیوگی کا سہارا دیتی بھاگی آئی۔ اس کے پیچھے اس کے دونوں بیٹے بھی بلبلاتے ہوئے دوڑے اور موقع پا کر ماں کی ٹانگوں سے زنجیر بن کر لپٹ گئے۔ زہرہ اور کلثوم روتے روتے اس زور کی ہچکیاں لے رہی تھیں جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ بار بار ان کی ٹھوڑی کے نیچے ٹکے مارے جا رہا ہے۔

ارشاد احمد نے رضیہ کو ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا اور اماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "نہیں اماں مجھے تو ذرا بھی شرم نہیں آتی جس گھر میں لڑکیاں آنکھیں ماریں اور ننگی ہو کر ڈنٹر پیلیں وہاں ایک لڑکے کو بھلا شرم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سمجھیں آپ؟"

ماں نے آنسو پونچھ کر بیٹے کو نرمی سے سمجھانا چاہا مگر بیٹا تو جیسے ماں کے سوال کا جواب ہی دینے آیا تھا، فوراً واپس چلا گیا۔ شام کے بعد اماں نے اسے الگ لے جا کر سمجھایا کہ "بیٹا یہ تیری بیوی ہے نا، یہ ہمارے سارے گھر میں پھوٹ ڈالنا چاہتی ہے اور دیکھو، ذات کی کمینی معلوم ہوتی ہے، ورنہ یوں ماں بیٹے اور بھائی بہنوں ——"

مگر ارشاد احمد کے تیور پہلے ہی سے بدل چکے تھے، اس نے ماں سے صرف اتنا کہا "ایسی کوئی خاص فکر کی بات نہیں امی۔ مجھ بے شرم نے اس کمینی کے لیے ایک الگ مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔"

ماں روتی چلاتی رہی، پھر واپس آ کر بیٹیوں کو بتایا تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ رضیہ دھڑام سے گری اور پاؤں پٹخ پٹخ کر منہ سے جھاگ نکالنے لگی۔ ساری رات اسی افراتفری میں گزری اور صبح کو پتہ چلا کہ ارشاد احمد اور بیگم نجمہ ارشاد احمد رات ہی رات کسی دوست کے ہاں اٹھ گئے ہیں۔

انبالے سے لاہور آنے پر کلثوم کے خوابوں کے آبگینے میں صرف بال آیا تھا، بھائی جان کے جاتے ہی یہ آبگینہ ایک چھناکے سے ٹوٹا اور کرچیاں بن کر اس کے ذہن کو کاٹنے لگا۔ یہ کرچیاں زندگی کی وہ سفاک حقیقتیں تھیں جنھوں نے کلثوم کو ناولوں کے طلسمات بھرے دھندلکوں سے نکال کر ایک گرل ہائی سکول میں لا ڈالا۔ زندگی گھر سے سکول جاتی ہوئی ایک گلی میں سمٹ کر اونگھنے لگی اور ناولوں کے خاکے اور غزلوں کے منتخب اشعار تختۂ سیاہ پر دو جمع دو چار کے ہندسوں کا روپ اختیار کر گئے۔ چٹخے اور ٹوٹے ہوئے خوابوں کا یہ ملبہ اس کے چہرے پر بھی نمودار ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ کچھ ایسی حسین نہیں تھی لیکن جوانی سب سے بڑا حسن ہے اور پھر کلثوم کی جوانی تو بڑی باشعور تھی۔ کلثوم نے تو عشقیہ ناول اور غزلیں پڑھی تھیں اور گھر سے باہر قدم نکالے بغیر وہ مصفا پانی کے جھرنوں کے کنارے چاندنی کے نقرئی غبار میں اپنی طرف لپکتے ہوئے محبوب کی پرچھائیاں دیکھ چکی تھی اور ہونٹوں میں رینگتے ہوئے کسی گرم گرم احساس نے اسے کتنی بار آنکھیں بند کر کے کہیں ڈوبتا ہوا چھوڑ دیا تھا لیکن اب اچانک اس کی آنکھوں کے نیچے سایے کے سے پھیکے پھیکے رنگ کی پھیلی پھیلی قوسیں ابھر آئی تھیں اور بھوؤں کے بے ترتیب بالوں اور سیاہ حلقوں میں گھری اس کی آنکھیں معصوم بچوں کے جنازے بن کر رہ گئی تھیں، ناک بالکل ہلدی کی گرہ معلوم ہوتی تھی۔ اور گالوں نے دھنس کر اور ٹھوڑی کی ہڈی نے ابھر کر اس کے چہرے کو مثلث کی سی صورت دے دی تھی۔ ہاتھ چہرے سے زیادہ بوڑھے نظر آتے تھے، البتہ بالوں کا وہی ٹھاٹ تھا، وہی لہریں اور وہی ریشم کی سی نرمی۔ ایک بار حسن کے اس بھٹکے ہوئے عنصر کو جوڑے کی صورت سمیٹ لینا چاہا۔ آئینہ دیکھا تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے اس کے سر کے پیچھے ایک اور سر اگ آیا ہے، مسکرا کر اس نے بالوں کو پھر پیٹھ پر بکھیر دیا۔ اس مسکراہٹ میں بجھی ہوئی چنگاریوں کی سی چمک بھی تھی اور زردی بھی۔ "ہائے رے یہ اجاڑ زندگی!" اس نے گالوں کے گڑھے میں انگلی پھیرتے ہوئے کہا تھا اور پھر کھاٹ پر گر کر دوسرے دن کے سبق کی تیاری کرنے لگی تھی۔

ارشاد احمد دوست کے ہاں سے گورنمنٹ کوارٹروں میں منتقل ہو گیا اور اس کے بعد پتہ چلا کہ وہ تبدیل ہو کر جھنگ پہنچ چکا ہے اس نے گھر میں خط تک نہ لکھا۔ بھائی جان کو یاد کر کے بہنیں روتیں، اماں کچھ دیر تک ان کا ساتھ دیتیں اور پھر اچانک سنبھل بیٹھتیں۔ آنسو پونچھ کر کلثوم کو سینے سے لگا لیتیں اور کہتیں: "جب تک میری یہ شیر بیٹی موجود ہے مجھے دنیا میں کسی کی پروا نہیں، اری میری کلثوم بٹیا، تو تو میری مرد بیٹی ہے۔ تو نے تو ارشاد کی ساری کمیاں پوری کر دیں!"

اور کلثوم یوں محسوس کرتی جیسے اس کے داڑھی مونچھیں اُگ آئی ہیں۔ اس کی آواز میں مردانہ پن آگیا ہے اور اس کی پیٹھ پر پڑے ہوئے بالوں کا ڈھیر جھڑ گیا ہے۔ وہ ہر مہینے کی یکم کو اسّی روپے لا کر اماں کے سامنے رکھ دیتی اور تنہائی میں جا کر خوب روتی۔ آنے والا مہینہ اپنے خشک اکڑے ہوئے چیونٹوں کے سے ہندسوں کا ایک ٹوکرا اس کے سر پر دے مارتا۔ یہ چیونٹے اس کے لہو میں سرسرانے لگتے اور وہ اپنے گرد آلود ذہن کی گہرائی میں سے دھول سے اٹا ہوا ایک شعر نکال کر گنگناتی ؎

اب بھی اک عمر میں جینے کا نہ انداز آیا
زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

ردیف کا صیغۂ تذکیر کلثوم کو اپنی اماں کا قول یاد دلا دیتا "تو تو میری مرد بیٹی ہے بٹیا!"—— اور وہ آنسو پونچھ کر صحن میں آ جاتی۔

وہ دیکھتی کہ اماں اور فرخ باجی بازار جانے کی تیاریاں کر رہی ہیں تاکہ مہینے بھر کے خرچ کے لیے لکڑی، اپلے، ذرا سا گھی، تیل، دالیں اور نمک مرچ بھروا لیں۔ رضیہ آپا فرخ باجی کے بیٹوں نذر اور نذیر کے سر میں سے جوئیں نکال رہی ہیں اور انھیں اس پہلوان کی کہانی سنا رہی ہیں جسے جوؤں نے چاٹ چاٹ کر بونا بنا دیا تھا۔ زہرہ اکنی کا آسمانی رنگ خریدنے کی کوشش کر رہی تھی اور بکرے کا آدھا سیر گوشت منگوایا جا چکا تھا۔ زندگی کی یہ کتنی معصوم بے چینیاں ہیں، کلثوم نے سوچا، بالکل ایک ننھے بچے کی اطمینان بھری بے چینیاں جو ماں

کے دودھ سے سیر ہو کر ٹانگوں کی چرخی چلاتا ہے، ہاتھ ہلاتا ہے آنکھیں گھماتا ہے اور مسکرا دیتا ہے۔ اس ننھی سی دنیا کی یہ حیلت پھرت کلثوم کے دل کو عزم و جرأت کی تازگی بخشتی مگر جب پندرہ تاریخ کے بعد اچانک ہر چیز کی کمی کے بھوت ذہنوں پر سوار ہو جاتے اور بیٹیاں ماں سے اور بہنیں بہنوں سے جھگڑتیں اور آنسو بہاتیں اور خالی پیٹ سو جاتیں تو کلثوم ایک بار پھر "زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا ---" گنگنانے لگتی اور رضیہ کو نیند میں ہنستا دیکھ کر جی ہی جی میں کہتی "تم مجھ سے ہزار درجے، کروڑ درجے اچھی ہو آپا، تمہارا ذہن کند ہو چکا ہے، تمہاری یادیں گڈمڈ ہیں، تمہارے لیے ہر حقیقت خواب ہے۔ تم کتنی خوش نصیب ہو رضیہ آپا" --- پھر جب وہ اپنی چھوٹی بہن زہرہ کو چراغ کی روشنی میں سکول کی کتاب رٹتے دیکھتی تو اس کا گلا بھر آتا۔ کلثوم کو اچانک زہرہ بہت بوڑھی معلوم ہونے لگتی اور اس کا جھریوں بھرا ہاتھ تختۂ سیاہ پر بڑے ڈراؤنے ہندسے بنانے لگتا اور پھر ایکا ایکی زہرہ کے داڑھی مونچھیں نکل آتیں --- سر جھٹک کر کلثوم اٹھ کھڑی ہوتی اور زہرہ کے پاس جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی "سو جاؤ میری زہرہ رانی، اب سو جاؤ اتنا زیادہ پڑھو گی تو آنکھوں میں دھول اڑنے لگے گی، اور یہ تم نے بالوں میں کب سے تیل نہیں ڈالا بے وقوف" زہرہ مارے پیار کے اس سے لپٹ جاتی۔ نذر اور نذیر نیند میں بڑبڑاتے اور فرخ آپا آیۃ الکرسی پڑھ کر انہیں دم کرتیں اور پھر کہتیں "اب سو جاؤ زہرہ، اور کلثوم تم کیوں کھڑی ہو یہاں، سوتی کیوں نہیں؟ ارے پگلیو تمہاری صحتیں بگڑ گئیں تو ہم سب کیا کریں گے، کبھی یہ بھی سوچا؟"

مگر یہ سوچنے کی فرصت ہی کسے تھی۔ زہرہ اپنی پڑھائی میں مگن تھی اور کلثوم کے ذہن میں آندھیاں بڑے زناٹے سے چل رہی تھیں --- اور وہ گھروں اور ہندسوں کے تصادم کے درمیان پسی جا رہی تھی جب اچانک جیسے آسمان کا ایک دریچہ کھل گیا اور اس پر ست رنگا مینہ برس پڑا۔ اسے اسکول کے ایک کلرک جمال الدین کی چٹھی ملی

جس کا مضمون صرف ایک بار پڑھنے ہی سے کلثوم کو ازبر ہو گیا تھا۔ لکھا تھا ”میری بڑی ہی پیاری کلثوم! جب سے تم اس اسکول میں آئی ہو، میری زندگی کے مشرق پر طلوع سحر کا سا اجالا نمودار ہو چکا ہے۔ تمہاری معصوم صورت میری آنکھوں، میرے دل، میرے سارے پیکر میں رس بس چکی ہے اور اب عالم یہ ہے کہ میں سو تک نہیں سکتا، سوچ تک نہیں سکتا رو تک نہیں سکتا، سکتے کا سا عالم ہے۔ پو پھٹنے کے اس سناٹے میں کوئی پنچھی بھی تو نہیں اڑتا کہ میں تمہارے خوابوں سے چونکوں۔ اب تک طلوعِ آفتاب کا انتظار کیا۔ آنکھیں سفید ہونے لگیں تو ایک بھکاری بن کر تمہارا در کھٹکھٹانے آیا ہوں، تم نے توجہ کی تو سمجھوں گا کہ میری جاگتی راتوں کی ریاضت قبول ہوئی، اور اگر تم نے میرا یہ عریضہ ہیڈ مسٹرس صاحبہ کو دکھا دیا تو پھر ہرچہ باداباد۔ کسی شاعر کا یہ شعر گنگنا لوں گا ؎

شرکتِ غیر سے محفوظ ہے یہ ربطِ لطیف

تیری نفرت میں ہے جذبات، محبت میں نہیں“

خط پڑھنے کے بعد کلثوم کو آناً فاناً عشق ہو گیا، بلکہ اس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ایک عمر سے جمال پر فدا ہے، جیسے وہ اسے بڑی اچھی طرح جانتی اور پہچانتی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ ذرا سا خاکستری تھا تو کیا ہوا، اور اس کی آنکھیں کبھی کبھی ہڈی کے بٹن بن جاتی تھیں تو ہرج ہی کیا تھا، وہ نوجوان تو ہے، اور نوجوانی سے زیادہ خلوص کی ضمانت اور کیا ہو گی ”میرا جمال!“ اس نے زیرِ لب کہا ”میرا“ اپنائیت، اور ملکیت کے اس احساس نے اس کے چہرے کی مثلث میں گولائی پیدا کر دی، اسے اپنے اندر کوئی چیز پھیلتی سی محسوس ہوئی اور جسم کا سارا خون اس کے چہرے میں جمع ہو گیا اور اسے کچھ ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سامنے نئے نئے عشقیہ ناولوں کا ایک ڈھیر سا لگا دیا ہے اور وہ دریچوں، چلمنوں اور سیڑھیوں کے اندھیروں میں سے گزر کر کائنات کی وادیوں میں نکل گئی ہے!

”نہیں نہیں جمال۔ مجھے چھوؤ مت“ اس نے چند روز بعد کہا تھا۔ اس وقت وہ اسکول

کے باغیچے کے اس گوشے میں کھڑی تھی جہاں چنبیلی کے جھاڑ سے اُگ رہے تھے اور سفیدے کا ایک تنہا درخت جیسے ان پر پہرہ دار بن کر کھڑا تھا۔ جمال کے چہرے کا خاکستری رنگ چمک رہا تھا اور آنکھوں کے بٹن دہک اُٹھے تھے۔ اُس نے کلثوم کو اپنی باہوں میں لینا چاہا تھا مگر وہ پیچھے ہٹ کر چنبیلی کے جھاڑ میں ڈوب سی گئی تھی "جمال، یہ بُری بات ہے"
——پھر جب گھر واپس آکر اس نے گھنٹوں کے سوچ بچار کے بعد فرخ باجی سے سارا قصہ کہہ سنایا تو باجی کے ہونٹ کچھ یوں کانپے جیسے جمال نے انھی کو باہوں میں بھینچ لینے کا قصد کیا تھا، شرما گئیں، پھر ذرا سا مسکرانے لگیں اور کلثوم کو ٹھوڑی سے ذرا سا ہلا کر باہر بھاگ گئیں۔ شاید جاتے ہی انھوں نے اماں سے ذکر کر دیا کیونکہ اماں اُٹھیں، کمرے میں آکر کلثوم کو پکڑا، بلکہ جکڑ لیا اور اسے کھینچتی ہوئی چولھے کے پاس جا بیٹھیں "ہوں!" انھوں نے اپنی آٹے بھری انگلی کو ناک پر رکھتے ہوئے کہا "شادی کا بھوت سوار ہوا ہے کبھی اپنی صورت بھی دیکھی ہے آئینے میں، ہوں؟ دیکھی ہے؟ یہ پھٹی پھٹی آنکھیں اور یہ مردہ مردہ ہونٹ اور یہ چھاج سے کان —— جاؤ آئینہ دیکھ کر آؤ اور پھر مجھ سے بات کرو۔ اری وہ لفنگا تو تجھے دو چار دن استعمال کر کے پھٹے جوتے کی طرح کوڑے پر ڈال دے گا۔ مجھ سے پوچھو ان مردوں کے چلن۔ تم نے ابھی دنیا کا دیکھا ہی کیا ہے اور پھر تم کیا جانو۔ لڑکیوں کو پڑھا لیتی ہو تو کیا ہوا، میں پڑھی لکھی ہوتی تو میں بھی پڑھا لیتی۔ مردنے تجھے بڑھایا تو ساری فارسیاں بھول جاؤگی اور تم فرخ، تم کیسی بتیسی نکالے بھاگی آئیں جیسے کلثوم کے لیے آسمان پر سے فرشتہ اترا ہے۔ سن لو کان کھول کر جب تک میں اچھی طرح ٹھوک بجا کر دیکھ نہیں لوں گی امیدوار صاحب کو، تو نہ کلثوم کی شادی ہوگی نہ زہرہ کی۔ اور پھر عاشقوں کی ٹائیں ٹائیں فش ایسی شادیوں پر تو بولا جاتا ہے اور رضیہ تم کیا سننے آئی ہو؟ جاؤ، سب جاؤ، اور دیکھو پھر ایسی بات اس گھر میں نہ ہونے پائے۔ کوئی مرد نہیں ہے گھر میں تو اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ شرم کو اٹھا کر طاق پر رکھ دو، جاؤ!"

کلثوم واپس آکر کھاٹ پر گر پڑی اور دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر خوب روئی۔ زہرہ تو خیر اوپر چھت پر بیٹھی اپنی کتابیں پڑھ رہی تھی اور اس شور و شغب کی نوعیت کو سمجھے بغیر روز کا معمول سمجھ کر ٹال گئی۔ فرخ کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اماں کی ڈانٹ سے بے نیاز ہو کر اسے تسلی دینے آئے، البتہ رضیہ نے اسے یوں ڈھیر دیکھا تو بھاگی آئی اور اس سے لپٹ گئی اور اپنی بڑی بڑی گھرائی گھرائی آسیبی آنکھوں کو اس کی آنکھوں میں گاڑ کر بولی "دیکھو کلثوم اگر تم اسی طرح روتی رہیں تو میں اتنا بڑا انگارہ اٹھا کر نگل جاؤں گی" کلثوم نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ رضیہ آپا سے دور نہیں تھا کہ وہ غصے میں آکر سچ مچ انگارہ چبا لے وہ اس سے لپٹ گئی اور پھر دکھا دے کے لیے مسکرا بھی دی۔ اس مسکراہٹ میں چمک بھی تھی مگر یہ جلتے ہوئے گھروندے کی سی چمک تھی۔ رضیہ کی آسیبی آنکھیں بھی اس چمک سے خیرہ ہو گئیں۔ وہ چند لمحے اسے گھورتی رہی اور پھر ٹوٹ کر رو دی۔ اسے روتا دیکھ کر فرخ کو سہارا مل گیا بھاگی آئی۔ اب ماں بھی ضبط نہ کر سکی۔ نذرا اور نذیر بھی اندر آ گئے اور نذر چھت پر جا کر زہرہ کو بھی بلا لایا اور جب سب لوگ رضیہ کو محض اس خیال سے دلاسا دینے لگے کہ کہیں روتے روتے اس پر مرگی کا دورہ نہ پڑ جائے تو رضیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ آنسو پونچھے بغیر ہنستی رہی اور پھر بولی "تم امی عجیب امی ہو، اپنی بیٹیوں تک کو نہیں سمجھتیں۔ تم کہو گی یہ آنسو میرے آنسو ہیں۔ مانا آنکھیں میری ہی بھیگی ہیں پر یہ آنسو میرے آنسو نہیں۔ یہ تو میری پگلو کلثوم کے آنسو ہیں۔ میں نے اس سے مانگے اس نے دے دیئے بس، میں تھوڑی رو رہی ہوں!" وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی اور پھر دھڑام سے ماتھے کے بل زمین پر گری اور پاؤں پٹختے ہوئے منہ سے جھاگ نکالنے لگی۔ نذرا اور نذیر ڈر کر باہر بھاگ گئے۔ زہرہ کونے میں منہ دے کر رونے لگی۔ کلثوم اور فرخ نے رضیہ کے اینٹھتے ہوئے ہاتھ پاؤں جکڑ لیے اور اماں اونچے اونچے آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کرنے لگیں جب بہت دیر کے بعد رضیہ کو ہوش آیا تو وہ بالکل نڈھال ہو چکی تھی۔ فرخ اور کلثوم نے اسے سہارا دے کر

اٹھایا تو اس نے اپنا دبلا ہاتھ کلثوم کی آنکھوں پر ملا اور لالٹین کی روشنی میں اپنی انگلیوں کو غور سے دیکھنے لگی۔ پھر بڑے غصے سے بولی "دیکھو کلثوم، اب تمہاری جگہ میں روؤں گی، تم نہیں رؤو گی، سمجھیں؟ ورنہ تمہارے سامنے آگ کا انگارہ نگل لوں گی"۔۔۔۔ کلثوم لرز گئی، بولی میں اب بہت کم روؤں گی آپا"۔۔۔۔ رضیہ خوش ہو کر بولی "۔۔۔ تم نے مجھے اپنے آنسو دیئے، میں اپنی ہنسی تمہارے حوالے کرتی ہوں، ٹھیک؟"۔۔۔۔ "ٹھیک"، کلثوم نے مارے ڈر کے فوراً سودا کر لیا اور جب لوگ اس کے کمرے میں سے چلے گئے تو چٹخنی لگا کر بے تحاشا رونے لگی۔

دیر تک رونے کے بعد وہ اچانک بھڑک کر اٹھی اور لپک کر بکس پر سے آئینہ اٹھا لیا۔ آئینے کو دونوں ہاتھوں میں جکڑ کر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے آپ کو گھورنے لگی پھر اس کے ماتھے پر شکنیں پیدا ہوئیں، چہرے پر کراہیت کے سائے چھا گئے اور اس نے ہونٹوں کے کچھ ایسے زاویے بنائے جیسے آئینے پر تھوک دینا چاہتی ہے۔ آئینے کو ایک طرف پھینک کر وہ کھاٹ کی طرف مڑی مگر پھر ایک دم پلٹی اور آئینے کو اٹھا کر اس کا جائزہ لیا کہ کہیں ٹوٹ تو نہیں گیا۔ آئینے کو آہستہ سے بکس پر رکھ کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گئی، ہاتھ بڑھا کر ایک کاغذ اٹھایا اور پنسل سے لکھنے لگی۔ یہ جمال کے نام خط تھا۔ اس نے لکھا "آپ نے مجھے بہت بلندی سے پکارا ہے اور میں ایورسٹ کی چوٹی پر نہیں چڑھ سکتی۔ مجھے دوبارہ پکارنا بیکار ہے ورنہ آپ کی آواز کی گونج ہیڈ مسٹریس صاحبہ بھی سن لیں گی"۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے آخری فقرہ کاٹ دیا، ساری عبارت کاٹ دی۔ دو ٹوک انداز میں لکھ دیا کہ میں مجبور ہوں۔ چٹ کو تکیے تلے رکھ کر چٹخنی کھولی اور بڑی کراری آواز میں پکاری "کھانا تیار ہے امی، آؤں؟"

اماں اور فرخ چولھے کے پاس بیٹھی شاید رو رہی تھیں، بھڑک کر کھڑی ہو گئیں جیسے چاند کا انتظار ہو اور ایک دم سورج نکل آئے۔ وقفے کے بعد اماں کی ذرا سی

بدلی ہوئی آواز آئی "تم کیوں آؤ بیٹیا، میں خود لا رہی ہوں۔ میں آج اپنے ہاتھ سے کوابے بنا بنا کر کھلاؤں گی تمہیں، وہیں بیٹھو۔"

فرخ بولی "تم کہو تو نذر بازار سے ذرا سی ملائی لے آئے؟"

"کیوں نہ لائے" اماں بولیں "پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، جاؤ نذر میاں، لپک کر دونی کی ملائی لے آؤ اور دیکھو کہنا ذرا سی پستے کی ہوائیاں بھی چھوڑ دے۔ زیادہ پیسے مانگے تو کہنا ہم تو پرانے گاہک ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے بھی تو دونی کی ملائی خریدی تھی تمہی سے — جاؤ۔"

کلثوم خاموش کھڑی مسکراتی رہی۔ پھر ٹہلتی ہوئی دوسرے بڑے کمرے میں چلی گئی چراغ کی روشنی میں سوتی ہوئی رضیہ کا چہرہ لاش کا چہرہ معلوم ہو رہا تھا اور اس کے ہونٹ کچھ یوں نیم وا تھے جیسے اس کی روح نے بس ابھی ابھی پرواز کی ہے۔ "آپا" وہ پکاری اور پھر اپنے ہونٹ نوچ لیے جیسے رضیہ آپا کی بخشی ہوئی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں سے نچوڑ لینا چاہتی ہے۔ رضیہ نے ایک لمبی سانس لے کر کروٹ بدلی تو کلثوم ایک بار پھر مسکرا دی۔ آپا تو زندہ ہیں، اس نے سوچا، مرگی کے بعد ہمیشہ اسی طرح گھوڑے بیچ کر سوتی ہیں۔

کلثوم وہاں سے دبے پاؤں زہرہ کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ کھلی کتاب کو سینے پر رکھے سو رہی تھی۔ "سو رہی ہو زہرہ؟"

"نہیں تو،" زہرہ اٹھ بیٹھی "سو تو نہیں رہی تھی، رو رہی تھی۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کلثوم کی ٹانگوں سے لپٹ کر بھرائی ہوئی آواز اور ٹوٹے ہوئے فقروں میں بولنے لگی "آپ سمجھتی ہیں میں بچی ہوں، پر نہیں آپی، میں نادان نہیں ہوں۔ میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ آپ کی شادی ہونے والی ہے۔ آپ کسی اور گھر میں چلی جائیں گی اور پھر مہینوں بعد کبھی کبھی ہمارے ہاں آئیں گی اور یوں ہی بس ذرا سا مزاج پوچھ کر چلی جائیں گی، اور آپ کو یہ تک معلوم نہ ہوگا کہ کمبخت زہرہ اسکول کی فیسیں نہ دے سکی

اس لیے دسویں جماعت سے آگے نہ بڑھی۔ ہم بھلا آپ کے کون ہیں آپی، آپ کو ہم سے کیا۔" پھر وہ الگ ہٹ کر بڑے غصے سے بولی "جائیے نہیں بولتے آپ سے، عمر بھر نہیں بولیں گے جائیے، کر لیجیے شادی، ایک چھوڑ دس شادیاں کر لیجیے، جائیے۔" زہرہ نے کتاب اٹھا کر دیوار پر دے ماری اور روتی ہوئی ٹوٹی ہوئی کرسی پر ڈھیر ہو گئی اور حواس باختہ کلثوم اس کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ زہرہ یکایک سنجیدہ ہو کر اٹھی، زمین پر سے کتاب اٹھائی، اسے پلّو سے جھاڑا اور پھر اسے کھاٹ پر رکھ کر گنہگاروں کی طرح ڈرتے ڈرتے کلثوم کو دیکھا۔

کلثوم اسے تسلی دینے کے لیے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اماں اور فرخ اندر آ گئیں۔

"یہ کیا بکواس ہو رہی ہے زہرہ؟" اماں نے پوچھا۔

"یہ تو سدا کی جھکی ہے۔" فرخ نے ڈانٹا "آخر تم کلثوم سے چاہتی کیا ہو؟"

"ملائی امو" نذر دروازے پر سے بولا۔

تینوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ اماں تک مسکرا دیں اور پھر کلثوم زہرہ کو سینے سے لگا کر اس کے سر پر مسلسل پیار کرنے لگی۔ اماں اور فرخ باہر چلی گئیں تو اسے ہولے سے بتایا کہ "بات شادی ہونے کی نہیں تھی بلو، شادی نہ ہونے کا ذکر چل رہا تھا۔ تم نے بات نہیں سُنی، بات کی گونج سنی۔ میں تو تمہیں ایم اے تک پڑھاؤں گی۔ یہ بھائیوں ہی کے کلیجے ہوتے ہیں کہ بہنوں کو بیچ منجدھار چھوڑ کر خود کنارے جا لگیں۔ بہنیں تو اکٹھی ترتی اور اکٹھی ڈوبتی ہیں بے وقوف۔" اس نے ایک بار پھر زہرہ کے سر کو چوما اور پھر ہونٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ "ہائی ری تمہاری یہ بال پنیں کم بختیں۔ ایک تو میری ہونٹ میں گھس گئی۔ اُن کو بال پنیں تک لگانے کا ڈھب نہیں آتا، اِدھر آ۔" اس نے مسکرا کر زہرہ کے ہلکے سے چپت ماری۔ اُٹھی ہوئی بال پن کو درست کیا اور باہر آ کر اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ سیر ہو کر خوب مزے سے سوئی اور صبح کو حسب معمول اسکول چلی گئی۔

چنبیلی کی جھاڑیوں میں جمال اس کا منتظر تھا۔ وہ جب اس کی طرف بڑھی تو جمال

کے ہونٹوں کے گوشوں میں چھپی ہوئی مسکراہٹ اس کے سارے چہرے پر پھیل جانے کے لیے کانپنے لگی۔ پھر ایک دم مسکراہٹ کی یہ کرن اس کی آنکھوں کو چمکاتی اور کانوں کو رنگتی اس کے روئیں روئیں میں دوڑ گئی مگر آج کلثوم کے ہونٹ اس مسکراہٹ سے محروم تھے جیسے جمال نے چند روز پہلے طلوع سحر کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں نے لوہے کے شکنجے کی طرح اس کے شباب کے سارے تقاضوں کو بڑی قوت سے جکڑ رکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں پتھر تھے اور آنکھوں کے نیچے اس کے گالوں کی ہڈیاں سینگوں کی طرح ابھر آئی تھیں۔ جمال کے پاس آکر اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کے چہرے پر ایک گھروندا جلنے لگا۔ پھر وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما کر آگے نکل گئی۔ سفیدے کے تنے کی آڑ سے اس نے چنبیلی کی جھاڑیوں کی طرف دیکھا مگر جمال تو جیسے اس کے قدموں پر قدم رکھتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلا آیا تھا، بولا "میں زہر کھا لوں گا"—— مگر کلثوم تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

اور پھر چند روز بعد جب وہ لڑکیوں کو پڑھا رہی تھی تو اچانک کھڑکیاں اور روشندان بج اٹھے، بجلی چمکی اور بادل اس زور سے گرجا کہ کھڑکیوں کے شیشے گرج کے بعد بھی جھنجھناتے رہ گئے۔ جھونکوں کا ایک غول روشن دانوں کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے گزر کر کمرے میں گھومنے کے بعد کلثوم کے بالوں کو پیٹھ پر سے اٹھا کر اس کے منہ پر بکھیر کر چلتا بنا لڑکیاں ہنس دیں اور کلثوم قہقہے مارتی ہوئی کرسی پر گر پڑی، پھر کھریا مٹی کا ٹکڑا میز پر پھینک کر وہ باہر بھاگی۔ اسکول کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کی جا رہی تھیں۔ موٹی موٹی بوندیں بھی گرنے لگی تھیں۔ چمک اور گرج کا تواتر ایسا تیز ہو گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا آج روشنی کی بارش ہو گی اور کرنوں کی ندیاں بہیں گی۔ ہونٹوں کے گوشوں میں طلوع سحر لیے وہ کھیل کے میدان میں آگئی۔ بارش نے لباس کو اس کے جسم پر منڈھ دیا تھا، مگر ہوا اس لباس کو جگہ جگہ سے جیسے چٹکی سے پکڑ پکڑ کر کھینچتی تھی اور تالیاں سی بجا کر

نکل جاتی تھی اور پھر جب وہ چنبیلی کی جھاڑیوں میں پہنچی تو ان جھاڑیوں کے نیچے چنبیلی کے جھڑے ہوئے پھولوں کا ڈھیر لگا تھا اور ہر بوند کے مس کے ساتھ یہ پھول تڑپ تڑپ اُٹھتے تھے۔ اسے ایسا لگا جیسے یہ سارے پھول اس کے ہاتھوں نے نوچے ہیں اور وہ کچھ یوں پنجوں کے بل ہو کر چلنے لگی جیسے اگر کوئی پھول اس کے پاؤں تلے آگیا تو چیخ اُٹھے گا۔ اب بارش بہت زور سے ہونے لگی تھی اور بادل جیسے سفیدے کے تنہا درخت کی آخری پھننگوں تک جھک آئے تھے۔ وہ اندھا دھند بارش سے بچنے کے لیے سفیدے کی طرف بھاگی مگر اچانک جیسے چنبیلی کی جھاڑیاں اس کے قدموں سے لپٹ گئیں۔ سفیدے کے تنے کے پاس جمال کھڑا تھا، اس کی مٹھیوں میں چنبیلی کے پھول تھے اور وہ کہیں دور دیکھ رہا تھا۔

اور پھر ایک دم جیسے موسم بدل گیا، ہوا گرم ہو گئی، بوندوں میں سوئیاں بھر گئیں بادل رونے لگے اور بجلی دانت کچکچانے لگی۔ کلثوم کے پھیپھڑے ہوا سے خالی ہو گئے اور پسلیاں ایک دوسرے میں پھنستی معلوم ہوئیں اور وہ چنبیلی کی جھاڑیوں میں یوں دبک گئی جیسے اس نے جمال کو دیکھ لینے کی چوری کر لی ہے، پھر وہاں سے اٹھ کر بھاگی اور باہر سڑک پر آگئی۔ مکانوں کے چھجوں کی پناہ میں کھڑے ہوئے راہ گیر اسے بھیگے اور چمٹے ہوئے لباس میں دیکھ کر علی الاعلان محظوظ ہونے لگے، پکوڑے تلتے ہوئے دکاندار نے تیل سے سنی ہوئی مونچھوں کو کندھوں سے پونچھ کر ہانک لگائی "ارے میں قربان جاؤں، رُت ایسی شفاف ہے کہ نظریں آر پار ہوئی جا رہی ہیں"۔۔۔۔۔ عام طور سے وہ اس قسم کی آوازوں کا بڑی سختی سے نوٹس لیتی تھی اور اگرچہ اس نے زبان کبھی نہ کھولی مگر آوازہ کسنے والے کو اتنے غصے سے گھورتی تھی کہ وہ جھینپ کر رہ جاتا تھا مگر آج تو اسے پکڑے جانے کا خدشہ تھا۔ جسم سے اچٹ اچٹ کر ہوا میں تالیاں بجاتے ہوئے لباس کو سنبھالے بغیر وہ ناچتے اور تڑپتے ہوئے موٹے موٹے بلبلوں سے سجی ہوئی سڑک پر لپکی چلی گئی اور جب گھر میں داخل ہوئی تو اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ نیم عریاں ہو رہی ہے۔ جلدی سے اس نے

اپنی یہ عریانی چھپانے کی کوشش کی اور پھر پنجوں کے بل چلتی اپنے کمرے تک آگئی۔ دروازہ کھولا تو فرخ کی آواز آئی "کون؟"

"میں باجی" وہ بولی اور غڑاپ سے اندر چلی گئی اور بھیگے ہوئے لباس پر بستر کی چادر لپیٹ کر بیٹھ گئی۔

فرخ اندر آئی مگر اسے سہمی دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئی۔

"باجی" کلثوم نے آہستہ سے کہا "دروازہ بھیڑ دیجیے۔"

فرخ نے چپ چاپ دروازہ بھیڑ دیا۔

"باجی" وہ بولی۔

فرخ اس کے قریب آگئی۔

"باجی" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولی "نہیں باجی، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔"

فرخ ذہنی طور پر سر کے بل کھڑی ہو گئی، پلٹ کر اس نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا آواز سن کر اماں، رضیہ، نذرا اور نذیر سب اندر آگئے اور کلثوم نے فوراً رونے کو ہنسی میں بدل لیا۔ چیخ چیخ کر قہقہے لگاتے ہوئے بولی "میری چادر نہ اُتارنا آپا، میں ننگی ہوں۔"

"ننگی" سب نے حیرت سے کہا اور نذرا اور نذیر باہر بھاگ گئے۔

"ننگی کیسے؟" اماں نے حیرت اور غصے سے پوچھا اور کلثوم کے جسم پر سے چادر نوچ لی۔ کلثوم سچ مچ ننگی ہو رہی تھی۔ جسم کا رنگ لباس کے رنگ پر غالب آگیا تھا۔

سب ایک ساتھ ہنس دیے۔ اماں بولیں "کوئی اور ہوتا تو بارش کے ڈر سے دن بھر اسکول میں دبکا پڑا رہتا پر کلثوم تو میری مرد بیٹی ہے۔ جلدی سے کپڑے بدل ڈال بٹیا، زکام ہو جائے گا۔"

سب باہر چلے گئے تو کلثوم نے کپڑے اتارے اور رات کا لباس پہننے کے لیے کھونٹی

کی طرف بڑھی، بکس پر رکھے ہوئے ذرا سے آئینے میں اس کے جسم کا ایک حصہ جھلکا تو وہ یوں چونکی جیسے اسے کسی نے گالی دے دی ہے۔ پھر جلدی سے شلوار پہنی اور جمپر پہننے سے پہلے آئینے کو اُلٹا رکھ دیا۔ جمپر پہن کر آئینہ اٹھایا اور ٹہلتے ہوئے اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔ اسے زور کی ایک چھینک آئی اور اماں نے باہر سے پکارا ''ہو گیا نا زکام؟''

''جی ہاں، ہو گیا'' اس نے جواب دیا اور آئینے کو بکس پر رکھ کر بستر پر گر پڑی

اور جب زہرہ اسکول سے واپس آئی تو کلثوم بخار سے تپ رہی تھی۔ تین روز یہی کیفیت رہی اور جب چوتھے روز اس کا بخار اترا تو اماں نے بڑے پیار سے پوچھا ''چھٹی کے دنوں کی تنخواہ ملتی رہتی ہے بٹیا؟''

''نہیں امی'' اس نے کہا ''سنا ہے کٹ جاتی ہے، کچی نوکری ہے نا، یا شاید مل ہی جائے''

''تو پھر بٹیا'' اماں بولیں ''آج کسی نہ کسی طرح اسکول چلی جاؤ۔ کوئی اور ہوتا تو بخار اترنے کے بعد دنوں تک بستر پر سے نہ اُٹھتا پر تم تو میری مرد بیٹی ہو''

رضیہ ایک طرف بیٹھی نذر کے کرتے کی مرمت کر رہی تھی چونک کر بولی ''خدا کی قسم امی تم بھی عجیب امی ہو۔ ایسی تو کمزور ہے کلثو، جلد میں سے ہڈی باہر آ رہی ہے، کیسے جا سکے گی؟''

''نہیں جائے گی تو تمہیں کہاں سے ٹھنسوائے گی؟'' اماں جانے کیوں اچانک بلبلا اٹھیں۔

اور رضیہ خلاف معمول یوں خاموش ہو گئی جیسے وہ لاجواب کر دی گئی ہے۔ اس نے بس ایک بار بڑی بے بسی سے کلثوم کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں یوں جھک گئیں جیسے اس کے پپوٹوں میں سیسہ بھر گیا ہے۔

کلثوم کچھ نہ بولی، وہ اُٹھی، باہر نل پر ہاتھ دھوئے، کپڑے بدلے اور اسکول جانے لگی تو زہرہ کہیں سے بھاگی آئی اور اس سے لپٹ گئی ''نہیں آپی، آپ نہیں جا سکتیں، بس''

''تو کیا فاقوں مرنا ہے؟'' کلثوم نے زہرہ کو جھڑک دیا اور زہرہ یوں ایک طرف بت بن کر کھڑی ہو گئی جیسے شیشے کا گلاس اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا ہے۔

فرخ اس روز کپڑے دھو رہی تھی۔ کلثوم کو جاتے دیکھا تو صابن کا ہسہساتا جھاگ ہاتھوں میں لیے پاگلوں کی طرح اٹھی اور بولی "کہاں چلی ہو کلثو؟ دماغ تو نہیں چل گیا تمہارا؟ رات بخار میں بھنتی رہی اب چلی ہے وہاں لڑکیوں سے دماغ چٹوانے" —— پھر وہ رکی اور الفاظ اس کے ہونٹوں میں پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اماں کی طرف دیکھ کر صرف اتنا کہہ سکی "پر خیر، اللہ بڑا رحیم ہے، جاؤ۔ پیٹ پر پتھر باندھ کر کمبخت جینے کی عادت نہیں ورنہ —— خیر کلثو جاؤ۔ جانا تو ہے ہی"۔

"جانا تو ہے ہی"، زہرہ نے زیر لب فرخ باجی کی نقل اتاری۔

کلثوم فوراً صحن طے کر گئی کیونکہ اس نے اماں اور باجی کے تیور دیکھ لیے تھے اور اماں تو زہرہ کو آپے میں رہنے کا حکم دے کر اس کی طرف بڑھ بھی چکی تھیں۔

اس گھر میں کلثوم کے باعث جو ذرا سا تلاطم پیدا ہوا تھا وہ تو اسی وقت مٹ گیا تھا جب رضیہ آپا نے کلثوم کو اپنی مسکراہٹ دے کر اس کے آنسو لے لیے تھے مگر تلاطم ہزار ہنگامی سہی، ساحل کی ریت کے زاویے ضرور بدل دیتا ہے اور کلثوم کی سوچوں کے زاویے یکسر بدل گئے تھے۔ وہ بہنوں اور اماں کے سامنے خوب خوب ہنستی اور ہنستے ہنستے یکایک یوں خاموش ہو جاتی جیسے اسے اچانک احساس گناہ ہو گیا ہے، پھر وہ بھاگ اپنے کمرے میں چلی جاتی اور چٹخنی چڑھا کر اور دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر خوب خوب روتی۔ دروازے پر رضیہ دستک دیتی، فرخ جھریوں میں سے جھانکتی اور اماں مشورہ دیتیں "رونے دو بگلیو، رونے دو ذرا سا جی ہلکا ہو جائے گا بے چاری کا اور پھر آہستہ آہستہ وہ دن بھی آئے گا جب یہ رو ہی نہیں سکے گی۔ مجھے کبھی یوں چھاجوں روتے دیکھا ہے تم لوگوں نے؟ کلیجہ پک جائے تو آنسو جل جاتے ہیں، رونے دو"۔ رضیہ دروازے پر دو ہتڑ مارتی اور چیختی "دروازہ کھولو کلثو ورنہ میں انگارہ چبا لوں گی"۔ اور کلثوم فوراً دروازہ کھول دیتی۔ رضیہ کی اس دھمکی میں اسے سچائی دکھائی دیتی اور سوچتی کہ انگارہ چبانے کی دھمکی دے کر صرف وہی لوگ بیچ بچ

انگارہ چبا سکتے ہیں جن پر مرگی کے دورے پڑتے ہیں۔ سوجھ بوجھ والے لوگ تو مرنے کی دھمکی دے کر شاہی مسجد کے مینار سے کودنے جائیں گے تو مینار پر سے شہر کی سیر کر کے، سیٹی بجاتے نیچے اُتر آئیں گے۔ خلوص تو دیوانوں کی دولت ہے، فرزانوں کا سارا کلچر تو جھوٹ اور ریا کی بنیادوں پر اُٹھا ہے اور جمال کیسے مر سکتا ہے جب کہ اتنا وسیع مستقبل اس کے سامنے پھیلا ہوا ہے اور وہ جوان ہے —— لیکن جوان تو خود بھی تھی۔ تنہائی میں وہ آئینہ اٹھا کر چہرے کو مختلف زاویوں سے دیکھتی اور پھر اس کے منہ کا ذائقہ بدل جاتا، اس کے چہرے کی جھلی غائب ہو جاتی اور انبالے کے کالج کی سائنس لیبارٹری میں رکھے ہوئے انسانی ڈھانچے کی طرح وہ بالکل ننگی ہو جاتی اور پھر چمکتی ہوئی کھوپڑی میں آنکھوں کے سوراخوں کی پرلی طرف دو چٹائیں سی جلنے لگتیں اور وہ اپنے آپ سے ڈر جاتی۔

وہ سارا ہفتہ اتوار کے دن سے ڈرتی رہتی اور جب اتوار آتا تو وہ جیسے اپنے آپ کو گھسیٹ گھساٹ کر بہنوں اور اماں کے درمیان جا بیٹھتی۔ لطیفے سناتی، کہانیاں کہتی، پہیلیاں بجھواتی اور تالیاں بجا بجا کر ہنستی، پھر ہنستے ہنستے ایک دم سنجیدہ ہو کر کسی نقطے پر یوں نظریں گاڑ دیتی جیسے آئینہ دیکھ رہی ہے۔

"اونٹ"، رضیہ پہیلی بوجھتی۔

اور کلثوم چونک کر بڑی متانت سے کہتی "نہیں آپا، اونٹ نہیں سوئی"

سب بے اختیار ہنستے اور وہ ایک بار پھر سب کا ساتھ دیتی لیکن اسے محسوس ہوتا کہ اس کے پھیپھڑے قہقہوں کی صورت میں اپنا بوجھ اتار رہے ہیں مگر یہ بوجھ منہ سے نکلنے کی بجائے تڑسے اس کے دماغ پر گر پڑتا ہے اور اس کے تنے ہوئے اعصاب ساز کے تاروں کی طرح جھنجھناتے رہ جاتے ہیں اور اس کی پتلیوں کے پیچھے آنسو بھتنوں کی طرح ناچنے ہیں۔

تنگ آ کر وہ وہاں سے اُٹھ آتی اور اس کے بعد اتوار کے دن کا وہ حصہ شروع ہوتا جو اس کے ذہن کا کابوس تھا۔ ایک ایسا سناٹا جو گھر اور محلے کے شور و شغب سے بالکل

غیر متاثر رہتا تھا۔ اس خوفناک سناٹے میں اس کے کانوں کے آس پاس جھینگر بولتے اور دماغ میں جیسے ایک بھڑ مکڑی کے جالے میں پھنس کر بھنبھناتی رہتی اور اسے بیٹھے بیٹھے یوں محسوس ہوتا جیسے سر کے بل کھڑی ہے اور جب وہ اس خیال کو جھٹکنے کے لیے بھڑک کر اٹھ بیٹھتی تو جیسے گلے گلے پانی میں ڈوب جاتی۔ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوتی، پھر کھاٹ پر گر پڑتی اور آنکھیں بند کر لیتی۔ سناٹا اس کے آس پاس جمع ہو کر رونے اور کراہنے لگتا اور وہ بھاگ کر زہرہ کے کمرے میں چلی جاتی، اس کے ہاتھوں سے کتاب چھین کر کہتی "دنیا کے مشہور جزیرے! — اچھا جغرافیہ پڑھ رہی ہے میری زہرو، بھلا بتاؤ تو جزیرہ کیا ہوتا ہے؟ خیر یہ تو تمہیں معلوم ہوگا، یہ بتاؤ کہ جزیرہ کیوں ہوتا ہے؟ اور عموماً جزیروں کی زمین میں خوابوں کی کھیتی اتنی شاداب کیوں ہوتی ہے۔ وہاں ناریلوں کے جھرمٹوں میں ندیاں کیوں گنگناتی ہیں۔ اور چڑیاں، اور چھے چشموں کے کنارے بیٹھ کر دن بھر نہاتے اور چہکتے کیوں رہتے ہیں۔ بتاؤ تمہاری کتاب میں ان سوالوں کے جواب ہیں؟ نہیں ہیں نا؟ نہیں ہوں گے، ایسی باتیں جغرافیے کی کتابوں میں کہاں۔ جغرافیہ تو ہمیں صرف یہ بتاتا ہے نا کہ بادل کیسے بنتے ہیں اور بارش کیسے ہوتی ہے۔ اور یہ ہمیں صرف ناول اور غزلیں ہی بتا سکتی ہیں کہ جب بادل امڈتے ہیں تو دلوں میں بھوبھل کون انڈیل دیتا ہے اور جب بارش ہوتی ہے تو چھت پر بوندوں کی آواز سے کتنے زمانوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ پر تم نے ناول کہاں پڑھے ہیں، میں نے ایک ناول پڑھا تھا زہرو کہ بحر الکاہل کے دور دراز جزیروں میں جو نوجوان اپنی محبوبہ کو ایک بار زبردستی اغوا نہیں کر لیتا وہ اس سے شادی کرنے کا حقدار نہیں ہوتا اور جب وہ اسے اغوا کر لیتا ہے تو محبوبہ کی بہنیں اور سہیلیاں آتی ہیں اور اپنی بہن کے بالوں میں پھول سجاتی ہیں اور اپنے بہنوئی کے ماتھے پر مشعل کا شعلہ بناتی ہیں اور اسے چومتی ہیں — یوں،" وہ دم بخود زہرہ کو چوم لیتی اور پھر اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں اور وہ زہرہ کے گال پر یوں ہاتھ پھیرتی جیسے اپنے پیار کے اثرات کو جھاڑ رہی ہے۔

فرخ اسے الگ لے جاکر آہستہ سے کہتی "چھوٹی بہنوں سے ایسی باتیں نہیں کرتے پیاری جال چلن بگڑ جاتے ہیں سب لوگ تمہاری طرح فرشتہ تو نہیں کہ تیئیس برس کی ہونے کو آئی ہو مگر مجال ہے جو—— " الفاظ اس کے ہونٹوں میں پھڑپھڑا کر رہ جاتے پھر وہ بڑی رازداری سے پوچھتی "اب جمال تو یاد نہیں آتا؟"

کلثوم اپنی باجی کی طرف صرف دیکھتی ہی رہ جاتی اور اس کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں میں دھوپ کی چمک اہا اُٹھ سے لگا دیتی اور اس کے نتھنے نہ جانے کہاں سے خون سمیٹ کر گلابی ہو جاتے اور پھڑکتے۔

پھر وہ چونک کر آنسو پونچھ ڈالتی اور رضیہ کو کہیں سے ڈھونڈ نکالتی جو ہمیشہ کہیں کسی کونے میں دبکی کچھ نہ کچھ سی رہی ہوتی یا نذرا اور نذیر میں سے کوئی ہتھے چڑھ جاتا تو جوئیں تلاش کر رہی ہوتی۔ رضیہ سے وہ صرف اس وقت لمبی لمبی شاعرانہ باتیں کرتی تھی جب اس پر ایک کرب آمیز سرور کی سی کیفیت طاری ہوتی۔ وہ آپا سے ستاروں اور بادلوں سے لے کر ساحل سمندر کی سیپیوں اور ندی کنارے کے کنکروں تک کی باتیں کرتی اور رضیہ کبھی کسی موضوع سے اکتاتی نہیں تھی۔

"ہاں ہاں یہ بادل" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی "جیسے فرشتوں کے کپڑے پھٹ گئے ہوں،" وہ قہقہے مارتی اور نذر کے کالر کو رفو کرنے لگتی۔

کلثوم اسے چھیڑتی "آپا، میں سوچتی ہوں یہ آسمان پر جو ابابیلیں اڑ رہی ہیں تو یہ کیوں اڑ رہی ہیں؟"

رضیہ بادلوں کے پس منظر پر ابابیلوں کی اڑانوں کے دائرے اور قوسیں دیکھ کر مسکراتی —— "ابابیلیں اس لیے اڑ رہی ہیں میری جان کہ یہ ابابیلیں ہیں، کلثو نہیں ہیں"

کلثوم اداس ہو کر اپنے کمرے میں آجاتی۔ حساب کا کوئی نہایت مشکل سوال حل کرنے بیٹھ جاتی اور پھر اچانک یہ ہندسے لمبی لمبی ٹانگوں والے کیڑے بن کر کاغذ پہ سے اترتے

اور قطار بنا کر اس کے دماغ میں گھسنے لگتے۔

"میں پاگل ہو گئی ہوں!" وہ چلا اٹھتی۔

"تمہارے دشمن پاگل ہو رہے ہیں" فرخ ساتھ والے کمرے سے بولتی۔

"کس کے دشمن پاگل ہو رہے ہیں؟" رضیہ سوئی کا لمبا ڈورا اُڑاتی ہوئی بھاگتی۔

اور اماں ویران خلاؤں بھری آنکھوں سے سامنے دیکھتیں، دیکھتی رہ جاتیں اور پھر ایکا ایکی کدو چھیلنے لگتیں۔

اتوار ہی کا دن تھا جب کلثوم اکتا کر اوپر چھت پر چلی گئی اور ٹہلنے لگی۔ وہ دیر تک یونہی بیکار ٹہلتی رہی اور پھر چھت کی چار دیواری پر کہنیاں رکھ کر گلی میں دیکھنے لگی۔ مقابل کے مکان کی کھڑکی میں سے ایک نوجوان کلثوم کی طرح کہنیاں ٹیکے کھڑکی کے نیچے بہتی ہوئی نالی کو دیکھ رہا تھا۔ کلثوم کو اوپر سے صرف اُس کے بال نظر آئے جن میں ہلکی ہلکی لہریں تھیں۔ وہ دیر تک دھوپ میں چمکتی ہوئی ان لہروں کو یوں دیکھتی رہی جیسے سمندر کے کنارے کھڑی ہے، پھر ایک دم اسے خیال آیا کہ نوجوان آخر اتنی دیر تک کہنیاں ٹیکے اور چہرے کو ہتھیلیوں پر رکھے کسے دیکھ رہا ہے۔ نیچے گندی نالی ہے جس میں وہ اپنی سگرٹ کی راکھ جھاڑ دیتا ہے اور بس —— تو یہ کیا نظارہ ہوا! ٹھیک ہے، اس نے سوچا میں بھی تو اتنی ہی دیر تک کھڑی اس کے بالوں کو دیکھ رہی ہوں، پر میں تو ناکام محبت ہوں نا! اس نے ناولوں کے مطالعہ سے فائدہ اٹھایا اور اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کسی طرح نوجوان کا چہرہ دیکھ لے مگر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کا کوئی طریقہ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ اچانک اس نے سلیپر اتارا اور اسے دیوار پر زور سے مار کر بولی "بچھو!" اس نے فوراً نیچے دیکھا، نوجوان اب اوپر دیکھ رہا تھا۔ کلثوم فوراً دیوار کے پیچھے چھپ گئی اور طلوعِ سحر کتنے دنوں کی دھول میں سے نکل کر اس کے ہونٹوں میں رچ گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے اُٹھ کر نیچے دیکھا "بچھو!"

نوجوان نے دھک سے کھڑکی کی لکڑی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اور اوپر دیکھا، اب کے وہ پھر چھپ کر بیٹھ گئی اور پھر وہاں سے بھاگ کر نیچے اتر گئی، اپنے کمرے میں آئی، دروازے طرف رخ کر کے آئینہ دیکھا اور پکاری "باجی وہ چھائیوں مہاسوں والی کریم ختم ہو گئی کہ کچھ بچی رکھی ہے؟"

"رکھی ہے پیاری" فرخ دوسرے کمرے سے بولی "لے جاؤ"

"ذرا نذر میاں کے ہاتھ بھجوا دیجئے گا باجی" اس نے آئینے میں اپنے ہونٹوں کی جنبش کا بغور معائنہ کیا، پھر وہ مسکرا کر زیر لب بولی "ذرا نذر کے ہاتھ بھجوا دیجیے گا باجی" اور پھر وہ "باجی باجی" دہرانے لگی اور پھر مسکرانے لگی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں کی جنبشوں میں کمانوں کی سی قوسیں اور مسجد کی محرابوں کا سا بھرپور پن اور حسن ہے، اور نذر کے کریم لانے سے پہلے ہی اس کے چہرے کی چھائیاں مٹ گئی ہیں اور وہاں گھروندے کے جلنے کی بجائے شفق پھول رہی ہے!

اسکول کی لڑکیوں تک نے محسوس کیا کہ اُستانی جی کی ایکا ایکی کایا کلپ ہو گئی ہے۔ تفریح کے وقفے میں وہ استانیوں سے خوب چہکتی رہی اور ہیڈ مسٹرس کے اس حکم کو بغیر کسی احتجاج کے مان لیا کہ فارسی کی استانی کی رخصت کے ایام میں وہ فارسی بھی پڑھاتی رہے گی۔ جب وہ واپس اپنے کمرے میں آئی تو حاضری کے رجسٹر کے نیچے ایک چٹ پڑی تھی جس پر لکھا تھا "یہ عین فصل خزاں میں ہجوم گل کیسا!" صاف جمال کی تحریر تھی۔ پہلے تو وہ بجھ سی گئی مگر پھر یوں مسکرائی جیسے شاعر سچ مچ اچھے شعر پر داد پا کر آسودگی سے مسکراتا ہے۔

چھٹی کے بعد واپس گھر کو جاتے ہوئے ساڑھی کا پلو سر سے گر کر کندھے پر پھڑپھڑانے لگا اور پھر پھڑاتا رہ گیا، اور اس کے اتنے بہت سے ڈھیر سے بال اس کی پیٹھ پر اڑتے اور مچلتے رہے۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی وہ چاہتی تھی کہ پڑوس کی کھڑکی کی طرف دیکھتی چلے مگر گردن میں جیسے لوہے کی سلاخ گڑ گئی تھی ناک کی سیدھ میں بہکی چلی گئی۔ گھر کے دروازے پر ذرا سا

ٹھٹکی اور ایک پل میں کتنے بہت سے ارادے کیے مگر سب ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھتے چلے گئے اور آخر گھر میں داخل ہو گئی۔ صحن خالی تھا نصف صحن طے کرنے کے بعد وہ پلٹی اور سیڑھیوں کا رخ کیا۔ دبے پاؤں چھت پر گئی اور بڑے اطمینان سے سیدھی چار دیواری تک چلی گئی۔ اس نے نیچے دیکھا۔

کل کی طرح آج بھی نوجوان کا سر کھڑکی میں رکھا تھا اور دھوپ نے اس کے بالوں کی لہروں میں شعاعیں گوندھ دی تھیں۔ کلثوم بڑی آزادی سے کھنکاری، نوجوان نے اوپر دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے پلٹ کر کمرے کے اندر جھانکا اور پھر ایک دم پانچ اور سر اس کے سر کے آس پاس سج گئے۔ سب آنکھیں پھاڑ کر کلثوم کو دیکھنے لگے اور کلثوم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نوجوان کو دیکھنے لگی۔ دراصل یہ سارا تماشا اس کی سمجھ میں نہ آیا اور وہ ابھی اس پر غور ہی کر رہی تھی کہ نوجوان نے اسے کچھ یوں آنکھ ماری کہ کلثوم کو تیر کے کمان سے چھوٹنے کی سی آواز سنائی دے گئی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے نوجوان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کپڑے اتار لیے ہیں۔ ابھی وہ اپنی عریانی کو سمیٹنے ہی کی فکر میں تھی کہ نوجوان کے پانچوں دوست چلا چلا کر قہقہے مارنے لگے اور وہ جیسے سنگ باری سے بچنے کے لیے دھب سے چھت پر گر پڑی۔

نیچے سے آواز آئی "آپ بہت دیر سے آئیں خالہ جان، صابر کی تو کل پرسوں شادی ہو رہی ہے۔"

دوسری آواز آئی "اجازت ہو تو صابر آپ کو منہ بولی اماں کہہ لے ماسی۔"

لمبے لمبے قہقہے چیخیں بن گئے اور کلثوم کے قدموں تلے جیسے چھت ڈوبنے لگی اور ڈوبتی چلی گئی۔

ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے منہ میں ہاتھ ڈال کر اپنا جبڑا پھاڑ ڈالے، اپنے بالوں کو مٹھیوں مٹھیوں نوچ کر بکھیر دے اور اپنے جسم کو دیوار پر پٹخ پٹخ کر ادھیڑ ڈالے۔ پھر اسے کچھ ایسا

لگا جیسے اس کی پتلی دبلی ناک لٹک کر اس کے ہونٹوں کو چھو رہی ہے، ہونٹ لٹک کر ٹھوڑی پر جھول رہے ہیں اور ٹھوڑی لٹک کر اس کے سینے میں گڑ گئی ہے۔ وہ بھاگ کر سیڑھیوں کی طرف گئی۔ ابھی وہ سیڑھیوں پر سے اتر رہی تھی کہ اماں کی آواز آئی "اوپر چھت پر کون ہے؟"— اور وہ آخری سیڑھی پر تھی جب اماں، فرخ، رضیہ اور زہرہ کمروں میں سے باہر آگئیں اور کلثوم کو دیکھتے ہی اماں اور فرخ کے چہروں پر راکھ اڑنے لگی۔

"کب آئیں؟" اماں نے پوچھا۔

"اوپر کیا کرنے گئی تھیں؟" فرخ بولی۔

"آئیں کب؟" اماں نے پھر پوچھا۔

"ابھی آئی ہوں۔" وہ بولی

"اوپر کیا کرنے گئی تھیں؟" فرخ نے تو جیسے چور پکڑ لیا۔

"اوپر پنسل گر گئی تھی۔" انتہا درجے کی گھبراہٹ میں بھی اسے بہانہ سوجھ گیا "اسکول میں یاد آئی، اب واپس آئی ہوں تو میں نے کہا دیکھتی چلوں۔"

"مل گئی؟" اماں نے پوچھا۔

"جی ہاں" کلثوم نے پنسل دکھادی۔

"چلو اچھا ہوا۔" اماں واپس جانے کے لیے پلٹیں۔

"بھاگی کیوں تھیں؟" فرخ نے وکیلوں کی سی جرح شروع کردی۔

"بھاگا کون تھا؟" کلثوم کے لہجے میں تبدیلی آگئی۔ "ساڑھی پاؤں میں الجھ گئی تو ذرا سا لڑکھڑا گئی تھی۔"

"چوٹ تو نہیں آئی میری جان؟" رضیہ ماں کا فرض ادا کرنے آگے بڑھی۔

"جی نہیں" کلثوم نے جھوٹ بولا۔

"آئیے آپی کا پاؤں دبا دوں" زہرہ نے پیار سے کہا۔

"دب جائے گا بلّو۔" کلثوم کا لہجہ پھر نارمل ہوگیا۔

"اور یہ تمہارے چہرے کو کیا ہو رہا ہے؟" فرخ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اور کلثوم بھڑک اُٹھی، اس کے تیور بدل گئے، رنگ زرد ہو گیا اور پھر اس زردی میں نیلا ہٹ بھر گئی، چلّا کر بولی "میرے چہرے پر لعنتیں ہیں، میرے چہرے پر ٹیکے ہیں کالنک کے سنا آپ نے؟ میرے چہرے پر ساری دنیا کی نجاست لپی ہوئی ہے، اب کچھ تسلّی ہوئی آپ سب کی؟ کہیے تو کچھ اور بھی بتا دوں۔ میرے چہرے پر مردوں کے بوسے تھپے ہوئے ہیں اور میری آنکھوں میں بے حیائی ہے اور میری ——" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور وہ ایک دم سکتے کے سے عالم میں آ گئی۔

اماں آگے بڑھیں اور کلثوم کے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھا ہی رہی تھی کہ رضیہ جھپاک سے دونوں کے درمیان آ گئی۔ فرخ نے دیوار سے لگ کر رونا شروع کر دیا اور زہرہ دونوں ہاتھوں کو دونوں گالوں پر رکھے "دم کی مریم کی طرح ڈبڈبائی اور سہمی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

رضیہ چلّائی "دیکھیے امی اگر آپ کلثوم کو ماریں تو میری لاش پر چلیں۔"

اماں کے سارے جسم میں رعشہ تھا اور جب وہ بولیں تو ان کی آواز میں بھی رعشہ تھا "میں تو تم سب کی لاشوں پر چل چکی نگوڑیو، میں تو اپنی لاش کو بھی روند چکی۔ میں تو کہیں کی نہ رہی تم حرامزادیوں کو جن کر۔ اور یہ لومڑی کی سی صورت والی استانی کیا بنی معلوم ہوتا ہے اسکول نہیں جاتی، چکلے جاتی ہے۔ مردوں کے بوسوں کی باتیں ہو رہی ہیں اپنی کنواری اور بیوہ بہنوں کے سامنے۔ آنکھوں کا پانی مر گیا، دیدے بھیک کے پیالے بن گئے، جوتوں سمیت گھس رہی ہے سب کی آنکھوں میں۔ اور یہ مرگی کی ماری پنگلوٹ ڈھال بنتی ہے: —— ہٹ جا میرے سامنے سے، میں دیکھوں تو اس کی زبان کے گز لمبی ہے، ہٹ جا۔"

"نہیں ہٹتی۔" رضیہ نے چلّا کر جواب دیا۔

فرخ نے اُٹھ کر اماں کو تھام لیا، مگر اب زور آزمائی شروع ہو گئی۔ ساتھ ساتھ اماں حرامزادیو، الو کی پٹھیو، ڈائنو، چڑیلو، بھتنیو، چھلپا یئو کی گردان کرتی چلی گئیں۔

فرخ کو بے بس پا کر سرخ چہرے پر آنسو لیے زہرہ آئی اور بولی "بس اب جانے بھی دیجیے اماں!"

اب اماں نے زہرہ کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تو کلثوم رضیہ کی پناہ میں سے نکل کر آئی اور بولی "ٹھہریئے امی، زہرہ کو نہ ماریئے، اگر آپ کا ہاتھ ایسا ہی بیتاب ہے تو آیئے، میرے منہ پر تھپڑ ماریئے!"

رضیہ چلائی "اگر آپ نے میری کلثوم کو تھپڑ مارا تو میں انگارہ چبا لوں گی۔"

"چبا لے، میری بلا سے!" اماں نے چیخ کر کہا اور انھوں نے کلثوم کے زناٹے کا تھپڑ مار دیا۔ یہ تھپڑ اس زور سے لگا جیسے پٹاخہ چھوٹا ہے۔

رضیہ چولھے کی طرف بھاگی۔

"بس؟" کلثوم نے اماں سے پوچھا "یا ابھی کچھ اور باقی ہے؟"

"باقی یہ ہے" اماں بدستور چلا رہی تھیں "کہ یہ کپڑے وپڑے پھاڑ کر ننگی ہو جا، اور کیا باقی ہے؟"

"لیجیے" کلثوم بولی۔

اس نے ساڑھی کو نوچ کر پھینک دیا اور بلاؤز کو گلے میں ہاتھ ڈال کر یوں جھٹکا دیا کہ وہ بیچ پر سے پھٹ کر اس کے پیٹی کوٹ پر لٹکنے لگا، اور وہ اسی ننگی حالت میں ماں کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور بولی "اور کیا باقی ہے؟"

چولھے کی طرف سے رضیہ کی ایک وحشت ناک چیخ سنائی دی مگر کسی نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ اماں، فرخ اور زہرہ چہروں پر ہاتھ رکھ کر بلک بلک کر رونے لگیں اور کلثوم جس کا رنگ بالکل نیلا پڑ گیا تھا، ان کی طرف کچھ دیر پلکیں جھپکے بغیر دیکھتی رہی اور پھر کچھ اس زور سے منہ کے

بل گئی کہ اماں اور بہنوں کے چہرے مارے خوف کے لاشوں کی طرح بگڑ گئے۔ ادھ ننگی کلثوم خاک پر سینے کے بل بے حس و حرکت پڑی رہی اور اماں، فرخ اور زہرہ کی کچھ ایسی کیفیت ہوگئی جیسے انہیں کسی نے اکٹھے بہت سے تیز چکر دے کر بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ پھر تینوں کلثوم کی طرف بڑھیں، اسے اٹھا کر اس کے کمرے میں لے گئیں۔ اماں نے سب سے پہلے تولیے سے اس کا سینہ ڈھانپا، اس کے بعد چہرے پر پانی چھڑکا، منہ میں کھانڈ ٹپکانے کی کوشش کی مگر بتیسی جڑ چکی تھی۔ چمچے کی مدد سے بھنچی ہوئی بتیسی کھولنے لگیں تو باہر سے نذرا اور نذیر چلائے

"اموں، اے اموں، ماسی پر جن آ گئے"۔

اس وقت سب کو پہلی بار رضیہ کا خیال آیا، فرخ باہر دوڑی، زہرہ دروازے تک جا کر پلٹ آئی، اماں نے صرف اتنا کہا "رضیہ کی لاش کو ادھر بڑے کمرے میں گھسیٹ لے جاؤ"۔

کلثوم ہوش میں آ گئی۔ آنکھیں کھول کر وہ ایک لمحے تک جیسے ماں کو پہچانتی رہی اور پھر بڑبڑا کر جسم کے ننگے حصے کو چھپانے کی کوشش میں ایک بار پھر ننگی ہوگئی۔ بے بسی کے عالم میں رو دی اور پکاری۔ "آپ ذرا باہر جائیے"۔ زہرہ اماں سے پہلے باہر نکل گئی تھی اور جب اماں بھی چلی گئیں تو کلثوم کود کر فرش پر آ رہی، ڈگمگا کر کھاٹ پر گر پڑی، سر کو ہاتھوں میں تھام لیا، جمپر کے بٹن بند کرتے ہوئے وہ مڑی اور سامنے بکس پر رکھے ہوئے آئینے میں اسے اپنا عکس نظر آ گیا اور اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ آئینے میں اس کے ماضی کے سارے حادثے نہایت تیزی سے ایک ایک کر کے گزرنے لگے اور جب یہ طوفان تھما تو آئینے میں وہ بھی نہ تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس المیے کا انجام بھی دیکھے—— انجام! —— اس نے انگلیوں کی جھریوں میں سے آئینے کو دیکھا اور پھر جیسے ایک عزم کے ساتھ ہاتھ نیچے گرا دیے۔ بڑھ کر اس نے آئینہ اٹھا لیا اور دروازے کے پاس جا کر اپنا چہرہ دیکھنے لگی تھی کہ نذرا اور نذیر دوسرے کمرے میں سے روتے ہوئے نکلے اور کلثوم کو دیکھ کر نذر بولا، "رضیہ ماسی مر گئیں"!

"مر گئیں!" کلثوم چیخ اٹھی اور آئینہ اس کے ہاتھ میں لٹک گیا۔ وہ باہر لپکی۔

"کون مر گیا!" اماں نے دوسرے کمرے میں سے تیزی سے نکل کر پوچھا۔

"رضیہ آپا" کلثوم نے جواب بھی دیا اور سوال بھی کیا۔

"اس کے دشمن مریں" فرخ نے دروازے میں سے کہا۔

ان کے عقب سے زہرہ بولی "وہ تو ابھی ابھی ہوش میں آئی ہیں تو اٹھ کر آپ کے پاس جانے کی کوشش کی پر اٹھ نہ سکیں۔ چارپائی پر گرتے ہوئے بولیں 'ہائے میں مر گئی! اور نذر اور نذیر نے ——" زہرہ ہنسنے لگی۔

ماحول ہنسنے کا نہیں تھا مگر سب ہنسنے لگے۔ ارادے کے خلاف ہنسنے لگے، اور یوں ایک حقیقت سے کچھ دیر کے لیے دور بھاگ گئے۔ بچھو کاٹ لے تو بھی ایک بار انسان یہ ضرور سوچ لیتا ہے کہ شاید کانٹا ہی چبھا ہو۔ اس وقت کلثوم بھی ہنسی تھی اور اس نے آئینے کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے نذر اور نذیر کی طرف دیکھا تھا جو دیوار سے لگ کر کھڑے زہرہ کے انکشاف پر شرمندہ ہو کر ہونٹ سے لگ رہے تھے "ادھر آؤ" کلثوم بولی۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر وہ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور کلثوم نے جھک کر دونوں کو چوم لیا۔ یہ پیار جیسے سب کے ماتھوں میں نفوذ کر گئے۔ پھر اندر سے رضیہ کی آواز آئی۔

"کلثو میری جان۔ دیکھا، آخر میں نے انگارہ چبا ہی لیا نا!"

کلثوم کے ہاتھ سے آئینہ گر پڑا اور وہ اندر لپکی۔ نذر نے آئینہ اٹھا کر بکس پر رکھ دیا۔

رضیہ نقاہت سے کراہ رہی تھی۔ اس کے بالوں اور کپڑوں میں مٹی بھری تھی اور اس کے ہونٹوں پر آبلے تھے۔ وہ کلثوم کو دیکھتے ہی رونے لگی۔ اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اسے چومنا چاہا تو اچانک ہونٹ پکڑ کر بیٹھ گئی اور کراہنے لگی اور پھر لال لال آنکھیں پھاڑ کر بولی "مسکرا میری جان۔ تو نہیں مسکرائے گی تو میں ایک اور انگارہ چباؤں گی" اور کلثوم کے چہرے پر گھروندا جلنے لگا "یونہی مسکراتی رہا کر میری کلثو پگلی۔ تیری میری

یہی شرط ہے، یہ سب تو ظالم ہیں۔"

"ہونٹوں پر کریم لگا لیجیے آپا"، کلثوم نے کہا "آبلوں کی جلن کم ہو جائے گی۔"

"آبلے خود بخود خشک ہو جاتے ہیں میری جان"، رضیہ بولی "اور پھر یہ تو ہونٹوں کے آبلے ہیں، دلوں کے آبلے بھی ——"، رضیہ نے ڈر کر اماں کو دیکھا اور خاموش ہو گئی۔

اماں ہنسنے لگیں۔ پھر سب ہنسنے لگے اور کلثوم نے اس ہنگامے میں کہا "قسم خدا کی رضیہ آپا آپ تو فرشتہ ہیں۔ آپ کے دم سے اس گھر کا سونا پن گنگنانے لگتا ہے۔"

پھر سب اچانک سنجیدہ ہو گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سب کے حلق میں ایک بات ہڈی کی طرح یوں اٹک گئی ہے کہ نہ اگلتے بنے نہ نگلتے بنے۔

اس تکلیف دہ سناٹے کو رضیہ آپا نے توڑا۔ بولیں "یہ ہم سب کو ایک دم ہو کیا جاتا ہے؟"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر سب کی نظریں اماں پر جم گئیں جو اِن پوچھتی ہوئی نظروں کے بوجھ کی تاب نہ لاسکیں اور اچانک بلبلا کر رو دیں انھوں نے اپنے ہی دو ہتڑوں سے اپنا منہ پیٹ لیا اور پھر اپنے دائیں ہاتھ کو دانتوں میں دبا کر اس زور سے کاٹا کہ سب نے اپنے اپنے ہاتھ اٹھا کر منہ پر رکھ لیے۔

کلثوم اس دھوپ چھاؤں کی تکرار سے اکتا کر اپنے کمرے میں آگئی، کچھ دیر کے بعد وہاں زہرہ بھی آنکلی۔ اسے سینے سے لگا کر کلثوم نے اسے بہت سے پیار کیے اور بولی "تو بڑے بدنصیب گھر میں پیدا ہوئی میری زہرہ۔ میں سوچتی ہوں جب تو پڑھ لکھ جائے گی تو کیا ہو گا۔ پڑھا تو میں نے بھی ہے پر ہوا کیا؟ کچھ نہیں ہوا۔ ایک لاکھ جمع ایک لاکھ مساوی صفر کے، حساب کا یہ ایک نیا طریقہ میں نے ایجاد کیا ہے، اور پھر بیٹی پڑھ لکھ جائے تو مرد بیٹی بن جاتی ہے، اور اس کے مونچھیں نکل آتی ہیں۔"

"مونچھیں؟" زہرہ چونک اٹھی تھی۔

اب کے کلثوم بھی چونک اٹھی "لاحول ولا قوۃ۔ جانے بیٹھے بیٹھے میں بکواس کیوں کرنے لگتی ہوں، چلو ذرا چھت پر ٹہل آئیں۔"

"چلیے۔" زہرہ کمرے سے ویسے بھی بھاگ نکلنا چاہتی تھی۔

دونوں اوپر آئیں، آخری سیڑھی پر سے چھت پر قدم رکھتے ہی کلثوم کے اعصاب تن گئے، وہ پاگلوں کی طرح ناک کی سیدھ میں آگے بڑھی اور دیوار پر سے نیچے گلی میں تھوک دیا۔ ایک لمحہ وہ وہاں تن کر کھڑی رہی، پھر لڑکھڑا کر دیوار کو جکڑ لیا۔ گلا صاف کر کے منہ پر لٹکتے ہوئے بالوں کو پیچھے جھٹک دیا اور ایک لمبی سانس لے کر بولی "کیسی تازہ اور ٹھنڈی ہوا ہے زہرہ! کیوں؟ ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

آؤ نیچے چلیں۔"

اس عجیب و غریب استدلال پر احتجاج کیے بغیر زہرہ اس کے پیچھے پیچھے نیچے اتر آئی۔

کلثوم نے چھت پر جا کر سچ مچ تازہ ہوا سے پھیپھڑے بھر لیے تھے۔ اس روز شام تک اس کی صورت اور اس کے مزاج کی کچھ ایسی کیفیت ہو گئی کہ وہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی، کبھی بیٹھی ماں کا ہاتھ بٹا رہی ہے کبھی اپنے سر سے بال پنیں نکال کر فرخ کے بالوں میں لگا رہی ہے، کبھی رضیہ کو موسم اور دنیا اور کبھی اپنے گھر کے بارے میں شاعرانہ باتیں کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ "فرض کیجیے آپا کہ دنیا اچانک بدل جاتی ہے، سب انسان ایک دم نیک ہو جاتے ہیں، کوئی کسی سے نفرت نہیں کرتا، پھر کیا ہو گا؟"

"یہ ہو گا۔" رضیہ کہتی "کہ جب کسی سے کوئی نفرت ہی نہیں کرے گا تو محبت کا ہے کو کرے گا، اور سب انسان نیک ہو جائیں گے تو ادھر دودھ ملائی والے کے ریڈیو میں سے ہیر وارث شاہ کی آواز کہاں سے آئے گی اور بادل امڈیں گے تو تم کیسے گنگنا سکو گی بگلو۔"

اور پھر کلثوم آج زہرہ پر تو چھا ور ہوئی جا رہی تھی۔ کبھی اس کی کتابوں کی جلدوں پر اخبار

چڑھا رہی ہے، کبھی اپنا نیا تکیہ اس کے پرانے تکیے سے بدل رہی ہے، کبھی اس کی آنکھوں میں کاجل لگا کر اس کے ایک گال پر سلائی کی نوک سے تل بنا رہی ہے اور کچھ دور ہٹ کر اسے یوں دیکھ رہی ہے جیسے مصور اپنی تصویر کو دیکھتا ہے۔ اس شام کو اس نے نذر اور نذیر کے لیے ملائی بھی منگوائی اور بہت رات گئے تک جلاہوں کے لطیفے بھی ہوتے رہے۔ گھر کا ماحول ایک دم یوں بدل گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اسی لیے جب سب صبح کو اٹھے تو ہشاش بشاش تھے۔ کلثوم نے اسکول جاتے ہوئے گھر کے ایک ایک فرد کو رخصتی پیار کیا۔ رضیہ سے آبلوں کی کوئی دوا لانے کا وعدہ کیا اور یوں ٹھمکتی ہوئی چلی جیسے آج اس کی سولھویں سالگرہ ہے۔

اسکول جاتے ہی اسے جیسے بہت ضروری کام یاد آ گیا۔ سیدھی جمال کے کمرے میں گئی مگر وہاں اسے معلوم ہوا کہ جمال کی صحت مسلسل گر رہی تھی اس لیے وہ دو مہینے کی چھٹی لے کر کسی پہاڑ پر چلا گیا ہے۔ اس کی کرسی پر ایک نیا کلرک بیٹھا تھا۔ "میرا نام طالب علی ہے۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"مجھے کلثوم کہتے ہیں۔ میں یہاں حساب پڑھاتی ہوں اور آج کل فارسی بھی پڑھا رہی ہوں۔"

"حساب اور فارسی!" طالب علی نے مسکرا کر کہا "یہ تو مشرق و مغرب کا ملاپ ہے!"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" کلثوم نے اس کی مجلسی غلطی درست کی۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" طالب علی نے گھبرا کر جواب دیا۔

اسکول بند ہونے سے پہلے وہ پھر طالب علی کے پاس گئی اور بولی "وہ میں اس لیے آئی ہوں کہ آپ سے ذرا اپنے گریڈ کے بارے میں پوچھ لوں۔ یہ معلوم کرنا ہے کہ مجھے انکریمنٹ ملنا کب شروع ہوگی۔"

طالب علی بولا "کل تک عرض کر سکوں گا۔ ابھی سب رجسٹر نہیں دیکھ سکا۔"

"کوئی بات نہیں۔" کلثوم نے کہا "کل سہی۔ ویسے فی الحال یہ بتا دیجیے کہ ــــ معاف کیجیے گا بالکل ذاتی سوال ہے ــــ یہ بتائیے آپ شادی شدہ تو نہیں؟"

طالب علی کا دماغ پھرکی کی طرح گھوم گیا۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے صاف نیلے آسمان کے کلیجے میں سے ایک بادل کود کر نکلا ہے اور دھاڑنے لگا ہے۔

"تشریف رکھیے" اس نے ہکلا کر کہا۔

کلثوم بیٹھ گئی۔ اس کا رنگ فق تھا اور آنکھوں میں ٹمٹماہٹ تھی۔

"جی نہیں" اب کے طالب علی نے کلثوم کے سوال کا جواب دیا۔

"شادی کیجیے گا" کلثوم خطِ مستقیم میں بول رہی تھی۔

"جی نہیں — جی نہیں" طالب علی خلا میں اڑ رہا تھا۔

"کیوں؟"

"بس یوں سمجھیے کہ میری آدھی شادی ہو چکی ہے — یعنی منگنی" وہ بولا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ شادی کریں گے" کلثوم بولی۔

"جی — جی ہاں منگیتر سے" اس نے وضاحت کی۔

"اور آپ نے کیا سمجھا تھا؟"

"جی — کچھ نہیں"

"اگر منگیتر ہی آپ سے شادی نہ کرے؟" کلثوم نے پوچھا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" طالب علی بولا "اس کی ماں مان گئی ہے"

"خوب!" کلثوم کے چہرے پر گھروندا جلنے لگا اور وہ خداحافظ کہہ کر اٹھ آئی۔

حواس باختہ طالب علی نے بوڑھے چپراسی کو اشارے سے پاس بلایا اور بولا "دیکھو بھئی یہ جو استانی ابھی ابھی دفتر سے نکلی ہیں، یہ پاگل تو نہیں؟"

"اجی نہیں صاحب" چپراسی برا مان گیا "یہ بہت اچھی استانی ہے، نیک اور نرم طبیعت والی، میں نے پچھلے بیس سال میں ایسی استانی نہ دیکھی نہ سنی۔ کلثوم بی بی نام ہے، مہاجرین ہیں"

اور طالب علی اندر دفتر میں جاکر کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور سر کو ہاتھوں میں یوں جکڑ لیا

جیسے اس کا بھیجا اس کی کھوپڑی کو توڑ کر لاوے کی طرح بہہ جانے والا ہے۔

کلثوم گھر کی گلی میں داخل ہوئی تو پڑوسیوں کے مکان کی کھڑکی میں گلدستوں اور ہاروں کے ڈھیر لگے تھے اور کھڑکی سے گلی کے اس سرے تک اینٹوں کے چولھوں پہ دیگیں رکھی تھیں۔ اس گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ لڑکے اور لڑکیاں بہترین لباسوں میں سجی ہوئی اڑی پھرتی تھیں اور مہندی کے رنگ نے ان کی ہتھیلیوں کو انگارے بنا دیا تھا۔ اچانک اسے رضیہ آپا کے ہونٹوں کے آبلے یاد آئے اور وہ پلٹ کر ایک کیمسٹ کے پاس چلی گئی، ایک دوالے کر واپس آئی تو ہنگامہ بڑھ چکا تھا۔ شاید بہت سے مہمان کھڑکی والے ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے تھے اور ان کے کپڑوں سے عطر کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں۔ اس خوشبو نے کلثوم کو دھکا سا دے دیا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے میں اس تیزی سے داخل ہوئی جیسے سنبھل نہ سکی تو منہ کے بل گر پڑے گی، مگر اسے منہ کے بل گرنے سے روکنے کے لیے خود اس کے گھر میں بھی خاصی چہل پہل تھی۔ برتن بج رہے تھے۔ نذر اور نذیر کودتے اور ناچتے پھر رہے تھے اور زہرہ ایک سینی اٹھائے باورچی خانے کی طرف یوں لپکی جا رہی تھی جیسے پاؤں میں پہیے باندھ رکھے ہیں۔ کلثوم کو دیکھتے ہی وہ اسی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔ اس سے لپٹ گئی پھر لپٹی ہوئی اس سے لٹک گئی اور منہ کھول دیا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" کلثوم پکاری۔

"شش!" زہرہ تڑپ کر ایک طرف جا کھڑی ہوئی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر شرارت سے آنکھیں مٹکانے لگی، پھر بولی "وہ سن لیں گے!"

"کون؟" کلثوم نے پوچھا۔

"وہ جو دیر سے یہاں آئے ہوئے ہیں" زہرہ نے فرش پر سے سینی اٹھالی۔

"بھئی کون ہیں وہ؟ کیا لینے آئے ہیں؟ کچھ بکو بھی نا" پھر وہ لہجے کو نرم کر کے بولی "بتاؤ نا زہرو پیاری، مذاق کو اتنا لمبا بھی نہیں کرتے کہ بور کر دے۔ بتاؤ"

"شرم آتی ہے اپی" زہرہ نے گردن نیہوڑا کر ایک انگلی کو نچلے ہونٹ پر رکھ لیا اور شرارت سے مسکرانے لگی۔

"اچھا تو ہم خود دیکھ لیتے ہیں" کلثوم نے کہا اور آگے بڑھنے لگی۔

زہرہ کود کر اس کے سامنے آگئی اور منت کرتے ہوئے بولی "نہیں نہیں اپی۔ آپ کو میری ہی قسم ادھر نہ جائیے، ادھر ایک بی بی آئی ہوئی ہیں۔ ساتھ نوکرانی بھی ہے۔ آپ کو ان سے پردہ کرنا چاہیئے۔ سمجھیں آپ؟"

کلثوم ذرا سا سمجھی ضرور مگر یہ بات ہی ایسی تھی کہ اس کی تفصیل کلثوم کے لیے بہت دلچسپ ثابت ہو سکتی تھی اسی لیے بولی "میں تو خاک بھی نہیں سمجھی؟"

"اچھا تو سنیئے" زہرہ نے گالی دینے کا انداز اختیار کر لیا "آپ کے رشتے کی بات ہو رہی ہے" اور وہ یہ کہہ کر چڑیا کی طرح پھر سے اڑ گئی۔

کلثوم کو کچھ ایسا لگا جیسے دن کو ستارے نکل آئے ہیں، ترمرے سے اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے اور وہ جیسے راستہ ٹٹولتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گری۔ ابھی وہ سنبھل نہیں پائی تھی کہ زہرہ جھپاک سے اندر آئی اور سرگوشی میں بولی "میں آپ کے آنے کا کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ آپ چپکے سے یہاں اس دروازے میں سے باتیں سنیئے، میں باہر والا دروازہ باہر سے بند کیے جاتی ہوں۔" اور وہ پھر سے اڑ گئی۔

کلثوم نے دروازے تک زہرہ کا محض اس لیے پیچھا کیا کہ اسے دبوچ کر اس کا ایک پیار لے لے، مگر آج تو زہرہ کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ دروازہ باہر سے بند ہو گیا اور کلثوم اندھیرے میں راستہ ٹٹولتی بڑے کمرے میں کھلنے والے دروازے کی طرف چلی۔ پہلے تو جھریوں میں سے اس نے کچھ دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اب اندھیرے سے اس کی آنکھیں مانوس ہو چکی تھیں۔ آہستہ سے ایک کرسی اٹھائی اور اسے دروازے کے پاس رکھ کر پرے کمرے والوں کی باتیں سننے لگی۔ پھر ایک دم اٹھی، باہر والے

دروازے کو اندر سے بھی بند کر لیا اور کرسی پر اطمینان سے آ بیٹھی۔

ایک عورت کی بھاری بھاری زکام آلود آواز آئی "یہیں ساتھ تو لے آتی پر یہ ہن وہ تو لڑکیوں کی طرح شرماتا ہے۔ ویسے اس نے کلثوم بٹیا کو کئی بار اسکول سے آتے جاتے دیکھا ہے میں نے پوچھا تمہاری کیا مرضی ہے تو سر جھکا کر بولا جو آپ کی مرضی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ——— یعنی کہ ——— جی ہاں۔"

اب اماں بولیں "ہو گا۔ ٹھیک ہے۔ پر دیکھیے، کلثوم کمانے کجانے والی لڑکی ہے، بالکل مردوں کے سے ٹھاٹ ہیں۔ بات یہ ہے کہ ——— وہ ——— خیر، پہلے آپ کہہ لیجیے۔"

اتنے میں شاید زہرہ سینی میں پھل رکھ کرلے آئی، تکلفات شروع ہو گئے۔ چند بار چھری سینی سے بجی اور زکام آلود آواز آئی "ماشاءاللہ کلثوم بٹیا کے علاوہ اور بھی تو آمدنی کے ذریعے ہوں گے؟"

"جی ہاں" اماں کی آواز جھوٹ بولتے ہوئے بلند ہو جاتی تھی "کیوں نہیں۔ اتنا بڑا گھرانہ ہے، اتنی روپلی میں تو چلنے سے رہا۔ بیٹا ہر مہینے دو سو ڈھائی سو بھیج دیتا ہے اور پھر لڑکیوں کے ابا مرحوم کا بینک میں حساب ہے جو ہندوستان سے پاکستان آگیا ہے۔ پچھلے مہینے چھ سو نکلوائے بھی۔ بچیوں کو کراکری کا بہت شوق ہے۔ کھائیں گی انہی برتنوں میں۔ جو آپ کے سامنے ہیں مگر کراکری ایسی ہے کہ پٹیالے والا راجہ بھی دیکھے تو بھونچکا رہ جائے۔"

"ماشاءاللہ! مہمان خاتون بولی۔

"اور پھر روپیہ تو ہاتھوں کا میل ہے، ادھر آیا اُدھر گیا۔" اماں بولے چلی گئیں "شادی میں دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ دونوں کتنے پانی میں ہیں۔ سو میری مر دبیٹی کو تو آپ نے دیکھ لیا۔ مجال ہے جو ماتھے پر کبھی ایک شکن بھی اُبھری ہو، تیوری چڑھانا آتا ہی نہیں ——— اے بیٹی! آج تو سارا ڈنر سیٹ ٹوٹ گیا جو تم پچھلے مہینے ڈیڑھ سو میں لائی تھیں ——— تو کیا ہوا امی، اور آجائے گا بس آپ جیتی رہیں ——— شیر کا کلیجہ ہے اس لڑکی کا۔ باقی رہا

آپ کا صاحبزادہ، تو بھن —— خیر —— پہلے آپ کہہ لیجیے۔"

میں تو عرض کر چکی"۔ بھاری بھاری آواز آئی۔ "میں بڑے دعوے سے آپ کی خدمت میں آئی ہوں۔ میری آبرو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ محلے کے محلے نے یہاں تک میرا پیچھا کیا ہے۔ آپ ہی فرمائیے۔"

"تو سنیے"۔ اماں بولیں اور کلثوم سراپا کان بن گئی۔

"دیکھیے" امی نے کہا "میری ایک شرط ہے۔"

"فرمائیے فرمائیے" مہمان خاتون بولی "یہی ہوگا کہ کلثوم بٹیا ایک بار صمد کو دیکھ لے۔"

"اللہ الصمد!" امی کی آواز میں احتجاج تھا۔ "اس کے دیکھنے نہ دیکھنے سے کیا فرق پڑے گا وہ تو اللہ میاں کی گائے ہے، میری شرط تو یہ ہے کہ —— سوچ لیجیے پہلے، تیار ہیں آپ؟"

"آپ فرمائیے تو۔"

"شرط یہ ہے کہ شادی کے بعد دولہا یہیں اسی گھر میں رہے" اماں نے فیصلہ سنایا۔

چند لمحوں کے لیے سناٹا چھا گیا

پھر بھاری زکام آلود آواز آئی "آپ نے تو کمال کر دیا۔ آج تک تو لوگ لڑکیوں کو بیاہ لے جاتے ہیں، آپ لڑکے کو بیاہ لانے کی سوچ رہی ہیں، آخر یہ کیا بات ہوئی۔"

"بات جو بھی ہو" اماں کا انداز فیصلہ کن تھا۔ "میری پہلی اور آخری شرط یہی ہے۔"

"سوچ لیجیے" مہمان بولیں۔

"سوچیے آپ" اماں نے جواب دیا "میں کیوں سوچوں مجھے تو یہیں تک سوچنا تھا، سو سوچ چکی۔"

"فیصلہ؟"

"جی ہاں، فیصلہ۔"

"تو پھر اجازت دیجیے۔"

"آپ کی مرضی۔"

"کھایا پیا معاف کیجیے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔" کلثوم نے لپک کر باہر کھلنے والے دروازے کی ایک جھری پر آنکھ رکھ کر آہستہ سے کہا، زنجیر کھول دی اور واپس آکر کھاٹ پر دھڑام سے گر پڑی۔ اسے اکٹھا بہت سارا رونا آ گیا مگر پھر اس نے کچھ سوچ کر آنسو اس زور سے پونچھے کہ آنکھوں کو رگڑ ڈالا اور جب دروازہ باہر سے کھلا تو اس نے کروٹ بدل کر سونے کا بہانہ کر لیا۔ زہرہ اندر آئی اور پھر دبے پاؤں واپس چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد اماں، فرخ اور رضیہ آئیں اور کلثوم کو سوتا پا کر آہستہ سے دروازہ بھیڑ کر باہر نکل گئیں اور جب کلثوم نے مطلع صاف پایا تو اٹھی اور بھڑے ہوئے دروازے کی چٹکنی چڑھا دی اور اطمینان سے بیٹھ کر رونے کے لیے کھاٹ کی طرف چلی مگر کھاٹ تک جاتے جاتے اس کے سارے آنسو جل گئے اور جب وہ کھاٹ پر بیٹھی تو اس کا سارا جسم تپ رہا تھا، اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور انگلیاں جس رخ سے چٹکنی چڑھاتے ہوئے مڑی تھیں اسی رُخ پر جیسے اکڑ گئی تھیں مگر پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ ایک سوکھی مرجھلی عورت سے کوئی سوکھا مرجھلا ہی شادی کرے گا، اور یہ حمد صاحب کی اماں جو سارے لاہور کو طے کر کے یہاں تک پہنچی ہیں تو کیا اکیلی میں ہی گھورے کا پھول رہ گئی تھی ان کے صاحبزادہ صاحب کے لیے؛ کیا لٹے پٹوں کی تنہا امیدگاہ کلثوم ہی ہے؛ ایک جمال تھا سو وہ ایسا بودا نکلا کہ ذرا سی ٹھیس لگنے سے مر تو خیر نہ سکا پر زندگی سے بھاگ ضرور گیا۔ پھر یہ پڑوسی تھا ماں کا لاڈلا کہ ــــــ! ایک ہی چھناکے سے اس کے

خیالات ٹوٹ کر بکھر گئے۔ پڑوس میں جھنگھاڑتا اور دھاڑتا ہوا بینڈ بجنے لگا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ متنجن کی خوشبو سے محلے کا محلہ مہک اٹھا تھا اور محلے کی عورتیں چھتوں پر چڑھ کر تماشا دیکھنے لگی تھیں۔ وہ بھی چھت پر چلی گئی، اور ابھی دیوار تک نہیں پہنچی تھی کہ اس نے دیکھا اس کی تینوں بہنیں، دونوں بھانجے اور اماں بھی چھت پر آ گئی ہیں۔ پہلے تو وہ اس تعاقب سے چونکی مگر جب اسے احساس ہوا کہ سب نیچے گلی کی رونق دیکھنے آئے ہیں تو اس نے اپنے تنے ہوئے اعصاب کو ایک لمبی گہری سانس لے کر ڈھیلا چھوڑ دیا اور مسکرا دی۔ اماں نے آتے ہی کہا "کیسے چپکے سے بلی کی طرح آتی ہو کلثوم! پتہ ہی نہیں چلا کب آئیں، کب سوئیں، کب جاگیں" پھر رضیہ نے کلثوم کے گرد ایک بازو لپیٹ لیا، اور سب کی سب دیوار پر سے نیچے دیکھنے لگیں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے نیچے گلی میں بھڑوں کی طرح بچوں کا بھی ایک چھتہ تھا جسے چھیڑ دیا گیا ہے بچے یہاں سے وہاں بھاگے اور لڑھکتے پھرتے تھے اور نوجوانوں اور بوڑھوں کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ سب دیر تک ایک ہی زاویے پر کھڑی تماشا دیکھتی رہیں۔ پھر اچانک کلثوم پیچھے ہٹ آئی تو سب جیسے ایک ہی تار سے بندھی ہوئی تھیں، سب پیچھے ہٹ آئیں۔ "کیا بات ہے میری جان؟" رضیہ نے پوچھا۔

کلثوم نے صرف اتنا کہا "دیر تک گلی میں جھانکتے رہنے میں کچھ عجیب بے حیائی سی لگتی ہے!"

کلثوم نے جیسے سب کو ڈانٹ دیا تھا۔ سب آہستہ آہستہ نیچے اتر آئیں اور پرلے کمرے میں جا کر چپ چاپ بیٹھ گئیں۔ کلثوم منتظر رہی کہ کوئی تو اس سے آج کے واقعے کا ذکر کرے گا۔ مگر کوئی نہ بولا۔ رضیہ تک نے اس بارے میں کچھ نہ کہا۔ آخر کلثوم نے خود ہی اس قصے کو چھیڑ دیا "آج کون آیا تھا امی؟"

اماں چونکیں "وہ کیا نام ہے ——— ایک یہیں اڑوس پڑوس کی عورت تھی۔ جانے کیا نام تھا، عجیب بھدا سا نام تھا، عصفورہ یا صرف صفورہ، وہ آئی تھی ——— دوستی کرنا چاہتی تھی۔

مجھ سے یہ ٹنٹا نہیں چلتا۔ ویسے مجھے اچھی بھی نہیں لگی۔ آواز ہی کچھ ایسی تھی جیسے کسی مرد نے عورت کا بھیس بدل رکھا ہے۔" اماں صاف جھوٹ بول گئیں۔ انھوں نے کلثوم کے سوا باقی سب کو گھور گھور کر دیکھا اس لیے سب خاموش رہیں، البتہ زہرہ نے ایک بار پہلو بدل کر سر کھجایا اور گلا صاف کر کے خاموش ہو گئی۔

کلثوم وہاں سے اُٹھ آئی۔ کافی دیر کے بعد موقع پا کر زہرہ اس کے پاس آئی مگر روتی ہوئی۔ آتے ہی کلثوم کی گود میں سر رکھ کر بلکنے لگی اور کلثوم نے کہا "کوئی بات نہیں پیاری۔ امی کو اگر مجھ سے ایسی ہی ضد ہے تو میں بھی کچھ کم ضدی نہیں ہوں۔ ایک دن اچانک انھیں خبر ملے گی کہ کلثوم نے کسی سے بیاہ رچا لیا چپکے سے، تب چین آئے گا انھیں۔ تمھیں میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی، انشاء اللہ۔ تم کیوں یہاں گلتی رہو اور عورت سے مرد بنتی رہو۔ اور دیکھو بس مہینے دو مہینے کی بات ہے۔ میں اسی کھوج میں ہوں، دیکھوں گی امی کب تک ـــــ"، وہ کچھ نگل کر خاموش ہو گئی۔

زہرہ آنسو پونچھ کر اٹھ بیٹھی اور پھر کلثوم سے لپٹ کر بولی "میری پیاری آپی" پھر وہ اس سے اچانک الگ ہو گئی "آپ کو تو بخار ہے۔"

"ارے نہیں"، وہ بولی "بخار وخار نہیں ہے، یونہی بس ذرا غصے سے تپ گئی تھی۔"

اس غصے نے کلثوم کی آنکھوں سے حیا کی وہ چمک غائب کر دی جو لاج سے دیکھنے والی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ جب وہ اسکول جاتے ہوئے بازار میں سے گزرتی تو کچھ ایسے مردانہ ٹھسے سے جیسے وہ اپنے عورت پنے کو گھر میں بھول آئی ہے۔ اس کے گھر والوں کو بھی اس تبدیلی کا احساس تھا خصوصاً اماں تو بری طرح چونکی ہوئی تھیں۔ البتہ انہی دنوں اسے مہینے بھر کی تنخواہ مل گئی تو اس نے ایک ایک پائی اماں کے قدموں میں لا ڈالی اور اماں کے علاوہ دوسروں کے شکوک بھی اسی روپوں کے نیچے دب گئے لیکن جب وہ شام کو کھانے کے بعد اپنے کمرے میں قدم رکھتی تو اس کا عورت پنا کسی گوشے سے اُٹھ کر آتا اور اس کے پیکر میں حلول

کر جاتا اور وہ ایک لمبی چوڑی انگڑائی لے کر اُٹھی ہوئی باہوں کو گراتی اور ہاتھوں سے گھٹنوں کو سجا کر کہتی "ہائے ری یہ اُجاڑ زندگی!" پھر وہ کھاٹ پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتی اور ماضی کے ملبے میں سے ان خوابوں کو ٹٹول کر نکالنے کی کوشش کرتی رہتی جن میں سنہری کلغیوں اور لمبی لمبی چھریری آنکھوں والے شہزادے اس کے اپنے والے کمرے کی دریچی میں سے پھاند کر آتے تھے اور اسے اپنی باہوں پر اٹھا کر دور دراز کی نگریوں میں نکل جاتے تھے جہاں جھرنوں کے حاشیوں میں پھولوں کے حاشیے ہیں اور ان حاشیوں کے اندر گھاس کے قطعے تھے جن پر ست رنگی چڑیاں پھدکتی اور چہکتی تھیں اور کہیں کہیں انگور کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے کنج تھے جن کے سایوں میں ـــــ مگر ان خوابوں کو تو جیسے پھپھوندی لگ گئی تھی۔ اسے کچھ عجیب تعفن سا محسوس ہوتا اور وہ پلنگ پر بیٹھ کر یوں ہی بیکار دیوار کو دیکھنے لگتی۔

ماحول ہی کچھ ایسا تھا کہ دن میں دو ایک سے زیادہ مردوں سے ملاقات ہی نہ ہو سکتی تھی۔ طالب علی نصف شادی شدہ تھا اور بوڑھے چپراسی کے مسوڑھوں میں دانت جھول رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی کسی کالج میں مباحثہ سننے چلی جاتی، مشاعروں میں جا بیٹھتی تصویروں کی نمائشوں میں بھی گئی، وزیر اعظم کی تقریر سننے بھی جا نکلی مگر جہاں جاتی وہاں ڈھیر سی عورتوں کے درمیان ایک صف بن کر بیٹھ جانا پڑتا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی، دور نوجوانوں کے چہروں کے کنول کھلے ہوتے۔ کسی کے بال سیدھے پیچھے جا رہے ہیں تو کسی کے بالوں کا ایک گچھا سا اس کے ماتھے پر پڑا تڑپ رہا ہے، کسی کی مونچھیں ہلال کی سی قوسوں کی طرح ترشی ہوئی ہیں تو کسی کی مونچھوں کے منڈ جانے سے اس کے اوپر کے ہونٹ کی نمایاں محراب میں جیسے اس کی جوانی کے سارے جذبات نے سمٹ کر بسیرا بنا لیا ہے۔ کسی کی کنپٹیوں کے بال اس کے کانوں کی لوؤں تک پہنچ کر اسے شہزادہ سلیم بنائے ہوئے اور کسی کی ٹائی کی ناٹ بالکل ڈیوک آف ونڈسر کی ناٹ کی طرح ننھی سی پیاز کی طرح لمبوتری اور کسی ہوئی ہے۔ اور قریب ہی پولیس کا سپاہی کھڑا نظر آتا اور وہ سوچتی یہ بھی بُرا نہیں۔ کوئی سا بھی مرد بُرا نہیں، مرد جب تک مرد ہے بُرا ہو ہی نہیں سکتا جیسے

عورت جب تک عورت ہے بہت اچھی ہے لیکن جب مردوں کے سے کام کرنے لگتی ہے تو قدرت کو چاہیے کہ اس کی مونچھیں اگا دے ـــــ اور اس کا جی چاہتا کہ کوئی اسے عورتوں کے اس ڈھیر میں سے یوں نکال لے جائے جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے اور بھرے جلسے میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کہیں نکل جائے، کسی ایسی نگری میں جہاں ـــــ مگر یہ تو وہی ماضی کے سڑے بُسے خواب تھے! ـــــ کئی بار اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ سر کے بل کھڑی ہے اور اگر سر کے بل نہیں کھڑی ہے تو اسے کھڑی ہو جانا چاہیے ورنہ وہ لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ پھر اسے سامنے زمین سمندر کی لہروں کی طرح ابھرتی بیٹھتی محسوس ہوتی اور اس کی رفتار کا توازن بگڑ جاتا۔ کئی بار اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس کے سر کا پچھلا حصہ سوچ رہا ہے اور اگر سوچنے کی یہ رفتار جاری رہی تو یہ حصہ پھوڑا بن کر پھٹ جائے گا۔ اس کی انگلیاں مستقل طور پہ لرزتی رہتیں اور اسے اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہوتا۔ وہ جلدی جلدی سے سانسیں لے کر سانسوں کی آمد و شد کو درست کرتی اور اپنے خوابوں کے گھورے پر سو جاتی۔ نہ جانے کیا بات ہوئی کہ انہی دنوں اسے کتابوں، کاپیوں، اخباروں اور دیواروں تک پر اپنے دستخط کرنے کی لت پڑ گئی۔ جو چیز بھی اٹھاؤ اس پر کلثوم کے دستخط ثبت ہیں اور کچھ نہیں تو انگلی سے آسمان پہ دستخط کر رہی ہے۔

کبھی کبھی نذر اور نذیر کو دیکھ کر اور پھر خاص طور سے رضیہ کو کچھ سیتا دیکھ کر اسے یونہی سا احساس ہوتا کہ اس کا شادی کے جھمیلوں میں پڑنا بہت ظلم ہوگا، مگر پھر اچانک کہیں سے ہوا کا جھونکا آتا اور اسے گدگدا کر نکل جاتا۔ بدلی کی ایک کترن چاند پر سے گزرتی اور اسے غزلوں کے سب منتخب اشعار یاد آ جاتے۔ پڑوس کے صحن میں شیشم کی شاخ پہ طوطوں کے غول کے غول آپس میں گپیں ہانکتے اور منڈیروں پہ بیٹھی ہوئی چڑیاں بڑی آسودگی سے پھدکتیں تو اس کے اندر کچھ ابلنے لگتا اور پھر وہ زور کی انگڑائی لے کر صرف اتنا کہہ پاتی "ہلئے ری یہ اُجڑی بچھڑی زندگی!"

ایک دن وہ اسکول سے گھر آئی تو سارے راستے میں لٹکے ہوئے ہاتھ کی انگشتِ شہادت سے سڑک پر کلثوم کلثوم لکھتی چلی آئی اور جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کا لٹکا ہوا ہاتھ اٹھا اور اس نے آسمان پر دستخط کرنا شروع کیے۔ ابھی اس نے کلثو ہی لکھا تھا کہ زہرہ بھاگی آئی اور بولی "جادو وادو سے کچھ نہیں ہوگا بی، جن کو آنا تھا وہ ابھی آ چکے۔"

"کیا ہوا؟" کلثوم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اپنے کمرے میں مت جائیے گا،" زہرہ نے شرارت سے تحکمانہ انداز سے کہا۔

"کیوں نہ جاؤں؟"

"وہاں ایک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔"

"کون صاحب؟"

"وہ جو ہوتے ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔"

نہیں، ان کا نام تو کچھ اور بھلا سا ہے۔"

کلثوم کو غصہ آ گیا "یہ کیا بکواس ہے؟"

"محمد ادریس،" زہرہ کے ہونٹوں سے یہ نام جیسے مارے ڈر کے ٹپک پڑا۔ پھر "شش" کرتی ہوئی اور کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر اسے باورچی خانے میں لے گئی "یہاں بیٹھیے۔"

وہاں فرخ اور رضیہ پہلے سے موجود تھیں اور زندرا اور نذیر پھلکیاں تلے جانے کا تماشا دیکھ رہے۔ کلثوم دروازے پر یوں کھڑی ہو گئی جیسے زہرہ اسے حوالات میں لے آئی ہے، فرخ فوراً اٹھی اور زہرہ سے بولی "کلثوم آ گئی ہے تو اب تم ادھر چولھے کے پاس بیٹھ کر رضیہ کا ہاتھ بٹاؤ، بھاگ کر بار بار ادھر مت جاؤ۔ بڑی بہنوں کے رشتے طے ہونے لگیں تو چھوٹیاں روتی ہیں، تمہاری طرح عید منانے نہیں بیٹھ جاتیں۔" یہ وعظ پلا کر وہ کلثوم کے پاس آئی اور اس کے پیٹ میں گدگدی کی سنسنی سے بل کھا کر کلثوم وہیں

بیٹھ گئی اور پھر یونہی بیٹھے بیٹھے گھسٹتی ہوئی رضیہ کے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھ دی، بڑے پیار سے بولی "یہ کیا تماشا ہو رہا ہے آپا؟"

"سودا ہو رہا ہے میری جان۔" رضیہ نے پھلکیوں کی طرح تل کر کہا "جو صاحب امیدوار ہیں انھوں نے بھی قدم رنجہ فرمایا ہے اپنی اماں کے ساتھ۔ سوچا ہوگا لگے ہاتھوں اپنا جلوہ دکھاتے چلیں۔ زہرہ نے ایک جھلکی دیکھ پائی ہے، کہتی ہے ایسا انگارہ سا رنگ ہے کہ آنکھیں چندھیا جائیں پر منہ پر داڑھی ہے۔"

"سنہری داڑھی" زہرہ ہنسی۔

"یہ لوگ تمہارا رشتہ طے کرنے آئے ہیں۔ بس تمہارا انتظار ہو رہا تھا۔ ایک بار تمہیں اس کو دیکھنے کا اور اسے تم کو دیکھنے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔ میں نے تو چیخ چیخ کر امی سے کہا کہ میری جان کلثو اتنی بے حیا نہیں جو ہونے والے میاں کے سامنے آنکھیں پھاڑے چلی جائے اس کے بدلے میں وہ تو دعا مانگے گی کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ فرخ نے بھی تھوڑا سا میرا ساتھ دیا پر امی کہتی ہیں کہ کلثوم پڑھی لکھی ہے، چلی جائے گی سامنے۔ جیسے پڑھنے لکھنے کی فیس شرم اور حیا ہی تو ہے۔ اونہہ!"

کلثوم مسکرائی "اس میں ہرج ہی کیا ہے آپا۔ چلی جاؤں گی، وہ مجھے کھا تھوڑی جائے گا۔ جاؤں؟"

رضیہ کے ہاتھ سے چمٹی چھوٹ کر کڑکڑاتے گھی میں گر پڑی اور کڑکڑاتے گھی کا ایک قطرہ فرائنگ پین سے نکل کر زہرہ کے ہاتھ پر جا گرا۔ "ہائے!" رضیہ اور زہرہ ایک ساتھ تڑپیں اور پھر رضیہ نے کلثوم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رونا شروع کر دیا۔ "مسکرا میری جان۔ میں روتی ہوں تو مسکرا ——" کلثوم مارے ڈر کے مسکرانے لگی اور رضیہ بولی "یوں —— اور میں کہوں ویسے لڑکی سمجھدار ہو تو دیکھنے دکھانے سے کچھ نہیں بگڑتا اور میری جان کلثو تو بقراط ہے —— کوئی ہرج نہیں میری جان۔"

کلثوم کو سہارا ملا "لڑکی کی حیا تو سارے گھر کی امانت ہے آپا، اور میں امانت میں خیانت نہیں کرتی، میں تو کوئی گناہ نہیں کرتی آپا. جاؤں؟"

رضیہ اٹھی "ٹھہرو میں ان سے کہہ دوں۔" اور وہ باہر چلی گئی۔

زہرہ نے مسمسی صورت بنا کر پوچھا "میں آپ کے ساتھ رہوں گی نا اپی۔"

کلثوم نے مسکرا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر دونوں تلی ہوئی پھلکیاں سی تلنے لگیں. کافی دیر تک وہ یونہی خاموش بیٹھی رہیں کہ اچانک باہر ایک ہنگامہ ہو گیا۔ اماں، فرخ اور رضیہ زور زور سے باتیں کرنے لگیں اور نذر اور نذیر رونے لگے۔ کلثوم اور زہرہ باہر نکلیں تو تینوں ایک دم خاموش ہو گئیں، مگر جب دونوں قریب پہنچیں تو رضیہ نے کلثوم سے لپٹ کر کہا "میں امی کی جگہ ہوتی تو ایسا کبھی نہ کرتی میری جان۔ ٹھنسوائے بھی سب کو اور جوانی بھی سڑاتی رہے، کیوں؟"

"وہ چلے گئے؟" زہرہ نے اماں سے پوچھا۔

"تو کیا وہ تمہارے باپ تھے جو بیٹھے رہتے؟" اماں نے جل کر کہا —— "ان سب بدذاتوں نے مجھے تو کھا لیا۔ کلیجے میں بیپ ڈال دی ہیں. پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی۔ یہ سب پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئیں۔ یہ حرامزادیاں نہ جانے کس گناہ کے بدلے میں مجھ کم بخت کے نصیبوں میں گھسی چلی آئیں، اللہ کرے موت آئے، کیڑے پڑیں تن بدن میں، اُتو کی پٹھیاں ——"

اماں روتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ فرخ نے ان کا تعاقب کیا اور کلثوم بت کی طرح کھڑی خلا میں دیکھتی رہی، پھر اُس نے انگلی سے ہوا میں دستخط کیے اور رضیہ کی آسیبی آنکھوں میں اپنی ویران آنکھیں ڈال دیں۔

"کیا ہوا تھا آپا؟" زہرہ نے کلثوم کی آنکھوں کے سوال کو لفظوں میں ادا کر دیا۔

"ہونا کیا تھا،" رضیہ پھٹ پڑی "اچھا خاصا لڑکا تھا۔ لاٹ صاحب کے دفتر میں کلرک ہے، ذرا سی داڑھی بڑھا رکھی ہے تو کیا ہوا۔ میں تو بھری برات میں سے اسے پکڑ لاتی اور گھٹنوں

تلے دے کر مونڈ ڈالتی پر امی نے پانی ہی پھیر دیا۔ بولیں میں اپنی کلثوم کو ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔ دولہا یہیں آکر رہے بسے تو ٹھیک ہے ورنہ کلثوم کنواری بیٹھی رہے گی۔ کنواریاں بھی جی لیتی ہیں، تمہارے پیار کا کچھ پہاڑ پھٹ پڑا ہے امی پر، کہتی ہیں میں تو اپنی مرو بیٹی کو اپنے سے جدا کروں تو اپنے جسم سے روح کو جدا کروں۔"

کلثوم کچھ نہ بولی۔ اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہاں کھاٹ پر بیٹھ کر اور کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک کر چہرے کو ہاتھوں میں لے لیا۔ دیر تک وہ اسی حالت میں بیٹھی رہی۔ چھت پر سے ایک ہوائی جہاز گزر گیا۔ گلی میں سے گزرتی ہوئی ایک موٹر نے ہارن بجایا۔ دو چڑیاں چھت پر سے گتھم گتھا ہو کر فرش پر گر پڑیں اور پھر اڑ گئیں، مگر کلثوم اسی حالت میں بیٹھی رہی۔ کچھ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی کہنی گھٹنے پر سے کھسکا دی گئی تو وہ منہ کے بل فرش پر گر جائے گی۔ زہرہ نے اس کو اس حالت میں دیکھا تو رضیہ کو جا کر بتایا۔ اماں نے سن لیا۔ ساتھ ہی فرخ بھی بھاگی آئی اور کلثوم کے سامنے ہجوم لگ گیا۔

کلثوم ایک جھٹکے سے تن کر یوں کھڑی ہو گئی کہ اس کے بال پیٹھ پر سے ہٹ کر اس کے منہ اور سینے پر بکھر گئے۔ اس نے اس زور سے دونوں ہاتھ جوڑے کہ تالی سی بج گئی۔ پھر ایک ہاتھ سے بالوں کو آنکھوں پر سے ہٹایا اور پھر سے ہاتھ جوڑے "مجھے بخشیے" وہ بڑی تلخی سے بولی "مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔ خدا کے لیے مجھے بخشیے بس!"

زہرہ نے تو جیسے اپنے آپ کو پہلا مخاطب سمجھا، بلکتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔ پھر فرخ بھی چلی گئی۔ اماں اسے گھور گھور کر دیکھتی رہیں اور انتظار کرتی رہیں کہ وہ جڑے ہوئے ہاتھوں کو الگ کر دے مگر مایوس ہو کر وہ بھی چلی گئیں۔ اب صرف رضیہ رہ گئی تھی "کلثوم میری جان" اس نے سرگوشی کی مگر ہاتھ جڑے رہے اور وہ بھی شکست کھا کر پلٹ گئی۔

کمرہ خالی ہونے کے بعد بھی کلثوم اسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑی رہی۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر اس نے ہاتھ نیچے گرا دیے اور کھاٹ پر دھم سے بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھڑک کر

اٹھی، تولیے سے اپنا چہرہ خوب خوب رگڑا اور باہر چلی گئی۔

وہ آنگن میں دیر تک ٹہلتی رہی۔ اماں اور فرخ دیر تک باورچی خانے میں بیٹھی کھسر پھسر کرتی رہیں اور رضیہ نل کی پرلی طرف بیٹھی کچھ سیتی رہی البتہ زہرہ غائب تھی۔ کلثوم نے کنکھیوں سے آنگن کے سب گوشوں میں اور چھت پر بھی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی، اسے کہیں نہ پاکر وہ گھبرا گئی اور اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ زہرہ اپنی چارپائی پر روتے روتے سو گئی تھی اور اس کے گال پر ایک آنسو رک گیا تھا۔ کلثوم نے جھک کر اسے وہیں پیار کیا۔ اور رکے ہوئے آنسو کو جیسے چوس لیا۔ زہرہ نے کروٹ بدلی اور نیند میں رونے لگی۔ اچانک عقب سے رضیہ بولی "یہ بات ہے! اور ہم میری جان؟ ہم کہاں جائیں" ـــــ کلثوم نے رضیہ کو چوم لیا اور رضیہ جیسے سینے پر تمغہ سجائے مسکراتی اور اکڑتی ہوئی باہر نکل گئی۔

بہت دنوں تک اس گھر میں ایک اجنبی سا سناٹا طاری رہا۔ سب ایک ساتھ کھانا کھاتے، ایک ساتھ اٹھتے، ایک ساتھ سوتے مگر جیسے سب کی زبانیں گنگ ہو چکی تھیں۔ جب کوئی ایک دوسرے سے بات کرتا تو اس احتیاط سے کہ مبادا سناٹا چیخ جائے رات کے اندھیرے میں کلثوم کبھی کبھی اپنے کمرے میں منہ پر لحاف اوڑھ کر وہی پرانا شعر دیر تک گنگناتی رہتی ؎

زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا، میں باز آیا

اور اپنی اپنی کھاٹوں پر اماں اور بہنیں چپکے چپکے روتیں اور سناٹا ہونکنے لگتا۔

ایک دن کلثوم کو اسکول میں معلوم ہوا کہ جمال چھٹی کاٹ کر واپس آگیا ہے، کل سے دفتر میں بھی آنے لگے گا۔ اس وقت وہ دسویں کی لڑکیوں کو حافظ کی وہ غزل پڑھانے چلی تھی جس کے مطلعے کا پہلا مصرع ہے ؎

دل می رود ز دستم، صاحب دلاں خدارا

باہر تیز ہوا چل رہی تھی اور سامنے لان کے پرلے سرے پر نیموں کی شاخیں

اعصابی ہلکورے لے رہی تھیں۔ سب درختوں اور پودوں کے پتے ایک رخ کو جھک کر لرز رہے تھے اور برآمدے میں خشک پتوں کی ایک قطار اڑتی اور چیختی جا رہی تھی۔ بہت سی چڑیاں روشن دان کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں سے اندر آکر شور مچانے لگی تھیں اور بادل ڈھول بجا رہا تھا۔

مطلع پڑھانے کے بعد جب وہ اس شعر پر پہنچی ؎

کشتی شکستگانیم، اے بادِ شرط برخیز

باشد کہ باز بینم آں یارِ آشنا را

تو وہ ایک دم رک گئی اور بولی "دیکھو بھئی لڑکیو، فی الحال ایک ہی شعر کافی ہے۔ اسے ازبر کر لو، جب تک میں آتی ہوں۔" وہ باہر آ گئی۔ نمی سے لدی ہوئی ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے بالوں کو پریشان کرتا آگے نکل گیا اور کلثوم گنگناتی چلی گئی:

کشتی شکستگانیم...

کھیل کے میدان میں عربی کی استانی شاید دھوپ کی تلاش میں آئی تھیں اور اب تک وہیں بیٹھی تھیں۔ انھوں نے تین لڑکیوں کو کان پکڑوا رکھے تھے۔ "ضربتنا نہیں ضربنا" وہ چیخ رہی تھیں۔ پھر یکایک جیسے ہوا کے ایک تند و تیز جھونکے نے لڑکیوں کو دھکا دے دیا اور وہ سر کے بل استانی کے قدموں میں جا گریں۔ سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ استانی نے سب کو چھٹی دے دی۔ لڑکیاں اڑتے ہوئے پتوں کی طرح ادھر ادھر منتشر ہو گئیں اور استانی اپنی کتابیں سنبھالتے ہوئے اچانک جم کر رہ گئیں۔ کلثوم کی دبی دبی گنگناہٹ کو ہوائیں اسی رخ پر اڑائے لا رہی تھیں ؏

کشتی شکستگانیم اے بادِ شرط برخیز

میدان کے پرلے سرے پر کلثوم باہیں ہوا میں بلند کیے بڑھتی جا رہی تھی اور "اے بادِ شرط برخیز" کی تکرار سے اس کی گنگناہٹ بے حد پراسرار ہو رہی تھی۔ پھر جب وہ

چنبیلی کی جھاڑیوں کی طرف بڑھی تو ننھی ننھی بوندیں گرنے لگیں۔ جھاڑیوں کے نیچے چنبیلی کے جھڑے ہوئے پھولوں کے ڈھیر لگے تھے اور ہر بوند کے مس کے ساتھ یہ پھول تڑپ تڑپ اٹھتے تھے۔ پنجوں کے بل چلتی ہوئی وہ پھولوں کی اس بساط کو پار کر گئی اور سفیدے کے تنہا درخت کی طرف بڑھی مگر اچانک جیسے چنبیلی کی جھاڑیاں اس کے قدموں سے لپٹ گئیں، سفیدے کے تنے کے پاس کوئی نہیں تھا!

"اے بادِ شرطہ برخیز" اس نے دعا مانگی اور پھر ہولے ہولے دبتی اور گھٹتی ہوئی آواز میں اس نے بڑے دکھ سے گایا ؎

باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

وہ رو دی۔ بڑھ کر وہ سفیدے کے صاف ستھرے تنے سے لپٹ گئی اور اسے بہت سے پیار کر ڈالے۔ بوندیں اس کے کوٹ میں جذب ہو کر اس کے بلاؤز تک پہنچ گئی تھیں مگر وہ دیر تک وہاں کھڑی غیر ارادی طور پر گنگناتی رہی!

واپس اسکول میں جا کر وہ کرسی پر ڈوب گئی اور لڑکیاں چپ چاپ اپنا سبق یاد کرتی رہیں۔ واپس گھر آئی تو دروازے میں داخل ہوتے وقت وہ حافظ کے شعر کا دوسرا مصرع گنگنا رہی تھی ؎

باشد کہ باز بینم آں یار آشنا را

اچانک زہرہ بھاگتی ہوئی آئی اور سرگوشی میں بولی "جلدی سے کمرے میں چلی جائیے اپی، آج کوئی اور امیدوار آئے ہوئے ہیں۔"

کلثوم اپنے خوابوں کے گھوڑے پر جیسے لوٹیں لگانے لگی۔

وہ کمرے میں گئی تو بڑے کمرے میں سے مہمان اٹھ کر چلا گیا۔ اماں اور فرخ اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔

دونوں واپس آئیں تو ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چہروں کی بہت سی

جھریاں غائب تھیں۔

رضیہ بھی مسکرا رہی تھی اور زہرہ کا رنگ گلابی ہو رہا تھا۔

کلثوم بت کی طرح دروازے پر جمی رہی۔

کچھ دیر تک سناٹا طاری رہا۔

پھر اماں بولیں "پتہ ہے آج کون آیا تھا؟"

"جی نہیں" کلثوم نے جواب دیا۔

"جمال آیا تھا!" اماں نے جیسے تھیلے میں سے بلی نکال دی۔ سب ہنسنے لگے اور سب نے کلثوم کے چہرے کا جائزہ لینے کے لیے اسے گھورنا شروع کر دیا۔

کلثوم ذرا سی چونکی اور پھٹے ہوئے بادلوں پر ایک نظر دوڑا کر پھر اماں کو دیکھنے لگی۔

سناٹے کا ایک اور ریلا آیا اور گزر گیا۔

اماں بولیں "پتہ ہے کیوں آیا تھا؟"

"جی نہیں" کلثوم نے کہا۔

"وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے" اماں بولیں۔

کلثوم کے ہونٹوں پر پو پھٹنے لگی۔

"اور وہ شادی کے بعد یہیں ہمارے گھر میں رہے گا" فرخ بولی۔

"مان گیا ہے" رضیہ چہکی۔

ہونٹوں کی پو بجھ گئی۔

سناٹا پھر سے طاری ہو گیا۔

اور اس سناٹے کو کلثوم کی غیر قدرتی آواز نے تلوار کی طرح کاٹ دیا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں شادی نہیں کراؤں گی!"

سب کی مسکراہٹیں مٹ گئیں اور مٹی ہوئی جھریاں ابھر آئیں۔

"جمال سے بھی؟" اماں نے جیسے واسطہ دیتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" کلثوم کی آواز غیر معمولی طور پر بھاری اور گونجیلی ہو رہی تھی۔

"میں جمال سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟" اماں نے اب غصے سے پوچھا

اور کلثوم نے اپنے اوپر کے ہونٹ والے رؤیں چھو کر کہا "میں مرد بن چکی ہوں!" اور پھر وہ بڑی بے پروائی سے انگلی اٹھا کر ہوا میں دستخط کرنے لگی۔

سناٹے کا ایک اور ریلا آیا اور وہیں منجمد ہو کر رہ گیا۔
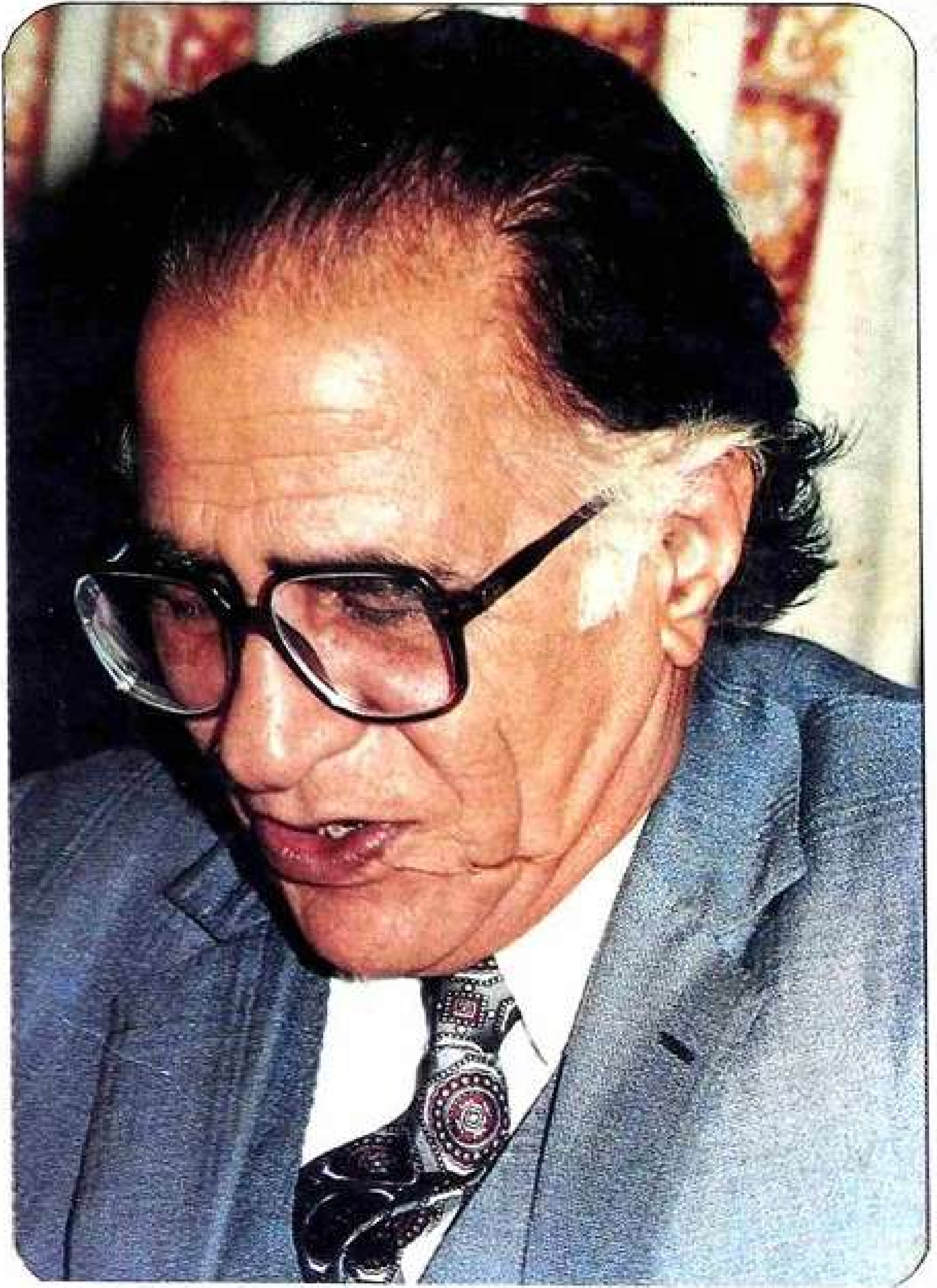
ندیم کے افسانوں کے دوسرے مجموعے
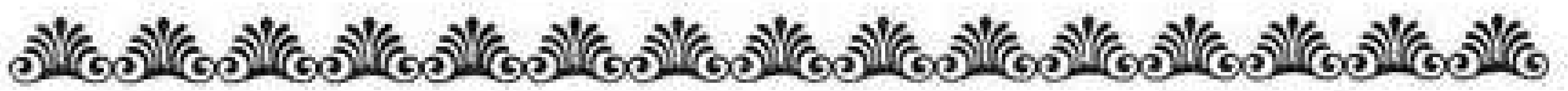
چوپال ۔ بگولے ۔ طلوع و غروب ۔ سیلاب و گرداب

آنچل ۔ آبلے ۔ آس پاس ۔ در و دیوار

بازارِ حیات ۔ برگِ حنا ۔ گھر سے گھر تک ۔ کپاس کا پھول

نیلا پتھر ۔